پاکستان میں ادبی کالم نگاری

مقالہ: پی ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار:
شفیق احمد شنواری

نگران:
پروفیسر ڈاکٹر محمد احسان الحق
(صدرِ شعبہ اُردو قرطبہ یونیورسٹی)

شعبۂ اُردو
قرطبہ یونیورسٹی ڈی آئی خان پشاور کیمپس حیات آباد

۲۰۰۹ء

فہرست

☆☆☆☆

انتساب

شجرِ سایہ دار مرحوم و مغفور

والدِ محترم، الحاج غلام حسن کے نام

جنھوں نے ہمیں وقت کی کڑی دھوپ سے بچائے رکھا۔

تصدیق نامہ

میں تصدیق کرتا ہوں کہ قرطبہ یونیورسٹی کے پی ایچ۔ڈی سکالر شفیق احمد شنواری نے اپنا مقالہ ''پاکستان میں ادبی کالم نگاری'' بہت محنت سے لکھا ہے۔ ممتحن نے ان کے مقالے پر جو اعتراضات کیے تھے، سکالر نے ممتحن کی ہدایات کی روشنی میں مقالے کو از سر نو ترتیب دے دیا ہے اور جو جو غلطیاں تھیں ان کو درست کیا ہے۔ میں بحیثیت نگران ان تمام اُمور کی تصدیق کرتا ہوں۔ اب یہ مقالہ اس قابل ہے کہ جانچ پڑتال کے لیے ممتحن کو بھیجا جائے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد احسان الحق

(صدرِ شعبۂ اُردو)

قرطبہ یونیورسٹی، پشاور

مورخہ:

پیش لفظ

زیرِ نظر مقالہ ''پاکستان میں ادبی کالم نگاری'' پایہ تکمیل تک نہ پہنچ پاتا اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان تھا کہ اُس نے مجھے اساتذہ بھی ایسے دیے جو شفیق اور مہربان تھے۔ استادِ محترم ڈاکٹر ظہور احمد اعوان جو میرے نگران تھے، آج اس دنیا میں نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے سایہ عاطفت میں رکھے۔ انھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ لیکن میری بد قسمتی دیکھیے کہ جب میں مقالے کے آخری مراحل میں تھا وہ بیمار پڑ گئے۔ ایک طویل عرصہ علالت کے بعد استادِ محترم ۱۲ اپریل ۲۰۱۱ء شب ۱۱ بجے کے قریب اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور ہمیں سوگوار چھوڑ گئے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے استادِ محترم کو جنت الفردوس نصیب کرے۔

دورانِ علالت استادِ محترم ڈاکٹر ظہور احمد اعوان میرے کام کی نگرانی کرتے رہے لیکن بعض ایک خامیاں رہ گئیں۔ جن کی نشاندہی ممتحن صاحب نے کی۔ ممتحن کی رپورٹ کے بعد چوں کہ میرے استادِ محترم اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے، اس لیے یونی ورسٹی نے میرا نگران پروفیسر ڈاکٹر محمد احسان الحق مقرر کیا۔ ڈاکٹر احسان صاحب بھی ایک مہربان شفیق استاد ہیں۔ تحقیقی مزاج کے مالک ہے۔ تحقیق کے فن پر عبور رکھتے ہیں۔ اس لیے میں نے اپنا مقالہ ڈاکٹر احسان الحق صاحب کے مشورے سے از سرِ نو ترتیب دے دیا۔ ساتھ جن خامیوں کی نشاندہی ممتحن صاحب نے کی تھی ان کو بھی دور کر دیا۔ میں امید رکھتا ہو، کہ اس بار اللہ تعالیٰ مجھے کامیابی سے ہمکنار کر دے گا۔

شفیق احمد شنواری

۱۵ جولائی ۲۰۱۱ء

حرف آغاز

پاکستان میں ادبی کالم نگاری کے موضوع پر میرا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ بفضل خدا پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔یہ اپنی جگہ ایک وسیع موضوع ہے جس کا مواد اخبارات، رسائل اور کتابوں میں بکھرا ہوا ہے۔میری حتیٰ الامکان یہ کوشش رہی کہ اس بکھرے مواد کو سمیٹنے کے بعد اس کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لے کر پاکستان میں اُردو کالم نگاری پر ایک مدلل اور جامع مقالہ پیش کروں۔اور اللہ کے فضل وکرم سے مجھے اس مشکل اور پیچیدہ کام میں کامیابی حاصل ہوئی۔اس مقالے کے پانچ ابواب ہیں۔

باب اوّل میں ادبی کالم کے فروغ میں اُردو صحافت کے کردار کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔اور آغاز سے لے کر آج تک کے اخبارات کے کردار کا تجزیہ کیا گیا ہے۔اس باب میں اُردو صحافت کا اسلوبیاتی مطالعہ اس زاویے سے کیا گیا ہے کہ ادبی کالم کے اسلوب میں اُردو صحافت کی روایت سامنے آتی ہے۔ابتدا میں صحافت کی تعریف مقاصد اور ذمہ داریوں پر بھی بحث کی گئی ہے۔

باب دوم میں کالم اور ادبی کالم کی روایت کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔کالم کے لغوی، اصطلاحی اور صحافتی مفاہیم کا جائزہ لیا گیا ہے۔"نیز کالم کیا ہے"؟ جیسے اہم سوال کے حوالے سے بھی بحث کی گئی ہے۔ادبی کالم سے پہلے ادب کے مقاصد مزاج اور کردار کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔اسی باب میں ادب کے فروغ میں ادبی کالم کے کردار سے بھی بحث کی گئی ہے۔ادبی کالم کی روایت کو سمجھنے کے لیے قیام پاکستان سے قبل ادبی کالم نگاری اور اہم ادبی کالم نگاروں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم اُردو ادب کے مقبول ترین کالم نگار مشفق خواجہ کے فکری وفنی مطالعے کے لیے مختص ہے۔وہ اُردو ادب کے ایک صاحب اُسلوب کالم نگار ہیں۔اس تناظر میں ان کے تخلیقی اُسلوب، موضوعات طنز ومزاح کے فنکارانہ استعمال پر بحث کی گئی ہے۔اور اُردو ادبی کالم نگاری کی روایت میں ان کے مقام ومرتبے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب چہارم میں عصر حاضر کے چند اہم منتخب ادیب کالم نگاروں کے کالموں کا جائزہ لیا گیا۔ویسے تو اردو میں بہت سے ادیب کالم نگار ہیں۔لیکن میں نے اپنے مقالے کے لیے جن چند ادیب کالم نگاروں کو منتخب کیا اُن کے نام یہ ہیں اے۔حمید، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، عطاء الحق قاسمی، حسن نثار، یونس قیاسی اور پروین شاکر۔

باب پنجم اُردو ادبی کالم کے مجموعے جائزے کے لیے مختص ہے۔اس باب کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں تمام مباحث کو اختصار کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔اُردو صحافت اور ادبی کالم نگاروں کے مجموعوں کے بنیادی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا

ہے، تاکہ ادبی کالم کے تمام تر مباحثات وخدوخال بخوبی سامنے آسکیں۔اس اہم موضوع پر کام کرتے ہوئے کئی مسائل اور رکاوٹیں سامنے آئیں لیکن عزم وہمت نے ان مشکلات پر قابو پانے میں مدد دی۔

اس کام میں کئی ایک مہربانوں کے مشورے اور تعاون نے بھی حوصلے کا سامان پیدا کیا۔سب سے پہلے جامعہ قرطبہ کے صدر اور علم دوست شخصیت جناب پروفیسر عبدالعزیز نیازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مادرِ علمی جامعۂ قرطبہ میں اُردو ادب میں تحقیقی روایت کا آغاز کیا۔اور تشنگانِ علم وادب کی علمی پیاس بجھانے کا اہتمام کیا۔

محترم اساتذہ کرام کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت کے طفیل آج میں اتنے بڑے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے قابل ہوسکا ہوں۔داغ مفارقت دینے والے عظیم اُستاد ڈاکٹر صابر کلوروی کی مغفرت کے لیے بارگاہ الٰہی میں دست بہ دُعا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی شفقت اور توجہ کا شکریہ ادا ہی نہیں کیا جاسکتا۔ان کی تحریک پر مجھے اس موضوع پر کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ ڈاکٹر سلمان علی صاحب، ڈاکٹر ریاض مجید صاحب، ڈاکٹر محمد احسان الحق صاحب، ڈاکٹر سلیم صاحب اور ڈاکٹر روبینہ شاہین صاحبہ کا بھی شکرگزار ہوں جن کے زیرسایہ گاہے بہ گاہے یہ کام آگے بڑھتا رہا۔ان کے لیکچرز اور مفید مشورے میرے لیے مشعل راہ رہے ہیں۔

احباب کا مثالی تعاون بھی شامل حال رہا ہے۔محمد رحمان، فوزیہ سحر ملک، (پی ایچ۔ڈی سکالرز) کے خلوص کے لیے دُعا گو ہوں۔ پیارے دوست اسحاق وردگ (سیکرٹری حلقہ ارباب ذوق) کی محبتوں کا بھی مقروض ہوں کہ اُنھوں نے ذاتی کتب خانے سے کئی کتابیں عنایت کیں۔

اور آخر میں مشفق ومہربان اُستاد ڈاکٹر ظہور احمد اعوان صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے باوجود علالت کے قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ڈاکٹر اعوان صاحب خود بھی ادبی کالم نگار ہیں اس لیے ان کی نگرانی میں یہ مقالہ لکھتے وقت مجھے کئی باریکیوں کا ادراک حاصل ہوا۔ربِ رحیم کے حضور ان کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔

میری ہر ممکن کوشش رہی ہے کہ اس مقالے کو ہر زاویے سے بے مثال اور مکمل بناؤں۔ یہ مشکل امر تھا کیونکہ ادبی کالم نگاری پر اس سے قبل خاطر خواہ کام نہیں ہوسکا ہے، اس لیے مجھے اس راہ میں کئی مشکلات سامنے آئیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس مقالے کی صورت میں ادبی کالم کی تنقیدی روایت کا پہلا باقاعدہ باب شروع ہوتا ہے۔ یقیناً اس کے بعد بھی اس تحقیقی وتنقیدی کام آگے بڑھے گا۔

شفیق احمد شنواری

بابِ اوّل

صحافت کیا ہے؟

فصلِ اوّل

صحافت کیا ہے؟

انسان کی فطرت میں تحقیق اور تلاش کا مادہ بد درجہ اتم موجود ہے۔ یہی جذبہ اسے اپنے سماج دوسرے انسانوں اور اردگرد کی دنیا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے بے چین رکھتا ہے۔ ابتدا میں زندگی اور معلومات کے ذرائع انتہائی محدود تھے۔اس زمانے میں انسانی فطرت کی بے چینی لامحدود رہی۔ اسی تناظر میں عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

> ''آج تک انسان کا جذبہ یہی رہا کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرے۔تجارتی قافلوں کے سفر نے تجسّس کا جذبہ تیز کیا اور جب زمان ومکان کی قیود ٹوٹنے لگیں تو جدید اخبار نویسی نے جنم لیا اور اس کی کوکھ سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پیدا ہوئے۔جو چشم زدن میں دُنیا کی ایک کونے کی خبر دوسرے کونے تک پہنچا دیتے ہیں''۔(۱)

صحافت کی تعریف:

صحافت کے لغوی معنی ''نامہ نگاری'' کے ہیں۔صحیفہ کا مطلب ہے۔''رسالہ'' یا ''کتاب''۔صحیفہ ایسے شائع شُدہ مواد کو بھی کہتے ہیں جس کا مقصد معاشرے کو معلومات فراہم کرنا ہو اور جو مقررہ وقفوں سے شائع ہوتا ہو۔

لغت میں صحافت کے معنی اخبار نویسی کے بھی ہیں۔اسی طرح ہم اخبارات ورسائل میں چھپنے والے مواد کو فنی اعتبار سے صحافت کہیں گے۔اور اس کے مرتبین صحافی کہلائیں گے۔عربی زبان میں اخبارات اور رسائل کو عام طور پر صحیفہ کہا جاتا ہے۔صحافت وہ ذریعہ ہے جو اقوام عالم کے سیاسی، معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی حالات سے عوام کو معلومات فراہم کرتا ہے۔موجودہ زمانے میں بڑھتی ہوئی ترقی اور مصروفیات کی وجہ سے زندگی کی شکل و صورت تبدیل ہوگئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج کے زمانے کی صحافت قدیم زمانے کی صحافت سے بہت زیادہ مختلف ہو گئی ہے۔آج صحافت کے معنی بہت زیادہ وسیع ہو گئے ہیں۔اس اصطلاح کے مفہوم میں نشر واشاعت کے وہ تمام ذرائع شامل ہیں جو عوام اور حکومت کو سیاسی، بین الاقوامی اور سماجی حالات سے باخبر رکھیں۔ان میں ریڈیو، ٹیلی

وژن، اخبار، اور نیوز ایجنسیاں (اے پی پی، این این آئی، آن لائن وغیرہ) اور بہت سے دوسرے ذرائع شامل ہوگئے ہیں۔

آج کے دور میں صحافت کی وسیع تر اہمیت وضرورت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ اس لیے اب اسے اِبلاغ عامہ کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ سائنس وٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی نے جہاں زندگی کے ہر شعبے کی تقدیر وتصویر بدل کر رکھ دی ہے۔ وہاں صحافت کے خدوخال بھی بہت زیادہ ترقی یافتہ ہوگئے ہیں۔ صحافت وذرائع ابلاغ کی اس معجزاتی ترقی کی وجہ سے مختلف ممالک ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ دنیا اب ایک عالمی گاؤں (گلوبل ویلیج) کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ اب صحافت وذرائع ابلاغ کا دور ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے میڈیا کا دور بھی کہا جاتا ہے اور میڈیا کی پروپیگنڈے کی مؤثر طاقت کی وجہ سے میڈیا وار کی اصطلاح بھی بطور ایک جنگی اور سفارتی حربے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

صحافت کو ریاست کے چوتھے ستون کا درجہ حاصل ہے۔ صحافت ایسی طاقت ہے جو حکومت کی حکمت عملی، کارکردگی اور منصوبہ بندی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جمہوری ممالک میں صحافت کا اہم فریضہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ حکومت کی ناقد ہو، اور اپنی خبروں، تجزیے اور مضامین کے ذریعے حکومت کی ایسی رہنمائی کرے کہ وہ عوامی و فلاحی مملکت کے طور پر اپنے فرائض بطریق احسن انجام دے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کئی ممالک میں حکومتیں صحافت کے زیر اثر رہتی ہیں۔

حکومت کے ساتھ ساتھ صحافت عوام میں بھی ایک مؤثر کردار رکھتی ہے۔ عوام کی سیاسی، نفسیاتی اور تہذیبی تربیت میں صحافت کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے۔ عوام کی رائے بنانے اور بگاڑنے میں صحافت کا مثبت اور منفی کردار کا عمل دخل تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ صحافت فی زمانہ عوام کی سیاسی تربیت گاہ کا اہم مرکز ہے۔ اس سلسلے میں بدر شکیب اپنی کتاب ''اُردو صحافت'' میں لکھتے ہیں:

> ''صحافت تہذیب وتمدن کی مشعل بردار ہے۔ ہر قوم اپنے تمدن کو صحافت ہی کے ذریعے اُجاگر کرتی ہے۔ اور مختلف تمدنوں میں باہمی ربط واختلاط کا صحافت ہی ایک سلسلہ ہے۔ اس طرح تہذیب وتمدن کی بقا اور ترقی کا بڑی حد تک صحافت ہی پر انحصار ہے''۔ (۲)

رائے عامہ کی تشکیل، عوام کی ترجمانی، قومی شعور کی بیداری، زندگی کا آئینہ، معلومات کا ذریعہ، حکومت اور عوام میں رابطہ کار، فکری رہنمائی، حکمرانوں کے غلط طرزِ عمل کا احتساب اور قومی ترقی میں کردار، یہ سب صحافت کے وہ اوصاف ہیں جس کی معترف حکومت بھی ہے اور عوام بھی۔ اس ضمن میں صحافت کے معروف اُستاد ڈاکٹر شفیق جالندھری رقم طراز ہیں:

''طاقت، قوت اور اثر میں صحافت کو مملکت کا چوتھا ستون قرار دے کر عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے۔ صحافت عوامی ذہن وفکر پر بہت بڑے پیمانے پر اثر انداز ہوتی ہے''۔ (۳)

صحافت اور معاشرہ:

صحافت کی تعریف، اہمیت، ضرورت اور مقاصد پر غور کیا جائے تو یہ ناقابل تردید حقیقت سامنے آتی ہے کہ صحافت اور معاشرہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ایک کی ترقی، ارتقا اور موجودگی دوسرے کی تکمیل اور ترقی کی ضامن ہے۔ معاشرہ اپنی ترقی اور مقاصد کے حصول کے لیے اظہار وابلاغ کے ذرائع تلاش کرتا ہے۔ صحافت کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو معاشرے کی تعمیر و ترقی میں بنیادی نوعیت کا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ صحافت، معاشرہ اور ترقی لازم وملزوم ہیں۔ وہی معاشرہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہوسکتا ہے جہاں صحافت ہر طرح کی پابندیوں اور قدغنوں سے آزاد ہو۔ کیونکہ معاشرے کی اصلاح، رائے عامہ کی تشکیل، عوامی مشکلات مسائل اور محرومیوں کا اظہار، اور قومیت اور اتفاق کی بنیاد کا انحصار صحافت پر ہے۔ چنانچہ صحافت کا پہلا اور آخری مقصد یہی ہونا چاہیے کہ وہ اپنی آزادی اور ذمہ داری کو برقرار رکھے۔ اور اپنے مختلف ذرائع کو بروئے کار لا کر عوامی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرے۔ عوام کا اعتماد حاصل کرے۔ ان کی درست سمت میں رہنمائی کرے۔

بامقصد صحافت قومی اور معاشرتی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس لیے صحافت کو عوام کی رائے کی ترجمان کہا جاتا ہے۔ اے جے بلیئر کی یہ رائے درست ہے کہ:

''صحافت کا فرض لوگوں کو اس طرح واقعات اور حالات سے واقف کرانا ہے کہ دنیا میں زمان ومکان اور ماحول کا فرق باقی نہ رہے''۔ (۴)

صحافت ایک مقدس اور ذمہ دار پیشہ ہے۔اس میں دماغی محنت سے کام لینا پڑتا ہے۔صحافت کے مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ صحافی میں اخلاقی جرأت اور قربانی و بہادری کا جذبہ موجود ہو۔یہ انتہا درجے کی سنجیدگی چاہتا ہے۔

اُردو صحافت پر اُردو ادب کے اثرات:

اُردو صحافت کی تشکیل میں اُردو زبان و ادب کے اہل قلم نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔اور ادب ہی کے سہارے صحافت نے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔صحافت اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔اگرچہ صحافت کی زبان و انداز تحریر، ادبی تحریر سے مختلف ہوتا ہے۔تاہم پھر بھی ماہرین اسے ادب ہی کی ایک شاخ سمجھتے ہیں۔اس حقیقت کو صحافت کے ماہر پروانہ ردلوی نے یوں واضح کیا ہے کہ:

> ''ہر دور میں اعلیٰ پایہ کے ادیب اخبارات سے وابستہ رہے ہیں۔چاہے وہ اورنگزیب کے زمانے کے اخبار نویس سید محمد بلگرامی اور میر غلام علی آزاد ہوں یا بعد کے زمانے کے سدا سکھ لعل، مولوی باقر علی، سر سید احمد خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، عبدالحلیم شرؔر وغیرہ۔اُردو صحافت نے اُردو زبان کو فروغ دے کر ادبی زبان بنانے کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں۔اس سے لاکھ چشم پوشی کی جائے مگر جب کوئی بھی اُردو زبان کے فروغ کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو وہ سب سے پہلے اُردو صحافت کا ہی ذکر کرے گا جس نے اُردو کی نثری ادب کا باقاعدہ آغاز کیا اور اُردو شاعری کو بند کمروں اور نجی محفلوں سے عوام تک پہنچا کر اسے مقبول بنایا''۔(۵)

آج کے دور میں بھی دیکھا جائے تو اردو کے چوٹی کے ادیبوں نے صحافت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔مثلاً شورش کاشمیری، چراغ حسن حسرت، شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، ابن انشاء، احمد ندیم قاسمی، مشفق خواجہ، مرزا ادیب، جمیل الدین عالی، انتظار حسین، عطاء الحق قاسمی، وغیرہ وغیرہ۔

اُردو صحافت کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو صحافت کی نشو و نما میں اُردو کے شاعروں، ادیبوں کا واضح کردار نظر آتا ہے۔وہ اخبارات میں لکھ کر صحافتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ادبی ذوق کی تسکین بھی کرتے

تھے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اُردو صحافت نے اردو ادب کی کوکھ سے جنم لیا۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں کہ:

''اُردو صحافت کے آغاز میں ادیبوں نے اس کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، لیکن اس صحافت کا قاری ادب کے قاری سے مختلف نہ تھا۔ اس لیے ابتدائی اخبار نویسی ادبی معیاروں اور ادبی نثر کے جملہ لوازم سے روشناس تھی۔ اس وقت صحافت پیشہ کے طور پر جداگانہ طور پر مشخص نہ تھی۔ اس اعتبار سے صحافت ادب ہی کی ترجمانی اور ترسیل کا فریضہ ادا کرتی رہی۔ لیکن اُنیسویں صدی کے آخر میں ادبی پرچوں اور ادبی اخباروں کی جگہ عام اخبارات نے لے لی۔ خبریت کا عنصر لازمۂ صحافت ہو جانے سے ادبی نثر نویسی کی جگہ اخباری نثر نویسی کو فروغ حاصل ہوا۔ اور عبارت آرائی کی جگہ مطالب نویسی کو اہمیت ملی۔ زبان و بیان کے عام اور متعارف سانچے صحافت کا جزو لازم ہوئے۔'' (٦)

ادب کا کردار ایسا توانا اور بھرپور تھا کہ اُس دور میں اخبارات کے مدیر بذاتِ خود شاعر اور ادیب تھے۔ اور ان کی ادارت میں چھپنے والے اخبارات و رسائل اُن کے ادبی ذوق کے ترجمان تھے۔ عوام کا ذوق و مذاق بھی صاف ستھراء اور نکھرا تھا۔ عفیرہ حامد علی کی رائے میں:

''ادب اور صحافت ہر دور میں ایک ساتھ پروان چڑھے۔ صحافت کا اصل مقصد ادب کی ترویج و ترقی تھا۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اخبارات و رسائل نے زبان کو ترقی یافتہ اور ادب کو بلندیوں سے ہم کنار کیا۔ اس دور کے اخبارات کی زبان میں ادبیت چھائی ہوتی تھی۔ سر سیّد احمد خان نے صحافت کو صحافت کا درجہ دیا۔ اسلوب بیان یکسر بدل گیا۔ لیکن صدی کے بدلتے ہی ادب صحافت پر حاوی ہو گیا اور صحافت کی زبان میں پھر سے ادبی چاشنی آنے لگی۔ ١٩٣٦ء کی ترقی پسند تحریک نے ادب اور صحافت کے راستے الگ الگ کر دیے۔ لیکن اس کے باوجود صحافت پر ادب کا اثر رہا اور رسائل کے اجراء میں مزید اضافہ

ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد ادب اور صحافت بالکل الگ ہوگئے اور اخبارات
میں یہ عنصر بڑی حد تک ختم ہوگیا۔ ادبی زبان کی جگہ صحافتی زبان نے لے لی
اور عام فہم زبان کا استعمال ہونے لگا''۔ (۷)

ادب اور صحافت کا تقابلی جائزہ:

ادب اور صحافت میں متعدد مماثلتوں کے باوجود یہ دو الگ الگ شعبے ہیں۔ ادب اور صحافت کا مواد، موضوع، طرز اظہار، جداگانہ ہے۔ ادب اور صحافت کے قاری کی ذہنی سطح اور مطالبات و تقاضوں میں فرق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ادب و صحافت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

''بحیثیت مجموعی ادب کسی زمانے کے خارجی حالات و واقعات کی بہ نسبت اس زمانے کے میلانات و رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ ایک تاریخی جائزہ ایک ادب پارے سے اس حد تک مختلف ہے کہ جہاں مقدم الذکر کا دائرہ عمل واقعات کی ترتیب و تدوین تک محدود ہے۔ وہاں ادب ان احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ جو ایک خاص زمانے کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور جن کے باعث اجتماعی ملکی شعور ایک حد تک مرتب ہوتا ہے۔ ادب اور تاریخ کی حد فاصل کچھ اور سمٹ کر ادب اور صحافت کی حد فاصل کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اور یوں کہ جہاں تاریخی جائزے کا میدان کافی وسیع ہوتا ہے۔ اور ایک خاص دور کے واقعات کو زیر بحث لاتا ہے۔ وہاں صحافت کی تنگ و دو سمٹ کر ان ہنگامی واقعات تک محدود ہوتی ہے۔ جو ایک وسیع تر تاریخی جائزے میں غالباً کم اہمیت رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ادب کی حیثیت مستقل ہے، اور صحافت کی حیثیت محض ہنگامی۔ لیکن ادب اور صحافت کا فرق ''مواد'' اور ''موضوع'' تک محدود نہیں''۔ (۸)

ایک ادیب تخلیق ادب کے عمل میں خارجی عوامل کے ساتھ ساتھ اپنے داخلی محرکات، جذبات و احساسات سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ جب کہ صحافی صرف خارجی عوامل ہی کو عام فہم طرزِ تحریر میں بیان کرتا ہے۔ وہ بے لاگ

خبروں میں اپنا ردعمل یا نقطہ نظر پیش نہیں کر سکتا۔ یعنی جو ادب کی خوبی ہے وہی شے صحافت کی خامی بن جاتی ہے۔

ادب کی طرح صحافت بھی ارتقا کے مرحلے سے گزرتی رہتی ہے۔ اس لیے قاری کی بدلتی ذہنی سطح اور نئے خیالات اور تقاضوں کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ خبر کے ابلاغ کے لیے ادب کی خاص سطح سے نیچے اُتر جائے تاکہ عام قاری بھی صحافت سے استفادہ کر سکے۔ جدید دوز میں صحافت بطور پیشہ ایک الگ فن اور ادارے کے درجے پر فائز ہے۔ ادب اور صحافت کے مزاج اور مقاصد میں بنیادی فرق ہے اور یہی فرق ادبی نثر اور صحافتی تحریر میں بھی پایا جاتا ہے۔ ادب کے قارئین اپنے داخلی روّیوں اور ذوق سلیم میں بھی مختلف ہیں۔ صحافی اپنے قاری کے لیے آسان سے آسان اور سیدھی سادی تحریر کو پیش نظر رکھتا ہے۔ جو بغیر کسی ابہام کے اپنا ابلاغ کر سکے۔

صحافت میں عارضی موضوعات زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ ان موضوعات میں ہنگامیت کا عنصر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ادب میں مستقل اور دائمی قدروں کو موضوع بحث و مرکز نگاہ بنایا جاتا ہے۔ ایک صحافی کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے ہنگامی موضوع کو غیر جانبداری کے ساتھ بیان کرے۔ اسے یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنا ردعمل یا فیصلہ بھی شامل کرے۔ یہ فیصلہ وہ قارئین پر چھوڑ دیتا ہے۔ ادب میں ایسی کوئی قدغن نہیں ہے۔ شاعر اور ادیب زندگی کی مستقل جہتوں میں جس چیز کو اپنی تخلیق کا موضوع بنائے گا تو وہ اس میں اپنی رائے اور محسوسات شامل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یعنی صحافت خارجیت ہے اور ادب داخلیت۔ ادب میں حقیقت کو تخلیقی سطح پر سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جبکہ صحافت میں حقیقت کو واقعاتی سطح پر بیان کیا جاتا ہے۔

ادب کردار اور واقعات کے بیان میں مبالغہ آمیز تجربے، تخیّلی تعبیر، داخلیت اور انفرادیّت پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور یہی اس کی صفاتی جہت ہے۔ جبکہ صحافت صرف واقعہ کی خارجی صورت پر انحصار کرتی ہے۔ اسی طرح یہ دونوں جداگانہ طرزِ اُسلوب کے حامل شعبے ہیں۔

☆☆☆☆

فصلِ دوّم

اُردو صحافت کا آغاز

اُردو نثر کی ابتدا دکن سے ہوتی ہے اب تک دریافت شدہ اُردو نثر کا عمدہ نمونہ ''سب رس'' ہے۔اس سے پہلے بھی نثر نے ابتدائی منزلیں طے کی ہیں۔لیکن وہ مذہبی یا اخلاقی موضوعات پر ہیں۔ ''سب رس'' سے قبل نثر کے لکھنے والوں کے لہجے میں سادگی، روانی اور صفائی ملتی ہے۔ تاہم لفظوں کے استعمال میں فنکارانہ حسن کاری کا فقدان ہے۔

اُردو نثر کے اسلوب کی ترقی کا دوسرا دور شمالی ہندوستان میں تحسین کی ''نو طرزِ مرصع'' سے شروع ہوتا ہے۔اس دور کی نثر میں پر تکلف انداز بیان مقفّیٰ و مسجّع عبارت آرائی ہے۔ جو فارسی اُسلوب کے زیر اثر رواج پذیر ہوئی۔ فارسی کی حد درجہ تقلید نے اس دور کی نثر کو صنائع و بدائع کی ظاہری آرائشوں اور حسنِ الفاظ کی رنگینی و رعنائی عطا کی۔ اسلوبِ نثر کا تیسرا دور فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی نثر کا اعلیٰ نمونہ میر امن کی باغ و بہار کی صورت میں ملتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج نے سادہ اور آسان اُردو نثر کو رواج دیا۔تا کہ باہر سے آنے والے انگریزوں کو اس زبان کے سیکھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ یہ پہلا ادارہ تھا جس نے اُردو زبان کی ترقی کے لیے وسیع پیمانے پر خدمات سرانجام دیں۔

یہ وہ دور ہے جس میں اردو میں با قاعدہ طور پر صحافت کا آغاز ہوتا ہے۔ پروفیسر ایس ایم ناز اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اسی دور میں اُردو کا اوّلین اخبار ''جام جہاں نُما'' منظر عام پر آیا۔ مارچ سے جون ۱۸۲۲ء کے وسط تک یہ اخبار اُردو میں شائع ہوتا رہا۔ پھر اسے فارسی میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایک سال بعد پھر اس میں اُردو کا گوشہ بھی شامل ہوگیا۔ تاہم عوام میں فارسی کا ذوق پھیلا ہوا تھا اور ان کے لیے یہ تبدیلی کوئی خاصی چیز نہ تھی۔ اس کا فائدہ اُن انگریز باشندوں کو ہوا جو فورٹ ولیم کالج سے تازہ تازہ اُردو سیکھ کر نکل رہے تھے۔ ابھی تک عوام اُردو سے مانوس نہیں ہوئے تھے۔ اس

کی گواہی ''جام جہاں نُما'' کے ایڈیٹر کی اس رائے سے بھی ملتی ہے۔ ''قدر شناس جن کی نصف گستری سے اس کاغذ نے رونق پائی اُردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے وہ اہل ہند (اُردو) جنھوں کی زبان ہے، فارسی چاہتے ہیں''۔ (۹)

''جام جہاں نُما'' میں خبروں کے علاوہ تاریخ اور شاعری و ادب کے مضامین بھی چھپتے تھے۔ اس کی زبان سادگی کا عمدہ نمونہ تھی۔ اس کا اندازِ تحریر واضح ہوتا تھا۔ یہ اپنے دور کی تہذیب و معاشرت کا ترجمان تھا۔ عبدالسلام خورشید ''جام جہاں نُما'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''جام جہاں نُما کی زبان سادہ تھی۔ اور انداز بیان سلجھا ہوا تھا اور اس اخبار کے مطالعہ سے ہمیں اس دور کی معاشرت کا رنگ ڈھنگ معلوم ہوسکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے اور اخباری ذوق کے فقدان کی بنا پر قارئین کا حلقۂ بے حد مختصر اور محدود تھا۔'' (۱۰)

اگر چہ اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے وسیع علاقوں میں اُردو بولی جاتی تھی۔ لیکن مغلیہ شہنشاہیت کے دور میں فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ فارسی علمی و ادبی حلقوں میں بھی مقبول تھی۔ اور علمی شہ پارے اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ فارسی تہذیب و ثقافت، علم و ادب و عرفان کا اثاثہ تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو جب ہندوستان کے وسیع حلقوں میں عمل دخل حاصل ہوا تو اُس نے اپنی سیاست اور ضرورت کے پیشِ نظر ہندوستان کے مشترکہ فکری ورثے کو نیست و نابود کرنے کے لیے فارسی زبان کے خلاف سازشوں کا آغاز کیا۔ چونکہ یہ اہلِ علم و دانش کی واحد زبان تھی اس لیے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اسے یکسر منسوخ کیا جائے۔ اس لیے بتدریج جڑ سے اُکھاڑنے کے لیے درج ذیل کوششیں کی گئیں۔

(۱) فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام اُردو زبان کا فروغ۔

(۲) ۱۸۳۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے محسوس کیا کہ جب تک فارسی زبان سرکاری زبان رہے گی اس سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں۔ چنانچہ اس نے اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ اس سے اُردو نثر کے عروج کے دور کا آغاز ہوا۔ اور فارسی زبان اسی تیزی سے زوال پذیر ہونے لگی کہ صدیوں کی عظیم الشان عمارت چند سالوں میں زمین بوس ہو گئی۔

عبدالسلام خورشید اس بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اُردو سے کوئی عشق نہیں تھا۔ اس نے اُردو کی حوصلہ افزائی صرف اس لیے کی کہ اس سے سامراجی مفاد کو تقویت حاصل ہوتی تھی۔ (۱۱)

انگریز سامراج کی اس پالیسی سے اُردو نثر کو بے حد فائدہ ملا۔ انگریز حکومت مغربی علوم کی اشاعت چاہتی تھی اور اس نے صحافت کو اس کا اہم وسیلہ سمجھتے ہوئے بعض اُردو اخبارات کی مالی سرپرستی کی۔ اُس دور میں اخبارات کے دو بڑے مرکز تھے۔ اوّل دہلی، دوم لاہور۔ آہستہ آہستہ اُردو صحافت ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلنے لگی۔ یہاں پر ہم ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پیشتر اُردو صحافت کی ترقی کا جائزہ تفصیل سے لیں گے۔ تاکہ اُردو نثر کے اُسلوب کا وہ تاریخی پس منظر سمجھ سکیں، جس کے بطن سے بعد ازاں اُردو کالم کے نمائندہ اسالیب نے جنم لیا۔

اُردو نثر کے فروغ میں چند اہم اخبارات کا کردار:

ذیل میں چند ایسے اخبارات کا ذکر کیا جاتا ہے، جنھوں نے اُردو نثر کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

دہلی اخبار:

محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر دہلی میں اُردو صحافت کے سفیر اوّل تھے۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والا دہلی اخبار دہلی شہر سے شائع ہونے والا پہلا اخبار تھا۔ جس کا اجراء ۱۸۳۷ء میں ہوا۔ اس اخبار میں سلیس رواں نثر میں خبریں اور واقعات درج ہوتے تھے۔ عبارت رنگین و مسجع ہونے کے بجائے سادہ اور عام فہم ہوتی تھی۔ پروانہ ردولوی کا خیال ہے کہ:

''دہلی اُردو اخبار اُردو صحافت کی شاہراہ پر ایک لحاظ سے ایک سنگ میل ہے کہ اس نے ''جام جہاں نُما'' کے بعد ایک اہم سنگ میل طے کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ، ''رفتہ رفتہ اُردو صحافت کا لہجہ بدلا اور زبان میں بھی نکھار پیدا ہوا۔ اُردو اخبارات کی زبان اور لہجے میں جو تبدیلیاں آئیں ان کے نقیب اوّل مولوی محمد باقر تھے۔ ان کے اخبار میں جو خبریں یا مضامین شائع ہوتے تھے وہ ہندوستان

کے تمام گوشوں سے وقائع نگار ارسال کرتے تھے۔اس انتظام سے اُردو کے
نثری خزانہ میں غیر محسوس طور پر زبردست اضافہ ہوا۔کیونکہ مختلف علاقوں کے
محاورات، اصطلاحات اور خاص خاص الفاظ جو علاقائی حدود میں قید تھے اخبار
کے صفحات پر جگہ پانے لگے اور ادب کا حصہ بنتے چلے گئے۔اس طرح اُردو
صحافت نے اُردو ادب کو نئی تشبیہوں اور نئی تمثیلوں سے مالا مال کیا۔غیر مروّج
الفاظ کو ادب کا حصہ بنایا۔اور بہت سے مروّج الفاظ کا تو پیکر تبدیل کر دیا، یا ان
کو ادب سے بالکل خارج کر دیا۔'' (۱۲)

غرض یہ کہ ''جام جہاں نُما'' کے بعد دو عشروں میں اُردو نثر کی دنیا میں زبردست تغیر رونما ہوا۔روز بروز اُردو صحافتی نثر ترقی کرتی رہی۔مولوی محمد باقر کی شعوری کوشش تھی کہ خبروں میں اعلیٰ درجہ کی نثر کا رنگ روپ شامل ہو۔وہ اکثر خبروں میں اپنا تبصرہ بھی شامل کرتے رہتے تھے۔جو ادبی رنگ میں ہوتا تھا۔اس اخبار کی عظمت کے اعتراف میں مولانا امداد صابری لکھتے ہیں:

''اس اخبار میں خاص طور پر دہلی کی سیاسی مجلسی اور تمدنی زندگی پر روشنی ڈالی
جاتی تھی۔ادبی مضامین بھی اس میں نظر آتے ہیں''۔ (۱۳)

سیاست، معاشرت، اور تاریخی حوالوں کے علاوہ اس اخبار کی ایک اہم جہت یہ بھی ہے کہ اس نے ادب کی ترقی میں بھی اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔خواجہ احمد فاروقی اس ضمن میں رائے دیتے ہیں:

''سیاست سے قطع نظر دہلی اُردو اخبار کی ادبی اہمیت بھی ہے۔اوّل تو یہ کہ محمد باقر
اور محمد حسین آزادؔ اس کے دامن سے وابستہ تھے۔جن کی علمی حیثیت مسلم ہے۔
دوسرے غالبؔ، ظفرؔ، ذوقؔ، مرزا انوار الدین، مرزا سلمان شکوہ، مرزا جیون
بخت، اور نواب زینت محل کے متعلق اس میں بے مثل مواد ملتا ہے''۔ (۱۴)

دہلی اُردو اخبار کی نثر کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا اسلوب جدید نثر کے اوّلین مگر بہترین نمونوں میں شامل ہے۔اس میں زندگی کی حرارت، حسن، روانی اور بے ساختگی ہے۔اس کے ساتھ سیاسی بیداری، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور ادبی لطافت کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔اس اخبار سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحافتی اسلوب سے فارسی کا

چولا اُترا تو نہیں مگر اس کے بند ضرور ڈھیلے پڑنے لگے ہیں۔(۱۵)

سیّد الاخبار:

سیّد الاخبار دہلی ہی سے ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا۔ جس کے مالک سر سیّد احمد خان کے بھائی سیّد محمد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد خود سرسیّد نے کچھ دن اس کے لیے مضامین لکھے۔ اس اخبار کا نثری اسلوب کم وبیش ''اودھ اخبار'' کی طرح تھا۔ سرسیّد کی ادبی تربیت اور ان کی سادہ نثر نویسی میں اس اخبار نے اہم فریضہ سرانجام دیا۔ اُنھوں نے بعد میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں جو مقبول عام نثری انداز تحریر اختیار کیا۔ اس کی ابتدائی مشق ''سید الاخبار'' کے صفحات پر ہوئی۔ سر عبدالقادر کی رائے ہے کہ:

''سیّد احمد خان نے 'سید الاخبار' میں مضامین لکھ کر اپنی اخبار نویسی کی مستقل بنیاد رکھی''۔(۱۶)

مرزا غالب بھی اس اخبار کے بڑے مداح تھے۔ اپنے وقت کے شعراٗ و ادباء کی تخلیقات اس اخبار میں اہتمام سے چھپتی تھیں۔ یہ اخبار ۱۸۵۰ء میں بند ہو گیا۔ ان اخبارات کے علاوہ صادق الاخبار، کریم الاخبار، خلاصۃ الاخبار، خلاصہ اطراف، ضیاء الاخبار، اخبار دہلی، وحید الاخبار اور نورمغربی و نورمشرقی وغیرہ بھی اسی دور میں شائع ہوتے تھے۔ ان میں اوّل الذکر اس لحاظ سے تاریخی اہمیت رکھتا ہے کہ میں بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کی روداد شائع ہوتی رہتی۔ دہلی سے خالص علمی و ادبی رسائل بھی شائع ہوئے۔ مثلاً قرئن سعدین، گل رعنا، فوائدالناظرین، محبّ ہند، اور فوائد الشائقین۔

تہذیب الاخلاق:

اُردو صحافت کی تاریخ میں ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کا دن اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اس تاریخ کو سرسیّد احمد خان نے اصلاحی مقاصد کے تحت ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ اس رسالے نے اُردو نثر کی دُنیا میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اور ہم عصر صحافت کو بھی اُسلوب وطرزِ ادا اور آسان فہم زبان کا راستہ دکھایا۔ بقول ڈاکٹر صالح عبداللہ:

''سرسیّد کو کسی پہلو سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا اپھر ہندوستان

کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہے۔اس نے جولہریں اُٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں۔خواہ ان کی سمت ہمیشہ وہ نہ رہی ہو۔جو سر سیّد پسند کرتے تھے‘‘۔ (۱۷)

سر سیّد کے ان اخبارات نے اُردو زبان کی بہت بڑی خدمات انجام دیں۔سر سیّد کی جماعت کے سامنے عظیم مقاصد تھے۔وہ اخبارات کے ذریعے اپنے نظریات ہندوستانیوں تک پہنچا دیتے تھے۔سر سیّد جدیدیت کے علم بردار تھے۔ وہ قدیم اندازِ تحریر کے قائل نہ تھے جس کا مقصد محض لفظی بازیگری اور ذہنی عیاشی تھا۔سر سیّد سے پہلے کی صحافت کا طرزِ بیان شاعرانہ انداز بیان رکھتا تھا۔زبان شاعرانہ، پُر تکلف اور لفاظی سے بھر پور تھی۔دنیا کے مختلف علوم سے اس کا راستہ کٹا ہوا تھا۔بقول ڈاکٹر مسکین علی حجازی:

’’سر سیّد نے صحافت میں علم کا پیوند لگایا۔ان کے ساتھ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ دہلوی، مولانا نزیر احمد، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حالؔی اور بہت سے دوسرے زعماء بھی تھے، جو اپنے مضامین و مقالات کے ذریعے براہ راست بلکہ الگ الگ طور پر علم وادب کی اصلاح میں شریک تھے۔ان کی تحریروں میں متانت اور جامعیت کے عناصر ملتے ہیں۔اور یہی عناصر دور سر سیّد کی صحافت اور ادب کے بنیادی عناصر ہیں۔اگر چہ بعض نقادوں کی رائے ہے کہ سر سیّد احمد خان کی زبان ادبی چاشنی سے محروم ہے اور انگریزی الفاظ کے استعمال نے اسے عجیب وغریب بنا دیا ہے مگر ان کی تحریر کا یہ عیب تحریر کی خوبیوں کے مقابلے میں وزنی نظر آتا ہے۔‘‘ (۱۸)

تہذیب الاخلاق کا تصور سر سیّد احمد خان انگلستان سے لائے تھے۔ وہاں وہ The Taller اور The Speclulor کے ان کارہائے نمایاں سے آشنا ہوئے۔جو اُنھوں نے اٹھارویں صدی کے آغاز میں انگریزوں کی خلاف عادات، رسم ورواج اور قومی خیالات کو بدلنے میں سرانجام دئیے۔

تہذیب الاخلاق نے اُردو نثر کا ایسا نمونہ پیش کیا جس میں اُردو نثر آئندہ سو سال تک ڈھلتی رہی، اور اس نے رنگین، مقفّیٰ اور خیالی نثر اور داستانی وشاعرانہ انداز بیان پر خطِ تنسیخ پھیر دیا۔

''اودھ پنچ'' کا اخبار:

''اودھ پنچ'' ایک ایسے دبستان صحافت کا نام ہے جس کی بنیاد مزاح اور ظرافت پر تھی۔ اسے اُردو صحافت کا ایک دلچسپ باب کہنا چاہیے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں جب کہ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اُردو صحافت میں سنجیدگی، گہرائی، اور فکر ونظر کی بلندی پیدا ہو رہی تھی۔ اسی زمانے میں لکھنؤ قہقہوں کا گلشن بنا ہوا تھا۔ جنوری ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے ''اودھ پنچ'' منظر عام پر آیا۔ اس کے مُدیر ومنتظم منشی سجاد حسین تھے۔ جو نثر نگاری کی زبردست تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ اس اخبار کے دیگر ممتاز قلمکاروں میں مرزا مچھو بیگ، ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق، احمد علی کمنڈی اور اکبرالہ آبادی شامل ہیں۔ اس اخبار کا ایک دلچسپ وصف یہ بھی تھا کہ اس کے سرورق پر ایک کارٹون ہوتا تھا۔ اس میں مضامین، نظمیں، خبریں اور کارٹون ہوتے تھے۔ اسی اخبار نے صحافت کی روایت کو استحکام دیا۔ نظریاتی اعتبار سے یہ مغربی تہذیب کا سخت نکتہ چین تھا۔ چونکہ سرسیّد احمد خان مغربی تہذیب وتعلیم کے دلدادہ تھے اور خواہش مند تھے کہ ہندوستانی بھی مغرب کے رنگ میں رنگ جائے۔ اس لیے ''اودھ پنچ'' نے سرسیّد تحریک کو شک کی نظر سے دیکھا۔ اور مشرقی روایات واقدار کے تحفظ میں کمربستہ ہوگیا۔ اس میں مزاحیہ انداز میں سرسیّد تحریک پر تنقید کی جاتی تھی۔ اور انگریزوں کی پالیسیوں اور ان کے امتیازی برتاؤ اور ملازمتوں کے معاملے میں ہندوستانیوں کے ساتھ معاندانہ روّیہ پر طنز کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ''اودھ پنچ'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

> ''دیسی بوجہ ناقص طریقہ تعلیم سرکاری انیس سال کے سن تک سول امتحان دینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اور اس سول سروس کے میوے کو ہندوستان کی آب و ہوا موافق نہیں۔ لہٰذا یہ ولایتوں کے لیے مخصوص ہے۔ چونکہ دیسیوں کا سر کم وزن ہوتا ہے۔ اور کم وزن اور چھوٹا سر حماقت کی نشانی ہے۔ لہٰذا دیسی احمق ہیں۔ اس واسطے دیسیوں کے رائے قابل مضحکہ ہے۔ اور مضحکہ چونکہ ذلیل کرتا ہے۔ لہٰذا مضحکہ ذلیل ہوگئے''۔ (۱۹)

ڈاکٹر وزیر آغا ''اودھ پنچ'' کے اسلوب طنز ومزاح کے حوالے سے یہ رائے دیتے ہیں۔

''اُودھ پنچ'' کی ظرافت بڑی حد تک ادبی عناصر سے تہی اور سستی قسم کے ہزل

اور پھکڑ پن سے زیادہ قریب ہے''۔(۲۰)

اس اخبار نے طنز و مزاح کے روپ میں تنقید کے ایک اُسلوب کو متعارف کرایا۔اب صحافت میں سیاسی اُمور، معاشرتی ناہمواریوں پر کھل کر تنقید ہونے لگی۔جگہ جگہ ''پنچ'' اخبار جاری ہوئے۔مثلاً سرپنچ ہند لکھنؤ، پنجاب پنچ لاہور، کلکتہ پنچ، بنارس پنچ، ہریانہ پنچ، کرناٹک پنچ، جالندھر پنچ وغیرہ۔اُردو زبان و ادب پر ''اُودھ پنچ'' کے اثرات کا اعتراف کرتے ہوئے چکبست لکھنوی لکھتے ہیں:

''اودھ پنچ کی یادگار خدمت یہ ہے کہ اس نے اُردو نثر کو اس کا مصنوعی زیور اُتروا کر جس میں سوائے کاغذی پھولوں کے کچھ نہ تھا۔اسے پھولوں سے آراستہ کیا۔جس میں قدرتی لطافت کا رنگ موجود تھا''۔ (۲۱)

منشی سجاد حسین نے ''اُودھ پنچ'' میں بہترین لکھنے والے جمع کر لیے تھے۔شوخی و بزلہ سنجی ان کے خمیر میں داخل تھی۔ معمولی معمولی موضوعات میں سے وہ بزلہ سنجی کا سامان پیدا کر دیتے تھے۔جہاں اس مقصد کے لیے وہ ''اُودھ پنچ'' میں دنیا کی کئی مشہور شخصیتوں کے نام خطوط بھی شائع کر دیتے تھے۔جو طنز و مزاح کے حربوں سے بھرپور ہوتے تھے۔ یہ مزاح کبھی کبھی سوقیانہ انداز بھی اختیار کر لیتا تھا، جو ذوقِ طبع پر گراں گزرتا تھا۔اس میں لکھنؤ کے ایک حلقہ کی پست مذاقی کو دخل حاصل تھا۔جو اس اخبار کے شوقین تھے۔

اودھ پنچ نے صحافت میں طنز و مزاح کے لیے ایسی بنیاد فراہم کی جس پر بعد میں فکاہیہ کالم کی مضبوط عمارت کھڑی ہوئی۔یہ اخبار ظرافت کا سرچشمہ تھا۔اور عام طور پر لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ رہتے تھے۔جو پھبتی نکل جاتی تھی، وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی۔اور دور دور مشہور ہو جاتی تھی۔مگر قوموں کے مذاقِ سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا، اس کو دیکھتے ہوئے ہم ''اودھ پنچ'' کی ظرافت کو بہ حیثیت مجموعی اعلیٰ درجے کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔تاہم اس کی صحافتی و ادبی خدمات تسلیم شدہ ہے۔ڈاکٹر رؤف پاریکھ کے مطابق:

''اودھ پنچ کے تین کارنامے ایسے ہیں جو اسے رہتی دنیا تک اُردو ادب اور اُردو مزاح زندہ رہیں گے۔اوّل اس نے صحافت کو ایک باقاعدہ مشن اور مسلک بخشا۔دوم، اس نے مزاحیہ صحافت کو اتنا مقبول بنایا کہ ایک طویل عرصے تک اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔اور اس کے تتبع میں کئی مزاحیہ جریدے نکلے۔

جنھوں نے مزاح کو مزید فروغ دیا۔ سوم، اس نے اُردو مزاح کی باقاعدہ تشکیل اور صورت پذیری میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ اس سے قبل اُردو مزاح بے قاعدہ سا تھا۔ غالب نے صحیح معنوں میں اس کی بنیاد رکھی۔ اور ''اودھ پنچ'' اُردو مزاح کا اہم ترین موڑ بن جاتا ہے''۔ (۲۲)

مہذّب اور دل گداز:

اُردو صحافت میں ''مہذّب ''اور'' دل گداز'' کا مقام بھی اہمیت کے قابل ہے۔ مشہور ناول نگار عبدالحلیم شؔرران رسائل کے بانی تھے۔ اُردو صحافت کی تاریخ میں شؔرر کو بھی اپنے اُسلوب بیان کی قدرت و دلکش موضوعات کی رنگارنگی اور سلاستِ زبان کے اعتبار سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ہفت روزہ ''مہذب'' یکم اگست ۱۸۹۰ء کو منظر عام پر آیا۔ اس اخبار کے مقاصد کی تشریح پہلے شمارے میں ان الفاظ میں کی گئی۔

''تین ہی احوال ہیں جن پر عام اخبارات کی تحریروں کا مدار ہے۔ پالٹکس، سوسائٹی اور لٹریچر۔ مہذب بھی ان تینوں معاملات میں اپنے ناظرین سے پوری ترقی اور کامیابی کا وعدہ کرتا ہے'' (۲۳)

مہذب نے اُردو صحافت کی ترقی میں اپنا روشن کردار ادا کیا۔

عبدالحلیم شؔرر طویل مدت تک ماہانہ ''دلگداز'' کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ یہ رسالہ ان کی ادبی و علمی صحافت کا شاہکار ہے۔ ''دلگداز'' ۱۸۸۷ء میں منظر عام پر آیا اور بیسویں صدی کے ربع اوّل تک شائع ہوتا رہا۔ اس رسالے میں صرف ادبی مضامین ہی نہیں آتے تھے۔ بلکہ اہم سیاسی، تمدنی، اُمور پر بھی اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ ''دلگداز'' کے مقاصد بیان کرتے ہوئے عبدالحلیم شؔرر لکھتے ہیں،

''دل گداز اُردو رنگ وسخن میں ایک نئی روح پھونکنے اور نئی طرح کی قوت مقناطیسی پیدا کرنے کے لیے جاری ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ''دل گداز'' اپنے رنگ میں اکیلا ہے''۔ (۲۴)

بیسویں صدی کے دیگر نمایاں اخبارات میں ہندوستانی لکھنو، قیصر الاخبار دہلی، پنجابی اخبار، رفیق ہند

لاہور، آفتاب پنجاب لاہور، کشف الاخبار بمبئی، شمس الاخبار مدراس، جریدہ روزگار مدراس، قاسم الاخبار بنگلور، میسور اخبار بنگلور، منشوری محمدی بنگلور، اخبار عام، پیسہ اخبار لاہور وغیرہ شامل ہیں۔ (۲۵)

آخر الذکر اخبارات ''اخبار عام'' اور ''پیسہ اخبار'' جدید صحافت کے علم بردار سمجھے جاتے ہیں۔ یہ اخبارات ابتداء میں ہفت روزہ اخبار تھے پھر ہفتے میں تین مرتبہ نکلنے لگے اور صدی کے آخری برسوں میں روزانہ چھپنے لگے۔

''اخبارِ عام'' یکم جنوری ۱۸۷۱ء کو پنڈت قلندر رام نے لاہور سے شروع کیا اس میں خبروں کے علاوہ شذرات اور مضامین ہوتے تھے۔ زبان سلیس اور عام فہم تھی۔ اس لیے یہ اخبار ہر طبقے میں مقبول تھا۔ ''اخبار عام'' کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر بول چند اپنے انگریزی مقالے میں لکھتے ہیں۔

> ''اخبار عام نے پنجاب کی اُردو صحافت کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا اُردو میں خبریں کافی تعداد میں دی جاتی تھیں۔ یہ اخبار نہ صرف ہندوستان بلکہ غیر ممالک کی بھی تازہ ترین خبریں چھپتا تھا۔ زیادہ تر مقامی اخبار خبروں کے سلسلے میں اسی پر انحصار کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹ جنوری ۱۹۰۸ء کے شمارے میں فخر کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ شمالی ہند کے سب بڑے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے ہمارے اخبار سے مکتوب چین نقل کیا۔ سچ پوچھیے تو یہ ایک اُردو اخبار کے واقعی فخر کا مقام تھا''۔ (۲۶)

پیسہ اخبار:

صحافت میں جدید رجحانات کا حامل ایک دوسرا اخبار ''پیسہ اخبار'' ۱۸۸۷ء میں فیروز والا پنجاب سے ہفت روزہ اخبار کی صورت میں جاری ہوا۔ اس کے مالک مدیر منشی محبوب عالم تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ لاہور منتقل ہو گیا اور انیسویں صدی ختم ہوتے ہوئے روزنامہ بن گیا۔ اس اخبار کو مثالی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کمزور اور کچلے ہوئے طبقات خصوصاً مسلمانوں کے حقوق کی آواز تھا۔ اس اخبار میں متانت اور سنجیدگی کا ایک پروقار رویہ ملتا ہے۔ اخلاق یا اصولوں سے گری ہوئی کوئی بات اسے گوارا نہ تھی۔ اس اخبار نے اردو صحافت کو عوام میں بے پناہ مقبولیت دی۔ اس کی زیادہ یادگار خدمت یہ ہے کہ اس نے مکتب صحافت کا کام انجام دیا اور اس میں کئی ایسے لوگوں نے

صحافتی تربیت حاصل کی جو بعد ازاں نامور صحافی اور ایڈیٹر بنے۔(۲۷)

بیسویں صدی میں اُردو صحافت کے خدوخال:

بیسویں صدی کے آتے آتے اُردو صحافت نے ترقی و بلوغت کے کئی مراحل طے کر لیے تھے۔نئی صدی کے آغاز میں میں صحافت اور ادب میں سرسید احمد خان کی عقلیت کے خلاف ردعمل پیدا ہوا۔ڈاکٹر مسکین علی مجازی کے مطابق:

> ''سرسید کی تحریک (بیسویں صدی میں) ٹیگور اور آسکر وائلڈ کے زیر اثر رومانوی بن گئی۔ چنانچہ "مخزن" کے بیشتر لکھنے والوں پر رومانیت غالب تھی۔ یہ تحریک ہلکے پھلکے انداز کی کارفرمائی اور زبان میں ادبی چاشنی سے عبارت ہے''۔(۲۸)

یوں بتدریج صحافت جو ادب کے دائرہ اثر سے باہر چلی گئی تھی پھر ادب کے سانچے میں ڈھل گئی۔صحافت پر اہل ادب کے اثرات کا سلسلہ شروع ہوا۔اکثر اخبارات مثلاً ''صدائے عام''،''ریاض الاخبار'' وغیرہ سے منسلک صحافی بنیادی طور پر شاعر و ادیب تھے اور وہ صحافت کو بھی ادب کے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ان کے اسلوب میں ندرت وجدت کے باجود صحافت کی سادگی اور متانت وسنجیدگی ملتی ہے۔مولانا ظفر علی خان،محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد،حسرت موہانی بیک وقت شاعر و ادیب بھی تھے۔مفکر و عالم بھی تھے۔اور اپنے عہد کے معتبر صحافی بھی تھے۔انھوں نے اپنے دست ہنر سے صحافتی اُسلوب کو ادبی اسلوب بنادیا صحافت کا زرین دور ہے صحافت کی قیادت ان باکمال ہستیوں کے ہاتھوں میں تھی۔جنھوں نے صحافت کا اعلیٰ وارفع معیار قائم کیا انھوں نے زندگی اور صحافت کے مقاصد کو ہم آہنگ کر کے اسے مشن کا تقدس عطا کیا۔انھوں نے وقتی اور ہنگامی موضوعات کو کچھ یوں کمال مہارت سے اپنے قلم کا موضوع بنایا کہ ان میں کافی خصوصیات پیدا ہوگئیں۔

اُردو صحافت میں ابوالکلام آزاد کا اجتہاد:

اُردو زبان وادب وصحافت میں بے مثل اُسلوب کے خالق ابوالکلام آزاد کا اندازِ صحافت سب سے منفرد ہے وہ صحافت میں ایک عظیم نظریے کے پرچار کرتے ہیں۔بقول رشید حسن خان:

''مولانا ابوالکلام آزاد کا انداز نظر صحافیانہ نہیں تھا ان کی شخصیت ان کی طبیعت ان کا جذبہ اور ان کا احساس یہ چیز ان کی تحریروں میں شامل ہے ۔ یہ ادب ہے''۔(۲۹)

اور بقول قطب اللہ، مولانا کی صحافت کے تین اہم اصول تھے:

۱۔ اخبارات سماج کے آئینہ دار ہوں۔

۲۔ اصلاح معاشرہ۔

۳۔ جدید ترین علوم وفنون کا فروغ ۔(۳۰)

انھوں نے اپنا عہد ساز ہفت روزہ ''الہلال'' ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے جاری کیا۔ قبل ازیں اُردو کے اس صاحب اُسلوب انشاء پرداز وخطیب نے نوجوانی کے دور ہی میں صحافت کا مشغلہ اختیار کیا۔ ۱۹۰۰ء میں وہ ''الصباح'' کلکتہ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پھر ''احسن الاخبار'' میں کچھ دن رہے۔ وہ اپنی صحافتی زندگی میں ''تحفہ محمدیہ'' ''خدنگ نظر'' ''لسان الصدق'' اور ''وکیل'' سے بھی وابستہ رہے۔ ''الہلال'' ان کا شاہکار اخبار ہے۔ ۱۶ صفحات کا یہ اخبار اُردو صحافت میں ایک نئے باب کی ابتداء تھا۔ اس میں مضامین، ملت اسلامیہ سے متعلق خطوط شذرات اور خبریں ایک نئے روپ میں چھپتی تھیں۔ یہ باتصویر جریدہ تھا اور خوبصورت ٹائپ میں چھپتا تھا۔ مولانا نے صحافت کو مقصدیت ونظریات کی روشنی میں استوار کیا۔ ''الہلال'' میں انھوں نے اعلان کیا۔

''ہم اخبار کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں''۔(۳۱)

ابوالکلام کے نزدیک صحافت قوم کی رہنمائی اور اصلاح کا اہم ذریعہ ہے۔ الہلال کی ایک اشاعت میں لکھتے ہیں:

''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیان ونقصان کے لیے آئے ہیں۔ صلہ وتحسین کے نہیں بلکہ نفرت ودشنام کے طلبگار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش اضطراب کے کانٹے ڈھونڈھتے ہیں۔ دنیا کے زروسیم کو قربان کرنے کے لیے بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے آتے ہیں۔ ہمارے عقیدے میں تو جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا

ہے وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کے لیے ایک دھبہ اور سرتا سر عار ہے''۔(۳۲)

''الہلال" آزاد کے ان نظریات کا ترجمان تھا جن کے تحت سیاست اور مذہب ایک سکے کے دو رُخ ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ ابوالکلام آزاد نے پہلی مرتبہ قارئین کو موضوعات کے تنوع سے آشنا کیا۔ چنانچہ "الہلال" میں سیاست، مذہب، معاشیات، نفسیات، جغرافیہ، تاریخ، عمرانیات، سوانح، ادب اور حالات حاضرہ پر اعلیٰ معیار کے مضامین اور فیچر چھاپے گئے۔ یوں اُنھوں نے اُردو صحافت میں امکانات کی نئی راہ دکھائی۔ اس عہد کے بڑے بڑے ادیبوں کی نگارشات "الہلال" کے صفحات کی زینت ہوتی تھیں۔ مثلاً شبلی نعمانی، حسرت موہانی، سید سلیمان ندوی، اور علامہ اقبال جیسے بڑے بڑے نام اس اخبار کا حصہ رہے۔

مولانا آزاد نے اُردو صحافت میں ایک ایسے خطیبانہ اسلوبِ نثر کو رواج دیا جو احتجاج و مزاحمت کے دور میں بہت موثر اور مفید رہا۔ محمد علی جوہر اور ظفر علی خان نے بھی یہی اُسلوب اختیار کیا تھا۔ لیکن یہ واضح ہے کہ جو تاثر درد خوبصورت آزاد کی نثر میں ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

اُردو صحافت کے فروغ میں مولانا ظفر علی خان کا حصہ:

مولانا ظفر علی خان کی صحافیانہ تربیت ان کے والد کے زیرِ سایہ ہوئی جو خود ایک بڑے صحافی گزرے ہیں۔ نومبر ۱۹۰۹ء میں انھوں نے اس دور کے اہم اخبار ''زمیندار'' کی ادارت سنبھالی۔ اس سے قبل انھیں صحافت میں معتبر مقام مل گیا تھا۔ حیدر آباد میں دکن ریویو کے مدیر کی حیثیت سے وہ ''معرکۂ مذہب سائنس'' اور'' مناظرہ لندن'' میں اپنے قلم کے جوہر دکھا چکے تھے۔ جنگ طرابلس کا آغاز ہوا تو زمیندار روزنامہ بن گیا۔ یہ اُردو کا پہلا اخبار تھا جس نے مشہور خبر رساں ایجنسی ''رائٹر'' سے خبریں حاصل کرنے کا اہتمام کیا۔ اس اخبار کی مجلسِ ادارت میں علامہ نیاز فتح پوری، عبداللہ عمازی، اور وحید الدین سلیم جیسے اکابر شامل تھے۔ مولانا ظفر علی کی ادارت میں ''زمیندار'' کو عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولانا اعلیٰ پائے کے صحافی کے ساتھ ساتھ شاعر، ادیب اور طنز نگار بھی تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے ''زمیندار'' کی تعریف میں ''کامریڈ'' اخبار میں لکھا:

> ''یہ پرچہ اس لیے عروج کو پہنچا کہ ایک ایسے شخص نے اس کی ادارت سنبھالی جو نہایت قابل ہے۔ علی گڑھ کا گریجویٹ ہے۔ ہندوستان کے ایک سے زیادہ

صوبوں میں نظم ونسق کا تجربہ رکھتا ہے۔ جدید تمدن اور سیاست سے آگاہ ہے۔
انگریزی کی اعلیٰ قابلیت کا حامل ہے۔ اُردو نثر میں درخشاں اُسلوب کا مالک ہے
اور شعروشاعری پر اسے کامل عبور ہے اب صورت یہ ہوگئی ہے کہ ''زمیندار'' کے
مقابلہ میں دوسرے اخبار پھیکے اور بے مزہ ہوتے ہیں''۔ (۳۳)

مولانا ایک شعلہ بیاں خطیب بھی تھے۔ جس کے اثرات ان کی تحریروں میں بھی جھلکتے ہیں۔ ناقدین کا یہ خیال ہے کہ مولانا ظفر علی کی خطابت ان کی اداریہ نگاری پر حاوی ہوگئی ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو اس کمی کو انھوں نے طنزومزاح اور شعروادب کے میدان میں پورا کیا۔ مولانا ایک جرأت مند صحافی تھے۔ انھوں نے انگریزی استعمار کی پروا کیے بغیر کلمہ حق کا پرچم بلند کیے رکھا۔ جس کی وجہ سے ان سے ضمانت طلب کی گئی۔ مولانا ظفر علی نے ''زمیندار'' کے دورعروج میں اسے عوام کے دلوں کی دھڑکنوں سے وابستہ کردیا تھا۔ اوران کی آواز بن گئی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد کی طرح انھوں نے بھی صحافت کو انقلاب کا ایک وسیلہ بنادیا تھا۔ (۳۴)

''زمیندار'' کے بعد ''ستارہ صبح'' بھی مولانا کی صحافتی تحریک کا اہم عنصر ہے تاہم حکومتی پابندیوں کی وجہ سے ''ستارہ صبح''، علم وادب کے مضامین کے لیے مختص تھا۔ اس اخبار نے اُردو صحافتی زبان کو نئے الفاظ وتراکیب سے آشنا کیا۔ بقول ڈاکٹر نظیر حسین زیدی:

''ستارہ صبح'' کی ایک بڑی خصوصیت صحافت ادب میں لفظ سازی ہے۔ اُنھوں
نے اپنے ادب میں نئے نئے الفاظ، نئی نئی ترکیبیں اور نئی اصطلاحیں اس کثرت
سے استعمال کیں کہ صحافتی ادب کی زبان ایک علمی زبان اور مستند زبان
ہوگئی۔ ان کے ہاں لفظ سازی کے دو اصول تھے۔

۱۔ ہندی الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ کا ملاپ

۲۔ فارسی الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ کا استعمال''۔ (۳۵)

مولانا ظفر علی نے صرف انگریزوں کے خلاف ہی صحافتی محاذ نہیں بنایا بلکہ وہ ہندو اخبارات جو مسلمانوں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کرتے تھے۔ ان کا توڑ بھی پیش کیا اور مسلمانوں کے حق میں رائے عامہ ہموار کی۔

"زمیندار" نے اُردو صحافت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مستقل روزانہ فکاہیہ کالم کا آغاز کیا۔ ''افکار وحوادث'' کے نام

سے مولانا عبدالمجید سالک یہ کالم لکھا کرتے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر کا ''ہمدرد'':

مولانا محمد علی جوہر نے ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو روزنامہ "ہمدرد" جاری کیا۔ مولانا جوہر کی کوشش تھی کہ صحافت کے ذریعے قوم کے اندر جذبۂ آزادی پیدا کیا جائے۔ وہ جنگ آزادی کے بہادر سپاہی تھے۔ اور کئی بار جیل کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے۔ جیل کے زمانے میں ہمدرد کی اشاعت تعطل کا شکار ہو جاتی۔ ''ہمدرد'' نے نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں بلکہ دنیا میں جہاں جہاں استعماری طاقتوں نے ملت اسلامیہ کی آزادی سلب کر رکھی تھی۔ اس کے خلاف آواز بلند کی۔ مولانا جوہر نے نسلی امتیاز کو رد کرتے ہوئے گاندھی جی کے ہاتھ مضبوط کیے ان کی تحریروں میں فکری گہرائی اور سیاسی شعور کی روشنی ملتی ہے۔ وہ اپنے شذرات اور تبصروں میں اُردو فارسی کے اشعار کا بھی برمحل استعمال کرتے تھے۔ ان کا انداز تحریر نہایت دل نشین سادہ اور عام فہم ہے۔ اس میں ایک داخلی لطافت اور فکری آہنگ ملتا ہے۔ گاندھی کے بارے میں اس اخبار کی یہ ولولہ انگیز تحریر ملاحظہ ہو:

> ''سرزمین ہند میں کون فرد ہے جو آج سپہ سالارِ حق وصداقت کے نامِ نامی سے واقف نہیں۔ ہر وہ فخرِ ہند نوجوان ہے جو مادرِ وطن کی عزت وجائز احترام برقرار رکھنے کی خاطر آج شہری یار جنوبی افریقہ کے جیل خانوں میں وہاں کی گوری آبادی کے ہاتھوں مظلومیت کی زندگی بسر کر رہا ہے''۔ (۳۶)

''ہمدرد'' نے صحافت میں حق گوئی کی روایت کو استحکام بخشا۔ مولانا جوہر صحافت میں ایک عظیم مقصد و نصب العین لے کر آئے تھے۔ اور یہ نصب العین تھا آزادی اور کامل آزادی، اس مقصد کے لیے ان کی تحریروں اور طرز صحافت میں ایک خاص نوع کا جوش وخروش ملتا ہے جس میں دلیل اور عقل بھی شامل تھی۔ ''ہمدرد'' مکمل طور پر ایک سیاسی اخبار نہ تھا۔ بلکہ اس میں سیاست کے علاوہ دیگر علوم وفنون پر بھی مضامین کالم اداریئے اور شاعری شائع ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد علی جوہر نے اس زمانے میں ''ہمدرد'' جاری کیا جب زمیندار کا طوطی برِعظیم کے طول وعرض میں بول رہا تھا۔ اس کے باوجود ''ہمدرد'' زمیندار سے مختلف تھا۔ اس نے سنجیدہ، متین اور مدلل صحافت کا راستہ اختیار کیا۔ صحتِ واقعات کی طرف خاص دھیان دیا۔ رائے عامہ کی عکاسی ہی نہیں رہنمائی بھی کی اور اس

میں کبھی اس بات کا خیال نہ کیا کہ کوئی خاص طرزِ عمل اختیار کرنے سے اشاعت گھٹے گی یا بڑھے گی۔ اگر برطانوی صحافت کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ جہاں زمیندار نے پاپولر جرنلزم (ہر دلعزیز صحافت) کو ترقی کی منازل سے آشنا کیا۔ وہاں ہمدرد نے کوالٹی جرنلزم (اعلیٰ پائے کی صحافت) کو رائج کیا اور کسی ملک کی صحافت کو ترقی دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں دونوں قسم کی صحافت موجود ہو۔ اس لیے دونوں نے مل کر اس دور کے قارئین کی ضروریات پوری کیں۔ (۳۷)

دیگر اخبارات پر ایک نظر:

صحافت کے اس دور میں بالترتیب قاضی عبدالغفار نے "جمہور" مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے ''سچ'' و ''صدق'' مولانا سید حبیب نے ''سیاست'' وحیدالدین سلیم ''مسلم گزٹ''، حامد انصاری ''مدینہ ملئ'' دیانرائن نگم کا ''زمانہ''، سیّد سلیمان ندوی ''معارف'' مولانا حسرت موہانی ''مستقل''، ملک نصراللہ عزیز کا ''مدینہ'' اور سیّد ابو الاعلیٰ مودودی نے ''الجمعیۃ'' شائع کیے۔

اُردو صحافت کا ایک اور اہم دور بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں شروع ہوتا ہے۔ اس عہد کا سب سے اہم اخبار ''انقلاب'' ہے۔ جو نامور اور تجربہ کار صحافیوں مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر کی اِدارت میں ۱۹۲۷ء میں منظر عام پر آیا۔

اس اخبار نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بے پناہ کام کیا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ نظریہ پاکستان کا اولین تصور علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد سے پہلے ''انقلاب'' نے پیش کیا۔ ۱۹۲۸ء میں اس نے ہندی مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے عنوان سے مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش کے مقالات کا ایک سلسلہ شائع کیا۔ عبدالسلام خورشید "انقلاب" کا جامع تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ [طویل اقتباس پر معذرت خواہ ہوں]

> ''فنِ صحافت کے مروّجہ اصول پر پرکھا جائے تو ''انقلاب'' اپنے ابتدائی چند سالوں میں برعظیم کا بہترین روزنامہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک کا ایک تو فنِ صحافت میں پوری دسترس حاصل تھی۔ دوسرے وہ محنت بھی بہت کرتے تھے۔ اوّل الذکر افتتاحیہ لکھتے تھے۔

موخرالذکر شذرات اور''افکار وحوارث'' قلم بند کرتے تھے۔ افتتاحیہ نگاری میں مہر کا اسلوب منفرد تھا۔ وہ نہ ہنگامہ خیزی کے قائل تھے نہ بے جا جوش وخروش پیدا کرنے کے متمنی تھے۔ ان کے سامنے چند اعلیٰ مقاصد تھے۔ جنہیں بہتر سے بہتر طریقے پر آگے بڑھانا مقصود تھا۔ مہر منطق اور دلیل کے قائل تھے اور کسی مؤقف کے حق میں دلائل و براہین کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر دیتے تھے کہ اس کا جواب دینا آسان نہیں ہوتا تھا۔ ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا جب کسی مسلئے پر لکھنا ہوتا تو اس کے تمام پہلوؤں پر پورے غور وفکر سے کام لیتے حقائق کی چھان پھٹک کرتے تمام معلومات حاصل کرتے اور اس کے بعد اس مسئلے کو اداریے میں پیش کرتے۔ چونکہ ان کی سیاست فہمی درجہ کمال پر پہنچی ہوتی تھی۔ اس یے وہ فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ مہر کا اسلوب تحریر سلیس اور رواں ہے۔''انقلاب'' کی دوسری بڑی خصوصیت اس کا مزاحیہ کالم''افکار وحوادث" تھا یہ کالم اخبار نویسی میں پہلا مستقل روزانہ مزاحیہ فیچر تھا۔ اور اس کے بعد سارے اخباروں نے مزاحیہ فیچر دینا شروع کر دیا''۔ (۳۸)

اس دور میں اُردو صحافت کی ترقی کی رفتار بڑھ گئی۔ اخبارات میں جدید رجحانات کے تحت سیاسی اور صحافتی شاعری چھپنے لگی۔ سیاسی زاویئے سے اس دور کے مسلم اخبارات نے مسلمانوں کے علیحدہ ملک کی تحریک میں کھل کر حصہ لیا اور ہندو اخبارات کی لعن طعن کا مقابلہ کیا۔ ''انقلاب'' کی اشاعت قیام پاکستان سے ذرا پہلے کم ہونے لگی۔ قیام پاکستان کے بعد اس اخبار نے ملکی سیاست کے منفی پہلوؤں پر کھل کر تنقید کی اور حزب اختلاف کی صورت اختیار کر لی۔ مطلق العنان حکومت نے اپنی مجرمانہ سرگرمیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے حق کی اس آواز کو ہمیشہ خاموش کرنے کے لیے طرح طرح کے مذموم ہتھکنڈے استعمال کیے اور بالآخر بائیس سال تک عظیم ملکی وقومی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۴۹ء میں یہ اخبار بند ہو گیا اور یوں ضمیر کی آواز خاموش ہو گئی۔ (۳۹)

''احسان'' بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کا ایک اہم اخبار ہے۔ اس کا اجراء ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ علامہ اقبال اس اخبار کے سرپرست تھے جبکہ ادارہ تحریر میں مولانا مرتضیٰ احمد خان میکیش، چراغ حسن حسرت اور مولانا انعام

اللہ خان جیسے ادیب اور کہنہ مشق صحافی شامل تھے۔

مولانا میکش ایک منفرد طرزِ تحریر کے حامل اداریہ نگار تھے۔ مولانا میکش پہلے زمیندار سے وابستہ تھے۔ پھر انقلاب میں آئے اور اس کے بعد احسان کی مجلس ادارت میں شامل ہوگئے ان میں سیاست فہمی کی خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔ لہٰذا جرأت و بے باکی کے ساتھ لکھتے۔ مولانا چراغ حسن حسرت شروع میں ''آفتاب'' کلکتہ میں ''کولمبس'' کے قلمی نام سے گئی دنیا کا کالم لکھتے تھے۔ ان ہی کا ایک اور کالم '' کلکتے کی باتیں چہ گرد'' کے نام سے چھپتا تھا۔ یہ فیچر نما کالم تھا۔ لاہور آنے کے بعد وہ زمیندار میں فکاہات کے نام سے کالم لکھنے لگے۔ ان کو اصل شہرت ''احسان'' میں چھپنے کے بعد ملی وہ ایک صاحبِ مطالعہ شاعر ادیب اور کالم نگار تھے۔ کلاسیکی ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کے مزاج میں بھی ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ فکاہیہ کالم نگاری کے علاوہ انھوں نے دسمبر ۱۹۳۶ء میں ''سند باد جہازی'' کے قلمی نام سے ''شیرازہ'' کے نام سے فکاہی پرچہ جاری کیا۔ یہ علم و ادب اور طنز و مزاح کا نمائندہ پرچہ تھا۔ اس ہفت روزہ فکاہی جریدے میں حفیظ ہوشیار پوری، محمود نظامی، خضر تمیمی، میراجی، عطاء اللہ سجاد، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، باری علیگ حاجی لق لق جیسے نامور اہل قلم کی تحریریں چھپتی تھیں۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید:

> ''حسرت کا سب سے بڑا کارنامہ ہفت روزہ ''شیرازہ'' کا اجراء تھا۔ یہ ایک علمی، ادبی اور مزاحیہ ہفت روزہ تھا۔ لیکن مزاحیہ عنصر غالب تھا۔ نہایت شگفتہ، نہایت پاکیزہ اور نہایت دلچسپ۔ پنچ اخبارات کے بعد یہ پہلا مزاحیہ ہفت روزہ تھا۔ لیکن اسے پنچ اخبارات سے کوئی مماثلت حاصل نہیں تھی۔ کیوں کہ پنچ اخباروں میں پھکڑ پن بھی بہت تھا اور شیرازہ پھکڑ پن سے بالکل خالی تھا۔ اس میں سالک کا بھی ایک مزاحیہ کالم چھپتا تھا ''افکار و حوادث''۔ (۴۰)

۱۹۳۸ء میں مولانا غلام مرتضیٰ میکش، چراغ حسن حسرت اور باری علیگ نے ''احسان'' سے علیحدہ ہو کر ''شہباز'' کا اجراء کیا لیکن یہ تجربہ بھی ناقص پالیسی اور مطلوبہ مالی وسائل نہ ہونے کی سے کامیاب نہ ہوسکا۔ اور مولانا میکش نے اسے یونسٹ پارٹی پر فروخت کردیا۔ پنجاب میں نعرۂ پاکستان کی بڑھتی مقبولیت کے توڑ کے لیے کانگرس کے کارکن لالہ نانگ چند ناز نے ''پربھارت'' کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار کا اجراء کیا جو بعد ازاں

روز نامہ کی صورت میں چھپنے لگا۔ سکھوں نے بھی اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اکالی دل کی ادارت میں ''اجیت'' کے نام سے ایک اخبار شروع کیا۔

آزادی کی مہم کو تیز کرنے کے لیے مختلف سیاسی جماعتوں کے ترجمان اخبار بھی اسی دور میں چھپنے لگے اتحاد پارٹی کا ہم خیال ''رہبر ہند''، مجلس احرار اسلام کا ''آزاد'' اس کی کڑیاں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں تین اہم نئے اخبار منظر عام پر آئے ان میں ''نوائے وقت'' ''انجام'' اور ''جنگ'' شامل ہیں۔ تاہم یہ تینوں اخبارات قیام پاکستان کے بعد مقبول ہوئے۔ لہٰذا ان کا ذکر قیام پاکستان کے بعد اُردو صحافت کے جائزے میں کیا جائے گا۔

فصل سوّم

پاکستان میں اُردو صحافت کا جائزہ

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر پاکستان کے نام سے ایک نئے ملک کا ظہور ہوا۔ یہ اُردو صحافت کے ایک عظیم الشان اور ترقی یافتہ دور کا آغاز بھی ہے۔ پاکستان کی تحریک میں اُردو مسلم اخبارات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مسلمانوں میں سیاسی فکر وشعور کی روشنی عام کی اور ہندو اخبارات کے پروپیگنڈے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

قیام پاکستان کے بعد نئے ملک سے چھپنے والے وہ اخبارات جن کے مالک ہندو یا سکھ تھے یا تو بند ہو گئے یا پھر بھارت منتقل ہو گئے۔ چنانچہ ملاپ ''پرتاپ''، ''بندے ماترم'' وغیرہ دہلی، جالندھر اور حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ اسی طرح مسلمان اخبارات جو دہلی سے چھپتے تھے پاکستان آ گئے۔ تاہم "نوائے وقت" آزادی سے پہلے لاہور ہی سے چھپتا رہا ہے۔ مسلم لیگ کے ترجمان کی حیثیت سے اس اخبار نے نظریہ پاکستان کے فروغ کے لیے بے مثال کردار ادا کیا۔ عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

> ''نوائے وقت'' آغاز میں پندرہ روزہ جریدہ کی شکل میں چھپتا تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اس کا پہلا پرچہ نکلا اور ۲۲ جولائی ۱۹۴۴ء میں یہ مکمل روزنامہ بن کر شائع ہونے لگا۔ (۴۱)

تحریک پاکستان کے نامور کارکن حمید نظامی اس کے مدیر تھے۔

مسلم لیگ کو مسلم اکثریتی علاقوں خصوصاً پنجاب میں مقبول بنانے میں نوائے وقت کی کوششیں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں ''نوائے وقت'' نے کھل کر مسلم لیگ کی حمایت کی۔ جب پبلک سیفٹی ایکٹ کے خلاف لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کیا تو نوائے وقت نے عوام کو ہم نوا بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اپنے اسی مجاہدانہ کردار کی وجہ سے یہ اخبار عوام میں بے پناہ مقبول ہوا۔ اس وقت یہ اخبار لاہور کے علاوہ راولپنڈی، ملتان، اور کراچی سے شائع ہوتا ہے۔

ادبی کالم نگاری کے فروغ میں ''نوائے وقت'' کا حصہ بھی نمایاں ہے۔ اس روزنامے کے آغاز ہی سے ''سرِ راہے'' کے عنوان سے مستقل مزاحیہ کالم چھپتا ہے۔ اسے اوّل اوّل حمید نظامی نے شروع کیا۔ ان کی وفات

کے بعد یہ کالم کچھ عرصہ مجید نظامی نے لکھا۔ پھر طویل عرصہ تک وقار انبالوی لکھتے رہے۔ ان کے بعد پروفیسر محمد سلیم نے اسے جاری رکھا اور آج کل پروفیسر اسرار بخاری اسے لکھ رہے ہیں۔

''روزن دیوار سے'' کے عنوان سے عطاء الحق قاسمی کا کالم بھی طویل عرصے تک ''نوائے وقت'' میں چھپتا رہا ہے۔ (آج کل انھوں نے روزنامہ ''جنگ'' سے وابستگی اختیار کر رکھی ہے) پاکستان کے مقبول ترین اخباروں میں روزنامہ جنگ کا نام سرفہرست ہے۔ اس کا آغاز دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے برس یعنی ۱۹۳۹ء میں ہوا۔ (۴۲) یہ خالصتاً تجارتی بنیادوں پر شائع ہوتا تھا۔ اسے کاروباری مقصد کی وجہ سے یہ موقع محل کے مطابق اپنی پالیسی تبدیل کر لیتا تھا۔ اس وقت اس کے مدیر غلام نبی پردیسی اور انتظامیہ میں دادا عشرت اور میر خلیل الرحمٰن تھے اور یہ شام کا اخبار تھا۔ پاکستان بننے کے بعد یہ کراچی منتقل ہو گیا۔ اور یہاں سے اس کی اشاعت کا سلسلہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو شروع ہوا۔ ۱۰ فروری ۱۹۴۸ء کو یہ شام کی بجائے صبح کو چھپنے لگا۔ اس زمانے میں اس کے مدیر سید محمد تقی تھے۔

کراچی میں قدم جمانے کے بعد ''جنگ'' ۱۳ نومبر ۱۹۵۹ء کو راولپنڈی سے چھپنے لگا۔ مشہور مزاح نگار، شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار شوکت تھانوی اس کے پہلے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو لندن سے بھی ''جنگ'' کی روزانہ اشاعت شروع ہوئی۔ یوں جنگ کو پہلا کامیاب اُردو روزنامہ بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ یکم مارچ ۱۹۷۲ء کو کوئٹہ سے ''جنگ'' کا آغاز ہوا۔ اور پھر یکم اکتوبر ۱۹۸۱ء کو روزنامہ ''جنگ'' لاہور کا اِجراء ہوا۔ روزنامہ ''جنگ'' کی کامیابی میں اس کے بانی میر خلیل الرحمٰن کی انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے بیشتر ادیب، شاعر اور صحافی کی وابستگی بھی شامل ہے۔

قیام پاکستان کے بعد "انجام" بھی دہلی سے کراچی منتقل ہو گیا تھا۔ یہ اپنے وقت کا کامیاب ترین اخبار تھا۔ پاکستان منتقلی کے باوجود اس کی مقبولیت میں کمی نہ آسکی۔ تاہم ناقص انتظامی امور اور مالکان کی غفلت کی وجہ سے یہ اخبار اپنی مقبولیت برقرار نہ رکھ سکا۔ اور بالآخر ۱۵ فروری ۱۹۶۷ء کو بند ہو گیا۔

روزنامہ ''امروز'' بھی اُردو صحافت کا ایک معتبر اخبار رہا ہے۔ یہ اخبار پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے زیر اہتمام ۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو چھپنا شروع ہوا۔ یہ ترقی پسند رجحانات اور بائیں بازو کی سیاست کا ترجمان تھا۔ معروف سیاست

دان افتخارالدین اس کے چیئرمین تھے۔''امروز'' کے پہلے پرچے میں اخبار کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

''ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قارئین اپنے دیس اور باقی دنیا کے حالات کا صحیح اور بے لاگ اندازہ کرسکیں۔اسی لیے کسی خاص عقیدت یا نقطہ نظر کو ان پر ٹھونسنے کے لیے خبروں میں ملمع اور رنگ سازی سے احتراز کیا جائے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں دنیا کی کوئی قوم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چن کر بسر اوقات نہیں کرسکتی۔اس لیے پاکستان کے عوام کو اپنے مسائل اور سیاسی مارک سے منطبق کرنا ہوگا۔اس کے لیے دنیا کے بدلتے ہوئے سیاسی نقشہ پر ان کی نظر جمی رہنی چاہیے''۔(۴۳)

پرگریسو پیپر پر حکومت کے قبضے کے بعد یہ اخبار کہنہ مشق صحافیوں سے محروم ہوتا گیا۔اور رفتہ رفتہ یہ عوام میں اپنی مقبولیت کھو بیٹھا اور بالآخر ۲۶ نومبر ۱۹۹۱ء کو بند ہو گیا۔

پاکستان بننے کے بعد ۱۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو لاہور سے وقار انبالوی کی ادارت میں روزنامہ ''سفینہ'' کا آغاز ہوا''(۴۴)۔وقار انبالوی اس سے پہلے روزنامہ ''احسان'' سے وابستہ تھے۔وہ ایک تجربہ کار صحافی اور کہنہ مشق کالم نویس تھے۔لیکن تمام تر مہارت و تجربے کے باوجود یہ اخبار اپنے قدم جمانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

اس دور کے دیگر اہم اخبارات میں لاہور سے شائع ہونے والا اخبار روزنامہ ''آفاق'' بھی شامل ہے اس کے مدیر محمد سرور تھے اور انھیں صحافیوں کی ایک تجربہ کار ٹیم کا تعاون بھی حاصل رہا۔اس اخبار کو آگے بڑھنے کا موقع تب ملا جب دولتانہ وزارت سے برسر پیکار ''نوائے وقت'' سے ضمانت طلب ہوئی۔اور بعد ازاں اس کی ڈیکلریشن منسوخ کردی گئی۔تاہم جب ''نوائے وقت'' کا ڈیکلیریشن بحال کر دیا گیا۔اور دوبارہ اشاعت کے بعد اس نے اپنا کھویا ہوا مقام اور مقبولیت دوبارہ پائی تو لامحالہ طور پر اس کا اثر ''آفاق'' پر بھی پڑا اور ہوتے ہوتے یہ اشاعت کے محدود دائرے میں قید ہو گیا۔

یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو لاہور سے ہفت روزہ ''چٹان'' کا آغاز ہوتا ہے۔تحریک آزادی کے مجاہد بے لوث سیاسی کارکن کہنہ مشق صحافی، شاعر و ادیب آغا شورش کاشمیری اس کے مالک اور مدیر تھے۔آغا صاحب ایک حق گو

اور نڈر صحافی تھے اور انگریز استعمار کے دور میں بھی مجلسِ اِحرار کے پلیٹ فارم سے وہ انگریزوں اور حکومت کو للکارتے رہے۔ نتیجہ معلوم کہ انھیں کئی بار جیل کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی ان کی جابر حکمرانوں سے نہ بن سکی۔

اس دور میں ان قابل ذکر اخبارات کے علاوہ کچھ نئے اخبارات بھی شائع ہوئے جو جلد ہی گمنامی کے اندھیرے میں ڈوب گئے۔ ان قابل ذکر اخبارات میں ''کوہستان'' بھی شامل ہے یہ اخبار ۱۴ اگست ۱۹۵۳ء کو راولپنڈی میں چھپنے لگا اور یہ اپنے دور کا مقبول اخبار تھا۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۶۲ء کو کراچی سے روزنامہ ''حریت'' جاری ہوا اس کے بانی فخر ماتری تھے۔ جو اس سے پہلے روزنامہ ''ملت'' (گجراتی زبان میں) اور شام کا اخبار روزنامہ ''لیڈر'' (انگریزی) شائع کر رہے تھے۔ فخر ماتری کی تجربہ کاری نے ''حریت'' کو ''جنگ'' اور ''انجام'' دونوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ لیکن مالکان کی عدم توجہی اور ناقص حکمت عملی کے باعث اس کی مقبولیت کا گراف بتدریج گرنے لگا اور بالآخر ۱۹۷۳ء میں اس کی آواز گنامی کی قید میں چلی گئی۔ ''حریت'' کا انداز ہم عصر اخبارات سے جدا اور منفرد رنگ کا تھا۔ اس کے اداریئے اتنے عام فہم اور رواں دواں تحریر میں ہوتے کہ کم پڑھے لکھے قارئین بھی اسے سمجھ لیتے۔ پاکستان میں اُردو صحافت کے رجحان ساز صحافی عنایت اللہ نے ''کوہستان'' چھوڑنے کے بعد لاہور سے روزنامہ ''مشرق'' جاری کیا۔ اس کا پہلا پرچہ ۱۶ ستمبر ۱۹۶۳ء کو منظر عام پر آیا۔ ماہرین صحافت اسے اُردو کا پہلا مکمل اخبار قرار دیتے ہیں۔ گٹ اپ اور میک اپ کے لحاظ سے "مشرق" ایک نیا اخبار ثابت ہوا۔ اس میں مقامی، صوبائی، ملکی، اور اہم بین الاقوامی خبریں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں۔ اسی طرح طلباء، کسان، مزدور، تاجر، اور دین لگاؤ رکھنے والوں کے لیے اس میں الگ الگ کالم چھپتے تھے۔

اس اخبار نے پہلی بار روزانہ کے پرچے میں عورتیں اور بچوں کے لیے خصوصی گوشے مختص کیے مختصر یہ کہ ''مشرق'' نے اخبارات کو جدت طرازی کی ایسی راہ دکھائی جسے اپنانے پر اخبارات میں اپنی کامیابی نظر آئی۔

سقوطِ ڈھاکہ، پاک انڈیا جنگ، عام انتخابات کی ہنگامہ خیزیوں کی وجہ سے ۱۹۷۰ء کی دہائی پاکستان میں سیاسی حوالے سے بڑی ہنگامہ خیز رہی ہے۔ اسی کی دہائی میں سیاسی جماعتوں نے اپنے ترجمان اخبارات کی اشاعت شروع کی تاکہ عوامی رائے اپنے حق میں ہموار کی جاسکے۔ ملک کی سب سے بڑی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی

نے اپنی پالیسیوں کو عوام تک پہنچانے کے لیے روز نامہ ''مساوات'' لاہور کا اجراء کیا۔ اس کا حلقۂ اثر پارٹی رہنماؤں اور کارکنوں تک محدود رہا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو فوجی امر جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں منتخب جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد ''مساوات'' کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ جسے دبانے کے لیے آمریت کے مذموم ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔ بھٹو مرحوم کو پھانسی پر لٹکانے کے بعد جب پیپلز پارٹی مصائب کا شکار ہوئی تو فوجی امریت نے کھل کر ''مساوات'' کے خلاف سازشیں کیں اور بالآخر جمہوریت کی آواز دب گئی۔ جماعت اسلامی نے بھی اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ۱۹۷۰ء کو ملتان اور کراچی سے روزنامہ "جسارت" جاری کیا۔ لیکن جماعتی مقاصد، فرقہ وارنہ منفی طرزِ صحافت کی وجہ سے ''جسارت'' بھی عوامی اخبار نہیں بنا۔

۲۵ دسمبر ۱۹۹۰ء کو لاہور سے روزنامہ ''پاکستان'' کا اجراء ہوا۔ اس کے ایڈیٹر ضیاء شاہد اور مالک اکبر علی بھٹی تھے۔ اس اخبار کو ابتدا ہی سے عوامی مقبولیت حاصل ہوگئی۔ تاہم ضیاء شاہد کی اخبار سے علیحدگی اور بعد ازاں ''خبریں'' کی اشاعت کے بعد اس کی اشاعت میں نمایاں کمی آئی۔ آج کل اس اخبار کے ایڈیٹر مجیب لرحمٰن شامی ہیں۔ ''روزنامہ خبریں'' کا پہلا شمارہ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۲ء منصۂ شہود پر آیا۔

روزنامہ ''خبریں'' لاہور پہلا شمارہ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۲ء منظر عام پر آیا اور اس کے چیف ایڈیٹر ضیاء شاہد ہیں، جو اس سے پہلے ''جنگ'' ''نوائے وقت'' ''اردو ڈائجسٹ'' اور روزنامہ ''پاکستان'' میں اپنے جوہر دکھا چکے ہیں۔ وہ ایک کامیاب اور جہاں دیدہ صحافی ہیں۔ اس لیے اپنے سنسنی خیز خبروں، کالموں کی وجہ سے اسے عوام میں کافی مقبولیت ملی۔

کراچی سے روزنامہ ''اُمت'' کی آمد بھی ایک کامیاب کوشش ہے۔ جو اندرون سندھ میں کافی مقبول ہے۔ معروف کالم نگاروں منو بھائی اور حسن نثار نے ۱۱ جون ۱۹۹۵ء کو لاہور سے روزنامہ ''صداقت'' جاری کیا لیکن بھرپور مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ سلسلہ پائیدار ثابت نہ ہوسکا۔

روزنامہ ''صداقت'' لاہور پہلی اشاعت ۱۱ جون ۱۹۹۵ء ایک اور کوشش بزرگ صحافی مصطفیٰ صادق اور الطاف حسین قریشی نے بھی نئے گٹ اپ کے ساتھ ۳ جون ۱۹۹۶ء کو روزنامہ ''وفاق'' کا اجراء کیا۔ لیکن توقعات کے برعکس اس کی اشاعت ایک محدود دائرے سے باہر نہ نکل سکی۔

ان روزناموں کے علاوہ پاکستان کے چاروں صوبوں سے وقتاً فوقتاً روزنامے ہفتہ روزہ روزہ اور ماہانہ نکلتے رہے ہیں۔لیکن ان میں اکثریت ایک خاص دائرے تک ہی محدود رہتے ہیں۔ان میں روزنامہ ''دن''لاہور، روزنامہ ''آج''پشاور، روزنامہ ''میدان''پشاور،روزنامہ ''مشرق'' پشاور شامل ہیں۔حالیہ چند برسوں میں روزنامہ ''جناح''اسلام آباد اور لاہور سے شائع ہونے لگا ہے۔اور قومی سطح پر اپنا مقام بنانے میں مصروف ہے۔

پاکستانی صحافت کا تا حال آخری کامیاب ترین اخبار روزنامہ ''ایکسپریس'' ہے۔(جو پاکستان کے گیارہ بڑے شہروں سے شائع ہونے والا واحد کثیرالاشاعت روزنامہ ہے) دیکھتے ہیں کہ مقابلے کی اس دوڑ میں کون سے اخبارات اپنا مقام بناتے ہیں۔گزشتہ دو دہائیوں سے میڈیا میں ایک نئے انقلاب کی بنیاد بھی پڑ چکی ہے اب کئی بڑے بڑے اخباری ادارے اپنے نیوز چینل بھی شروع کر چکے ہیں۔جن میں ''جنگ'' کا ''جیو''، ''نوائے وقت'' کا چینل ''وقت'' ایکسپریس" کا ''ایکسپریس نیوز''اور ''خبریں'' گروپ کا چینل ''۵''شامل ہے۔ مجموعی طور پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ پاکستانی صحافت اب عالمی سطح کی صحافت سے ہم آہنگ ہو چکی ہے اور جدید رجحانات اور تقاضوں کی تکمیل کے لیے تیار ہے۔

فصل چہارم

کالم بنیادی مباحث

کالم نگاری عصری صحافت کا طرۂ امتیاز ہے۔یہی وجہ ہے کہ کالم کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ملکی سطح پر کالم نگار معتبر اور منفرد شناخت کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔دنیا بھر کے اخبارات ورسائل میں کالم کے لیے خصوصی گوشے مختص کیے جاتے ہیں اب کالم اخبار کی بنیادی ضرورت بن چکا ہے۔عوام میں بھی کالم نگار کو انتہائی قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔حکومتی ایوانوں میں کالم نگار کی رائے کو وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔اور اہم ملکی اُمور میں پالیسی ساز ادارے کالم نگار کی آراء،مشوروں،تجاویز اور تبصروں کو اہمیت دیتے ہیں۔ حقیقی معنوں میں کالم نگاری نے ایک ایسے ادارے کی شکل اختیار کی ہے جو عوام کی سوچ،فکر اور رائے پر اثر انداز ہوتی ہے۔کالم کی اسی اہمیت وضرورت کے پیش نظر اخبارات کی انتظامیہ مقبول کالم نگاروں کو بھاری معاوضے کی ادائیگی کرتی ہے۔انھیں ادراک ہوتا ہے کہ عوام کی ایک بڑی تعداد اہل فکر ونظر صرف اپنے پسندیدہ کالم نگار کی تحریر پڑھنے روزانہ اخبار خریدتی ہے۔الیکٹرانک میڈیا اور نت نئے ٹی وی چینلز کے آنے سے اب عوام کو بھی کسی حادثے یا واقعے کی اطلاع چند ہی گھنٹوں بسا اوقات منٹوں میں مل جاتی ہے۔ترقی کی اس دوڑ نے اخباری خبروں کی اہمیت کم کردی ہے۔تاہم کالم اخبارات کا وہ سدا بہار شعبہ ہے کہ جس کے قارئین کو اس شعبے سے خاص تعلق ودلچسپی ہوتی ہے۔اس کا بین ثبوت یہ بھی ہے کہ اب باقاعدہ معروف کالم نگاروں کے کالموں کے مجموعے بھی شائع ہوتے ہیں۔ اور اہل ذوق کی بڑی تعداد ان مجموعوں کو وقعت نظر سے پڑھتی ہے۔

کالم کیا ہے؟

کالم عصر حاضر میں صحافت کی ایک مقبول ترین اصطلاح اور صنف کا نام ہے۔جدید سماجی تصورات کے

حوالے سے کالم کو اب صحافت کی روح کہا جا سکتا ہے۔اس کے ذریعے قارئین حالات حاضرہ کے پس منظر اور پیش منظر کی تجزیاتی تفہیم کر سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کی اکثر زبانوں میں چھپنے والے اخبارات خاص اہتمام سے کالم چھاپتے ہیں۔اور باقاعدہ کالم نگاروں کو معاوضے بھی ادا کرتے ہیں۔فی زمانہ کالم نگاری ایک کل وقتی عمل ہے۔صرف اُردو صحافت کی مثال سامنے رکھیں تو اس کی ضرورت اور اہمیت کا ادراک ہوتا ہے۔

کالم ایک وسیع المعانی لفظ ہے۔اُردو نے کالم کی اصطلاح کو جوں کا توں انگریزی سے مستعار لیا ہے۔اور تقریباً انگریزی ہی کے مفہوم پر اُردو میں بھی کالم کے یہی معنی نکلتے ہیں۔کالم کے لغوی اور اصطلاحی معنی الگ الگ ہیں۔ذیل میں اس اصطلاح کے لغوی اور اصطلاحی معنی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔تاکہ اس لفظ کی درست اور مکمل معنویت سامنے آسکے۔

کالم کے لغوی معنی:

کالم کے لغوی معنی مشہور انگریزی لغت Oxford Dictionary of English کے مطابق یہ ہے۔

Coulumn: Verlical support of a building X V (Lydg)

verlical division of a page ect. (۴۵)

''قاموس الاصلاحات'' میں کالم کے معنی ستون، عمود کے ہیں۔ (۴۶)

علمی اُردو لغت (مؤلف: وارث سرہندی) میں کالم سے مُراد صفحے کا حصہ، خصوصاً اخبار کا خانہ۔فوج کا دستہ ہے۔(۴۷)

فاؤنز انگلش اُردو ڈکشنری میں کالم کے درج ذیل معنی ہے۔

(۱) کھم، کھم، کھمبا، ستون۔ (Piller) (۲) گول ستون، لاٹھ مینار، ریڑھ، (Upright Cylinderical Body) (۴۸)

کتابستان ڈکشنری کے مطابق کالم کے معنی یہ ہیں۔ستون کی سی کوئی شے۔اُٹھتا ہو دھواں۔فوج کا دستہ، جمع کرنے

کے لیے ایک دوسرے کے اُوپر رکھی ہوئی رقمیں۔ وطن کے چھپے ہوئے دشمن، پانچواں دستہ، ملک کا دشمن، خانہ، اخبار کا مستقل موضوع یا عنوان والا کالم، اخبار کا مستقل کالم، خصوصی تبصرہ نگار، نامہ خصوصی۔(۴۹)

''نوراللغات''(جلد چہارم) میں کالم کی وضاحت درج ہے۔'' کالم: الگ صفحے کا حصہ، جیسے نوراللغات کے ہر حصے میں دو کالم ہیں۔فوج کا دستہ۔(۵۰)

اُردو کی مشہور لغت فیروزاللغات کے مطابق کالم سے مُراد ہے۔'' کالم: صفحے کا حصہ (خصوصاً اخبار کا۔خانہ،فوج کا ایک دستہ۔ (۵۱)

آکسفورڈ گائیڈ ٹو انگلش لینگویج میں کالم کی تعریف ان لفظوں میں کی گئی ہے۔

"Column: Round piller thing shaped like, this vertical division of page, Printed matter is this long narrow formation of troops verticals etc". (۵۲)

کالم کے اصطلاحی معنی:

انسائیکلوپیڈیا برٹینکا، میں کالم اور کالم نگار کے درج ذیل معنی دیے گئے ہیں۔

Columist: The author or editor of a regular signed contribution to a newspaper. Usually under a permanent, title and devoled to comment on some aspect of the contemporary scene. The column may be humorous or serious on one subject of on life in general. Frivolous in tone or heavily freighted

with good advice on manners, Morals or other subjects of interest essentially a column is a Reflection of the writers's individual tastes and point of view. Wheather it is concerned with women's hats foreign policy or the stock market. (۵۳)

بطور اصطلاح کالم کی یہی تعریف قریب قریب اُردو میں بھی مروّج ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی رائے میں:

''ہر اخبار میں کچھ مستقل عنوان ہوتے ہیں۔بعض کے تحت خبریں، اعلانات یا معلومات پیش کی جاتی ہیں۔اور بعض کے نزدیک مزاحیہ، دینی، طبی، سائنسی اور پس منظری مواد دیا جاتا ہے۔موخرالذکر عنوانات کو صحافتی اصطلاح میں کالم یا خصوصی کالم کہتے ہیں اور لکھنے کے لیے کالم نویس یا کالم نگار کی اصطلاح رائج ہے۔کالم نویس چاہے تو اپنا اصلی نام دے دے چاہے تو قلمی نام اختیار کرے''۔(۵۴)

معروف ماہر ابلاغیات ڈاکٹر مسکین علی حجازی کے خیال میں:

''کسی مستقل عنوان کے تحت اخبار یا رسالے میں باقاعدہ تحریر کو کالم کہتے ہیں''۔(۵۵)

سروے آف جرنلزم" میں کالم اور کالم نگار کی تعریف درج ذیل لفظوں میں کی گئی ہے۔

Although the words "Column" and columnist Can be Interpreted Variously, three types are generally recognized they are:

(1) the personal editiorial are essay column:

(2) The sound about town or gossip department and

(3) the humor column or olyum" (۵۶)

اُردو صحافت میں کالم کے اصطلاحی مفہوم کو جدید تصورات کے تناظر میں سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ اردو صحافت کے ماہرین کی آراء کو وقعت نظر سے دیکھا جائے خالد محمود علی اپنی کتاب "اردو صحافت تاریخ وفن" میں رقم طراز ہیں:

''جب صحافتی زبان میں کالم کا نام لیا جائے تو کالم صحافت کی ایک خاص صنف سمجھی جاتی ہے۔ جس طرح اخبار میں خبر، اداریہ، فیچر، کارٹون صحافت کی اصناف ہیں۔ اسی طرح کالم بھی صحافت کی اہم صنف ہے۔ اس کے تحریر کرنے والے کو کالم نویس کہتے ہیں''۔(۵۷)

پروفیسر وارث میر کے نزدیک:

''زندگی کے کسی شعبے میں ہونے والے کسی عمل کے متعلق قلم کار کا ہلکے پھلکے انداز میں ایسا نامکمل اظہار خیال کالم کہلاتا ہے۔ جو لکھنے والے کی اپنی "اپروچ" اور اپنے اسلوب کا مظہر ہو''۔(۵۸)

اس باب میں معروف شاعر وادیب اور صاحب اسلوب کالم نگار ابن انشاء کہتے ہیں:

''میں کالم کو Essay سمجھتا ہوں جس طرح Essay ایک بے کراں چیز ہے کالم بھی ہے''۔(۵۹)

سینئر صحافی زیڈ۔ اے۔ سلہری کی رائے میں:

''کالم ایک ایسی تحریر ہے جیسے ہر سوچنے والا شخص جس کے ذہن میں کچھ نا کچھ ہے لکھ سکتا ہے''۔(۶۰)

میاں محمد شفیع اس ضمن میں یہ رائے دیتے ہیں:

"کالم کئی اقسام کے ہوتے ہیں۔مختلف کالم نویس مختلف شعبوں میں تخصیص حاصل کرتے ہیں۔اور کالم میں اپنے خصوصی تجربے اور علم کی بنا پر لکھتے ہیں''۔ (۶۱)

کالم کے بارے میں اہل ادب و اہل صحافت کی آراء:

اس حوالے سے ممتاز ترقی پسند شاعر و ادیب اور کالم نگار احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں:

''کالم کی کوئی متعین صورت نہیں ہے۔ ویسے میجر سعید ٹوانہ اور منو بھائی جو تحریریں لکھتے ہیں۔ دونوں کالم کہلاتی ہیں۔لیکن دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔اس طرح م۔ش کی تحریروں اور میری تحریروں میں نمایاں فرق ہے۔لیکن دونوں کو اخباری اصطلاح میں کالم کہا جاتا ہے''۔ (۶۲)

طنز و مزاح کے مقبول شاعر اور کالم نگار سید ضمیر جعفری کے مطابق:

''کالم کیا ہے؟ بھئی ہم تو فوجی آدمی ہیں اس لیے فوج کی اصطلاح میں کالم فوجی پلٹن کو کہتے ہیں۔لیکن صحافت کی زبان میں کالم سے مراد مخصوص مقاصد رکھنے والی تحریریں ہیں۔ جو مستقل عنوانات کے تحت چھپتی ہیں۔لیکن کالم اور روزنامچہ یا ڈائری میں فرق ضروری ہے۔اسی طرح شہر نامہ اور کالم میں بھی فرق ہے انتظار حسین کے کالم شہر نامہ ہوتے ہیں۔اور عطا الحق قاسمی کے کالم فکاہیہ نوعیت کے ہوتے ہیں''۔ (۶۳)

معروف مزاح نگار اور منفرد شناخت کے حامل کالم نگار ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی رائے میں:

''جو کچھ کالم نویس لکھتے ہیں۔ وہی کالم ہے ہر کالم نویس اپنا مخصوص مزاج رکھتا ہے۔ اس لیے کالم کے لیے کسی خاص قسم کی پابندی لگانا مشکل ہے''۔ (۶۴)

ڈاکٹر یونس بٹ کی اس رائے میں ابہام پایا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر کالم نگار مخصوص مزاج اور انداز تحریر رکھتا ہے۔ لیکن اخبار یا ادارتی صفحے پر چھپنے والی ہر تحریر کو کالم نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کالم کے اپنے مخصوص فنی تقاضے ہوتے ہیں۔ اور اس معیار اور پیمانے کے مطابق ہی کسی تحریر میں کالم کے نقوش ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ یوں اگر ہم ہر تحریر کو کالم قرار دیں تو پھر کالم اور مضمون میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟

اس سلسلے میں عابد مسعود تہامی کی یہ رائے ملاحظہ کیجیے:

''اخبار یا رسالے میں کسی مشکل عنوان کے تحت باقاعدہ وقفوں کے ساتھ لکھی گئی تحریر کو کالم کہیں گے۔ یہ تحریر عام اور خاص موضوع پر لکھی جا سکتی ہے''۔ (۶۵)

کالم کے اقسام:

ذرائع ابلاغ کی ترقی اور زندگی کے پھیلاؤ سے کالم ارتقائی مراحل اور شکل وصورت نے بھی اچھی خاصی ترقی کر لی ہے۔ موجودہ دور کو صحافت کا دور کہا جاتا ہے۔ اس رجحان نے کالم کو بھی متاثر کیا ہے۔ اور اب کالم کئی اقسام میں لکھے جاتے ہیں۔ اور ہر قسم کے کالم کو پسند کرنے والے قارئین بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔

کالم کی ہر قسم اپنے جداگانہ نفیسِ مضمون اور موضوع کی وجہ سے علیحدہ شناخت کا متقاضی ہے صحافت کے ماہرین نے کالم کو درج ذیل اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

☆ سیاسی کالم ☆ طبی کالم ☆ دینی یا مذہبی کالم

☆ معاشرتی یا سماجی کالم ☆ ثقافتی کالم ☆ خواتین کے کالم

☆ تعلیمی کالم ☆ فکاہیہ کالم ☆ ادبی کالم

☆ مکتوباتی کالم ☆ ترکیبی کالم ☆ اقتباس کالم

یہ امر ضروری ہے کہ ہر کالم کا مختصراً مگر جامع انداز میں ایک تعارف پیش کیا جائے تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ کالم کی صنف میں کتنی گہرائی موجود ہے۔ اسی تجزیے سے مستقبل میں کالم کے پھیلاؤ اور اہمیت کے نئے نئے امکانات بھی دریافت ہوسکیں گے۔

سیاسی کالم:

سیاسی کالم میں ملکی اور بین الاقوامی سیاسی صورت حال کا تجزیہ، طرز سیاست خارجہ پالیسیوں، حکومت کے اقدامات انتخابات کے لیے سیاسی جماعتوں کی حکمت عملی، حزب اختلاف کے انداز سیاست اور سیاسی رہنماؤں کے بارے میں اظہار خیال ہوتا ہے۔ ارشاد احمد حقانی کا ''حرف تمنا'' نذیر ناجی کا ''سویرے سویرے'' منو بھائی کا ''گریبان'' حامد میر کا ''قلم کمان'' ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کا ''دل پشوری'' اور سلیم صافی کا ''جرگہ'' وہ نمایاں کالم ہیں۔ جو سیاسی کالم کے دائرے میں آتے ہیں۔

سیاسی کالم کی خصوصیات میں یہ بھی شامل ہے کہ یہ حکومت وقت یا دیگر کسی سیاسی جماعت یا شخصیات کی غلط روشوں پر تنقید کرے اور پالیسی ساز اداروں کو مفید مشورے دے۔

طبی کالم:

موجودہ زمانے میں اخباری دنیا سیاسی وحادثاتی خبروں اور کالموں تک محدود نہیں رہی بلکہ اخبارات اپنے پڑھنے والوں کو صحت وعلاج معالجے کے ضمن میں طبی معلومات کی فراہمی کے ضمن میں خاص اہتمام سے طبی کالم شائع کرتے ہیں۔ یہ کالم مستند اور اعلیٰ تربیت یافتہ تجربہ کار ڈاکٹر اطباء اور ہومیو پیتھک معالجین لکھتے ہیں۔ ان

کالموں میں قارئین کی طرف سے طبی مسائل اور بیماریوں کے بارے میں سوالات پوچھتے ہیں۔ معالجین ان ہی کالموں میں انھیں صحت عامہ سے متعلق جوابات اور مفید مشورے دیتے ہیں۔

ان نوع کے کالموں کی ایک افادیت یہ بھی ہے۔ کہ ان میں عوام کو وبائی امراض اور موسمی احتیاط کے بارے میں اہم تدابیر بھی بتائی جاتی ہیں۔ یہ کالم طب وصحت، میڈیکل گائیڈ، اور دیگر مخصوص ناموں سے اکثر اخبارات میں چھپتے ہیں۔

مذہبی یا دینی کالم:

یہ کالم ممتاز اور مستند علمائے دین تحریر کرتے ہیں۔ جو قرآن وحدیث سمیت جملہ فقہی مسائل کا بخوبی علم وادراک رکھتے ہوں۔ ان کالموں میں دینی مسائل، تفہیم القرآن، تفہیم الحدیث، رشد وہدایت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور معاشرتی وخانگی مسائل میں عوام کے استفسارات کا جواب دیتے ہیں۔ اخبارات کے مدیران کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کالموں میں فرقہ وارانہ یا متنازعہ موضوعات کو زیر بحث نہ لایا جائے تا کہ عوام کی دل آزاری نہ ہو سکے اور اخبارات کی شہرت کو بھی نقصان نہ پہنچے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ عوام کی اچھی خاصی تعداد ان کالموں سے استفادہ کرتی ہے۔

معاشرتی یا سماجی کالم:

اگرچہ معاشرتی مسائل اور ناہمواریوں کو جہاں طنزیہ مزاحیہ کالموں میں دلچسپ پیرائے میں موضوع بنایا جاتا ہے۔ تاہم معاشرتی زندگی کے مسائل اور المیّوں کو سنجیدہ انداز میں بھی کالم میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ قارئین ایسے کالموں کو اس لیے بھی پسند کرتے ہیں کہ ان میں سماج کے ناسور مسائل اور مشکلات کا حل ملتا ہے۔ کشور ناہید اور بشریٰ رحمٰن کے کالم ''چاردیواری'' اور ''چاندنی'' اس سلسلے کی نمایاں مثالیں ہیں۔

ثقافتی کالم:

ثقافتی کالم، کالم کی وہ قسم ہے جن میں کسی ثقافتی تقریب کے حوالے سے روداد اور تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔ سرفراز سید کا کالم ''زاوی نامہ'' ثقافتی کالم کے زمرے میں آتا ہے۔ ان کالموں کے ذریعے خاص طور پر اخبار کے ان قارئین تک ثقافتی تقریبات کی رپورٹ پہنچائی جاتی ہے۔ جو ثقافتی مراکز سے دور ہوتے ہیں۔ اخبارات کے ہفت روزہ ایڈیشن میں اکثر شہر کی ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں کالم لکھے جاتے ہیں۔

خواتین کے کالم:

یہ صحافت کا روشن پہلو ہے کہ اب خواتین کی دلچسپی کے لیے خصوصی ہفت روزہ، ماہانہ رسائل اور ڈائجسٹ چھپتے ہیں۔ اسی طرح اخبارات میں بھی خواتین کے مسائل پر بھی کالم لکھے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ کالم بھی خواتین لکھتی ہیں۔ جیسے رفعت قادر حسن کا کالم ''اکاون فیصد'' یا روزنامہ ''خبریں'' میں یاسمین شاہد کچھ عرصہ کالم لکھتی رہی ہیں۔ ان کالموں میں خواتین کی سرگرمیوں، پکوان، ٹوٹکے اور گھریلو مشورے وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

تعلیمی کالم:

اخبارات جہاں ہفتہ وار تعلیمی ایڈیشن نکالتے ہیں۔ وہاں تعلیمی اُمور کے لیے بھی مخصوص کالم شائع کیے جاتے ہیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ان کالموں میں تعلیمی مسائل، حکومت کی تعلیمی پالیسی محکمہ تعلیم کے المیّوں اور اساتذہ کی مشکلات کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ایسے کالم عام طور پر کالج اور یونیورسٹی کے پروفیسرز صاحبان اور ماہرین تعلیم لکھتے ہیں۔ اخبارات میں یہ کالم تعلیمی راونڈاپ کیمپس نیوز اور تعلیم و تربیت اور دیگر مستقل عنوانات کے تحت شائع ہوتے ہیں۔

ذاتی ڈائری نما کالم:

ان کالموں میں یا تو کالم نگار اپنی سرگزشت قسط وار چھاپتا ہے یا مختلف امور سے متعلق اپنے تاثرات بیان

کرتا ہے۔اس کا اندازِ تحریر اداریے کی عبارت کی طرح ٹھوس، سیدھا سادہ اور سنجیدہ ہوتا ہے۔

تربیتی یا مشاورتی کالم:

ان کالموں میں ہر شعبہ زندگی کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ قارئین کی رہنمائی اور تربیت کا کام کرتا ہے۔ (۶۶)

فکاہیہ کالم:

اخباری دنیا کا مقبول ترین کالم فکاہیہ کالم ہے۔عوام اسے بہت زیادہ شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔اخبار کی سنجیدگی اور حادثات کی خبروں کے درمیان میں فکاہیہ کالم پڑھنے والوں کے ذہنی دباؤ کو کم کرتا ہے۔ اُردو میں کالم نویسی کا آغاز ہی فکاہیہ کالم سے ہوتا ہے۔محمد سلیم ڈوگر فکاہیہ کالم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فکاہیہ کالم انتہائی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔اور انہیں کالم کی مقبول ترین صنف قرار دیا جاتا ہے'' (۶۷)

مکتوباتی کالم:

اخبارات میں قارئین کی آراء اور تجاویز شامل کرنے کے لیے کالم کی اس قسم کو رواج دیا گیا ہے۔کالم جب کبھی ایسے مکتوب سے متاثر ہو جاتا ہے۔جس میں کسی مسلئے یا المیے کی طرف نشاندہی کی گئی ہو یا ملکی ترقی کے لیے تجاویز دی گئی ہوں تو کالم نگار اسے اپنے کالم میں شامل کر کے اس پر اپنا تجربہ پیش کر دیتا ہے۔کبھی کبھی کالم نگار صرف مکتوب کو شائع کر کے پڑھنے والے کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ زیرِ بحث موضوع پر اپنی رائے دیں۔

ترکیبی کالم:

ایسے کالم میں کالم نویس کا اندازِ تحریر ترکیبی ہوتا ہے۔ وہ عموماً کسی دلچسپ اور اہم واقع کو مرکزی نقطہ نظر بنا کر کالم لکھتا ہے۔ایسے لکھنے والے کالم نویس بہت کم ہوتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لکھنے کے لیے جس

ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر کالم نویس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

کالم کے بنیادی مباحث اور اقسام کے تعارف سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عصری صحافت میں کالم نے جو ترقی یافتہ صورت اختیار کی ہے۔اس کے تناظر میں نہ تو کالم کو اتنا محدود کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ایک ہی قسم کو تسلیم کرنے پر اصرار کیا جائے اور نا ہی یہ ممکن ہے کہ کالم کو پانچ یا سات اقسام میں تقسیم کرنے کے بعد کالم کے مزید پھیلاؤ کے درکو ہی بند سمجھا جائے۔

کالم کی ماہیت، کردار اور منصب کو دیکھا جائے تو اس حقیقت کو ماننا پڑتا ہے کہ کالم زندگی کی ترقی یافتہ شکل وصورت کا عکاسی ہے آج کالم جس روپ مین ہمارے سامنے ہے ۔کالم کے ابتدائی دور میں یہ روپ اُس روپ سے بہت مختلف ہے۔یعنی کالم کی اپنی ایک زندہ روایت موجود ہے اور اسی روایت کے تناظر میں اگر مستقبل کے کالم کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مستقبل کا کالم آج کے کالم کی ارتقائی شکل وصورت کا نقش ہوگا۔جو اس بات کی علامت ہے کہ کالم ایک ترقی پسند صنف ہے۔

یہاں پر کالم کی روایت کی تفہیم کی راہ میں حائل اس رکاوٹ کی نشان دہی بھی ضروری ہے کہ علمی کم نظری یا تحقیقی کو تاہی کے سبب اُردو زبان وادب کے میدان میں کالم کو تا حال کما حقہ تحقیقی وتنقیدی نظر سے نہیں پرکھا گیا۔

اُردو میں تادمِ تحریر جو تنقیدی کتب میرے سامنے ہیں۔اوّل تو ان میں آٹے میں نمک کے برابر بھی ایسی کتب دستیاب نہیں جن میں اُردو کالم اور ادبی کالم نگاری کے قیمتی سرمائے کو کنگالا گیا ہو۔بمشکل جو چند کتابیں ملتی ہیں ان میں بھی وافر مقدار میں انگریزی کتب کی خوب خوب خوشہ چینی کی گئی ہے جو اُردو کالم کو سمجھنے کے لیے ابتدائی معیار پر بھی پوری نہیں اُترتیں۔راقم الحروف کے نزدیک کالم اب ایک زرخیز صنف کی شکل میں سامنے آچکا ہے۔ اس صنف میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی تجربات وآہنگ کا ایک جہانِ معنی آباد ہے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ عبدالسلام خورشید، ''صحافت پاکستان و ہندوستان میں''، مکتبہ کارواں لاہور۔ س ن۔ ص۔۱۱

۲۔ بدر شکیب، ''اُردو صحافت''، کارواں ادب کراچی ۱۹۹۲ء، ص۔۱۴

۳۔ ڈاکٹر شفیق جالندھری، ''صحافت اور ابلاغ''۔ اے ون پبلشر لاہور ۲۰۰۲ء ص۔۶۳

۴۔ بدر شکیب، ''اُردو صحافت''، ص۔۱۴۔

۵۔ پروانہ ردولوی، ''اُردو صحافت کا استغاثہ''، حیا پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۹۴ء ص۔۴

۶۔ ڈاکٹر وحید قریشی، پیش لفظ، پاکستان و ہند میں مسلم صحافت، از: مسکین علی حجازی، سنگ میل پبلشر لاہور ۱۹۹۰ء ص۔۱۸

۷۔ عفیرہ حامد علی، ''اُردو زبان و ترقی میں صحافت کا حصہ''، مقالہ پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۸ء ص۔۸۵

۸۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ''اُردو ادب میں مزاح''، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۷۷ء ص۔ ۳۰۹، 310

۹۔ ایس ایم ناز، '' اخبار نویسی کی مختصر تاریخ''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۳ء ص۔۱۵۲

۱۰۔ عبدالسلام خورشید، ''صحافت پاکستان و ہندوستان میں''، ص۔۲۵

۱۱۔ ایضاً، ص۔۵۴

۱۲۔ پروانہ ردولوی، ''اُردو صحافت کا استغاثہ''، ص، ۸۴۔۸۵

۱۳۔ امداد صابری، '' تاریخ صحافت'' (جلد اوّل)، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۳ء، ص۔۱۲۶

۱۴۔ خواجہ احمد فاروقی، ''مقدمہ دہلی اخبار''۔ ۱۹۷۲ء دہلی یونیورسٹی۔ ص۔۲۰

۱۵۔ ڈاکٹر شہناز انجم، '' ادبی نثر کا ارتقا''۔ جامعہ دہلی، ۱۹۹۷ء، ص۔۱۴

۱۶۔ عتیق صدیقی، '' ہندوستانی اخبار نویسی''، انجمن ترقی اُردو ہند ۱۹۵۷ء، ص۔۲۸۷

۱۷۔ ڈاکٹر صالح عبداللہ، ''اُردو صحافت میں اظہار و ابلاغ کے مختلف پیرایوں کا تنقیدی جائزہ''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۲۰۰۶ء ص۔۲۲

۱۸۔ مسکین علی حجازی، ''پاکستان و ہند میں مسلم صحافت''، سنگ میل پبلشر لاہور ۱۹۸۹ء ص۔۲۷

۱۹۔ اُودھ پنچ۔لکھنؤ۔۲۸اگست ۱۸۷۷ء مملوکہ: دیال سنگھ لائبریری لاہور،ص۔۳

۲۰۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ''اُردو ادب میں طنز و مزاح''، ص۔۱۴۹

۲۱۔ چکبست لکھنوی، ''مضامین چکبست''، لکھنؤ پریس، لکھنؤ، س۔ن،ص۔۲۸

۲۲۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ''اُردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر''، انجمن ترقی اُردو کراچی ۱۹۹۶ء،ص۔۱۱۲

۲۳۔ مہذّب، لکھنؤ۔ مملوکہ: دیال سنگھ لائبریری لاہور۔ یکم اگست ۱۸۹۰ء۔ ص۔۴

۲۴۔ دلگداز۔ مملوکہ: دیال سنگھ لائبریری لاہور، دسمبر، ۱۸۸۷ء۔ص۔۶

۲۵۔ عبدالسلام خورشید، '' صحافت پاکستان و ہند میں''، ص۔۱۴۶ تا ۱۵۸

۲۶۔ ایضاً، ص۔۱۷

۲۷۔ ڈاکٹر مسکین مجازی، ''پاکستان و ہند میں صحافت''، ص۔ ۲۸.

۲۸۔ ایضاً، ص۔۴۰

۲۹۔ رشید حسن خان، ''تلاش و تعبیر''، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۸۸ء، ص۔۲۹۴

۳۰۔ قطب اللہ، ''مولانا آزاد کا نظریہ صحافت''، اُتر پردیش اُردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۸۹ء، اص۔۹۴

۳۱۔ ابوالکلام آزاد، '' الہلال اداریہ''، کلکتہ، مملوکہ: دیال سنگھ لائبریری لاہو، ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء ص۔۲

۳۲۔ الہلال، ۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء ص۔۶

۳۳۔ مولانا محمد علی جوہر، ''کامریڈ''، مملوکہ: دیال سنگھ لائبریری لاہو، ۲۲ مارچ ۱۹۱۲ء، ص۔۳

۳۴۔ ڈاکٹر صالح عبداللہ، ''اردو صحافت میں اظہار و ابلاغ کے مختلف پیرائے کا تنقیدی جائزہ''، ص۔ ۹۸

۳۵۔ ڈاکٹر نظیر حسین زیدی، '' مولانا ظفر علی خان بحیثیت صحافی''، مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۵۸ء، ص۔۱۳۱

۳۶۔ ''ہمدرد''، مملوکہ: دیال سنگھ لائبریری لاہو، ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۳ء ص۔۳

۳۷۔ عبدالسلام خورشید، ''صحافت پاکستان ہند میں''، ص۔۲۰۰

۳۸۔ ایضاً، ص۔۲۴۳

۳۹۔ ایضاً، ص۔۲۳۹

۴۰۔ ایضاً، ص۔۲۴۵

۴۱۔ عبدالسلام خورشید، ''اُردو صحافت ۱۸۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک''، مشمولہ: نقوش لاہور نمبر، حصہ دوم، ص۔۸۵۲

۴۲۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی، ''پاکستان و ہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ''، ص۔۶۴

۴۳۔ روزنامہ ''امروز'' لاہور، کالم ''ہم اور آپ'' ۴ مارچ ۱۹۴۸ء ص۔۲

۴۴۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی، ''پنجاب میں اردو صحافت''، ص۔۵۱۸

۴۵۔ Oxford Dictionary of English P.193 Published 1986.

۴۶۔ قاموس الاصطلاحات۔ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور۔ س ن، ص۔۱۵۷

۴۷۔ علمی اُردو لغت، علمی کتب خانہ اُردو بازار لاہور، س۔ن، ص۔ ۱۱۰۰

۴۸۔ فاؤنز انگلش اُردو ڈکشنری۔ مرکزی اُردو بورڈ، لاہور۔ س ن، ص۔۱۷۱

۴۹۔ کتابستان ڈکشنری۔ اُردو بازار لاہور، س۔ن، ص۔۱۲۷۔۱۲۸۔

۵۰۔ نور اللغات، جلد چہارم۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور۔ ۱۹۵۸ء، ص۔۲۲

۵۱۔ فیروز اللغات۔ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور۔ س۔ن، ص۔۹۷۷

۵۲۔ The Oxford Guide to English Language. Oxford Press Tokyo. Page 292

۵۳۔ The Encyclopedia Britinnica, Volume, 111. 1973 Page: 29

۵۴۔ عبدالسلام خورشید، ''فن صحافت''، مکتبہ کارواں، لاہور، س۔ن، ص۔ ۱۸۸۔

۵۵۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی، '' جرنلزم''، مولفہ: عابد مسعود تہامی، عظیم اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۴ء، ص۔ ۸۵

۵۶۔ Geroge fox mott, Survey of Journalism Bornes & Inc New Yonc Nob P171

۵۷۔ خالد محمود عالی "اردو صحافت، تاریخ و فن"، بنو بک پبلس، لاہور، س۔ن، ص۔۹۱، ۹۲

۵۸۔ ڈاکٹر شفیق جالندھری "صحافت اور ابلاغ" اے۔ ون پبلشرز لاہور ۲۰۰۲ء، ص۔۱۰۲

۵۹۔ ایضاً ص۔۵۶

۶۰۔ ایضاً،ص۔۷۷

۶۱۔ ڈاکٹر شفیق جالندھری، "صحافت اورابلاغ "اے۔ون پبلشرز لاہور ۲۰۰۲ء،ص۔۱۰۳

۶۲۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب، "اُردو صحافت اور فکاہیہ کالم کی روایت''،ص۔۲۴

۶۳۔ ایضاً،ص۔۲۴

۶۴۔ ایضاً،ص۔ ۲۵

۶۵۔ عابد مسعود تہامی "جرنلزم " ص۔۸۶

۶۶۔ پروفیسر شفیق جالندھری،''کالم نویسی''اے۔ون پبلشرز لاہور ۲۰۰۲ء ۱۹۹۳ء،ص۔۲۶۔۲۷

۶۷۔ محمد اسلم ڈوگر،''فیچر،کالم اور تبصرہ "،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۹۸ء،ص۔۲۳

بابِ دوّم

ادبی کالم نگاری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

فصلِ اوّل

ادبی کالم نگاری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

ادب کیا ہے؟

یہ سوال اپنی جگہ آج بھی مکمل اور جامع جواب سے محروم ہے کہ ادب کیا ہے؟۔زمانہ قدیم سے یونانی مفکرین سے لے کر مغربی ومشرقی دانشورانِ ادب تک ادب کی تعریف پر کئی آراء سامنے آئی ہیں۔

ادب ایک کثیر المعنی اصطلاح ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک جملے میں اس کی تعریف بیان نہیں ہوسکتی۔اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ادب کی تعریف کے ضمن میں نقطہ ہائے نظر کا اختلاف ہمیشہ موجود رہا ہے۔کہ کچھ لوگ ادب کو اس کی ماہیت، کچھ موضوع، اور کچھ اس کے متن کو سامنے رکھ کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔

لفظ ادب عربی سے اُردو میں آیا۔یہ ان الفاظ میں سے ایک ہے جن کے اصلی معانی میں مرور ایام، لوگوں کی عادات، ذوق اور احتیاجات میں تبدیلی آجانے سے بڑے تغیرات پیدا ہوگئے ہیں۔نیاز فتح پوری ادب کے اصطلاحی معنوں پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''لٹریچر کا ترجمہ اُردو میں عام طور پر ادب یا ادبیات کیا جاتا ہے۔جو اپنے اصلی مفہوم کے لحاظ سے بظاہر بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے لیکن غالباً اس سے بہتر ترجمہ ممکن نہیں۔ہر چند اوّل عربی زبان میں ادب کا لغوی مفہوم وہی تھا جو انسان کے بلند شریفانہ خصائل کو ظاہر کرتا ہے۔اور جس کے لیے ایک دوسرا لفظ ''تہذیب'' بھی موجود ہے۔لیکن بعد میں استعارۃً اس سے وہ تمام علوم مراد لیے جانے لگے۔جو ذہنی شائستگی اور تمدنی تعلقات کی پاکیزگی سے متعلق ہیں اور چونکہ لٹریچر کا مقصود اصل بھی یہی ہے۔اس لیے غالباً ادبیات سے بہتر اس کا ترجمہ ممکن نہیں''۔(۱)

ادب کی اپنی خاص صفات ہوتی ہیں۔ جس کی بنیاد پر ادبی اور صحافتی تحریر میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے بھی ادب کی اپنی ایک جداگانہ دنیا ہے۔ اس میں حد فاصل قائم کرنے کے لیے درج ذیل امتیازات سامنے آتے ہیں۔

۱۔ غیر ادبی تحریروں میں اظہار محض مقصود ہوتا ہے۔ جب کہ ادبی تحریروں کو حسنِ اظہار سے بھی دلچسپی ہے۔

۲۔ غیر ادبی تحریروں کے برعکس ادبی تحریروں میں مصنف کی ذات بھی اظہار پاتی ہے۔

۳۔ ادبی تحریروں کا مواد عام انسانی دلچسپی پر مشتمل ہوتا ہے۔ غیر ادبی تحریر کے لیے یہ شرط نہیں۔

۴۔ غیر ادبی تحریریں کسی ہیئت کی پابند نہیں ہوتیں۔ جب کہ ادبی تحریر کے لیے کسی ہیئت کا پابند ہونا لازم ہے۔

۵۔ ادبی تحریر تخیل سے کام لیتی ہے۔

۶۔ غیر ادبی مثلاً سائنسی تحریر جذبے سے گریزاں ہے۔ ادبی تحریر جذبات سے اعتنا کرتی ہے اور جذبات کو اپیل کرتی ہے۔

۷۔ غیر ادبی تحریر کا بنیادی مقصد معلومات کی ترسیل ہے۔ ادبی تحریروں کا بنیادی مقصد مسرت بخشی ہے اور حسن آفرینی ہے۔(۲)

ادبی تحریر غیر ادبی یا صحافتی تحریر سے یوں بھی مختلف ہے کہ ادبی تحریر کے اپنے ترجیحی مقاصد ہیں۔

۱۔ اسے پڑھنے والوں کو کوئی خاص زاویہ نظر یا طرزِ عمل اختیار یا رد کرنے کی ترغیب دینا۔

۲۔ ان کے ذوقِ جمالیات کی تسکین کرنا اور انھیں جمالیاتی مسرت بہم پہنچانا۔

۳۔ قارئین کو ایسی آگہی و شعور بخشنا ہے جس میں ایک خاص نوع کی بصیرت ہو، جو ذوق سلیم کے ساتھ ساتھ قلب و ذہن کو روشنی عطا کرتا ہے۔

۴۔ زندگی، ذات اور کائنات کی تفہیم و تجزیے کا سامان فراہم کرنا۔(۳)

ادب کی مکمل تعریف ایک مشکل امر ہے۔ مشرق اور مغرب میں ادب کی بیسیوں تعریفیں کی گئی ہیں اور آج تک کسی تعریف پر اتفاق نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے تمام قابلِ ذکر تعریفیں یکجا کر کے ایک جامع تعریف وضع کرنے کی کوشش کی ہے:

> ''ادب وہ فنِ لطیف ہے جس کے ذریعے ادیب جذبات و افکار کو اپنے خاص نفسیاتی و شخصی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ الفاظ کے واسطے سے زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی و تنقید بھی کرتا ہے اور اپنے تخیل اور قوتِ متخیلہ سے کام لے کر اظہار و بیان کے ایسے موثر پیرائے اختیار کرتا ہے جن سے سامع و قاری کا جذبہ و تخیل بھی تقریباً اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل اور جذبہ متاثر ہوا''۔ (۴)

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو ادب کی ہر تعریف بدلتی دنیا اور عالمگیریت کے بہاؤ کی وجہ سے کاملیت کے وصف سے محروم ہو جاتی ہے۔ بالآخر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ادب کی مکمل تعریف یہی ہے کہ ادب کی مکمل تعریف نہیں ہو سکتی ہے۔ (۵)

فصل دوّم

اُردو صحافت میں کالم نویسی کا آغاز اور ادبی کالم

اُردو صحافت میں کالم نویسی کا آغاز کب ہوا؟ اُردو میں کالم نویسی کی بنیاد رکھنے والے کون ہیں؟ ہم ان سوالات کے جواب کی تلاش کے لیے جب تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ سہرا ابوالکلام آزادؔ کے سر بندھتا ہے۔ جنھوں نے مستقل عنوان اور موجود طرزِ بیان کے ساتھ کالم کی روایت شروع کی۔ پروفیسر شفیق جالندھری کی تحقیق کے مطابق:

> ''اُردو صحافت میں مستقل عنوان اور لکھنے والے کے نام کے ساتھ موجودہ انداز میں کالم کا آغاز ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' میں ''افکار و حوادث'' کے عنوان سے ایک شگفتہ کالم شروع کیا۔ یہ طنزیہ اور مزاحیہ کالم تھا۔ جو ''الہلال'' کے علاوہ ایک دوبار مولانا کے دوسرے جریدے ''البلاغ'' میں بھی شائع ہوا''۔(۶)

''افکار و حوادث'' مولانا آزاد کا ایسا کالم ہے جس میں ادبی اُسلوب میں فکاہیہ کالم کے خدوخال نمایاں کیے۔ اس طرح اُردو کالم نویسی کو ابتداء ہی میں ایک بے مثال اُسلوب میسر آگیا جو بعد کے کالم نگاروں کے لیے نشانِ منزل ٹھہرا۔

ادبی کالم کیا ہے؟

اُردو صحافت نے جدید دور کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے اظہار کی نئی اور ترقی یافتہ راہیں اپنالی ہیں۔ تبدیلی کے اس عمل سے کالم نویسی کی روایت بھی متاثر ہوئی اور اب اخبارات میں ادبی کالم بھی شائع ہوتے ہیں۔

ادبی کالم ادب سے متعلقہ موضوعات کے لیے مختص ہوتے ہیں۔جن میں ادبی نظریات، مسائل، کتابوں کا تعارف وتبصرہ اورادبی تقاریب کا احوال شامل ہوتے ہیں۔محمود عالم خان کے مطابق:

''کالم دراصل معاشرتی اظہار کا دوسرا نام ہے۔ادب اس اظہار میں فرد سے زیادہ سماج، ماحول اوراس کے متعلقہ عناصرکوادبی سطح پر زیر بحث لایا جاتا ہے۔ کالم میں سماجی عمل اور اس کے فیصلوں کا جائزہ لیا جاسکتا ہے اور ان پر ایک ناقدانہ رائے قائم کی جاتی ہے۔ادبی کالم کوئی تنقیدی مقالہ نہیں ہوتا وہ تو محض ایک نقطۂ نظر ہے۔کالم شرافتوں کی پاسدار صنف ہے اس لیے اس میں لفظوں کی پردہ داری کنایہ کے استعمال کی سفارش کرتی ہے''۔(۷)

جمالیاتی زاویے سے ادبی کالم کو دیکھا جائے تو یہ فقط طرزِ ادا تک محدود نہیں یہ ایک طرزِ احساس اور نظریۂ ادب کا نام ہے جس کے ذریعے قاری کے ذوقِ سلیم کی آبیاری ہوتی ہے۔ادبی کالم میں کسی ادبی نظریے، ادبی شخصیت اور ادبی معرکوں اور چپقلشوں پر بحث ومباحثہ ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ادبی کالم صحافت کا حصہ ہے یا ادب کا حصہ ہے؟

اسے ادب کی نئی صنف کہا جائے یا صحافت کا، یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے کیونکہ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے شاعرادیب اور صحافی اس باب میں اختلافی آراء رکھتے ہیں۔اُردو کے معروف ادیب اور سینئر کالم نگار ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے نزدیک:

''ادبی کالم ادب کی ترقی یافتہ اور جدید صنف ہے''۔(۸)

جب کہ صاحبِ اُسلوب افسانہ نگار اور خوب صورت اندازِ تحریر کے حامل ادبی کالم نگار انتظار حسین اسے صحافت کی ایک خاص صنف سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک ادب ایک اعلیٰ وارفع عمل ہے۔ادبی کالم ادب کے اعلیٰ معیار پر پورا

نہیں اترتا۔اس لیے اسے ادب کا حصہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔(۹)

انتظار حسین کی رائے اپنی جگہ اہم ہے۔لیکن اس سے اتفاق نہیں جا سکتا اس لیے کہ ادب اعلیٰ وارفع عمل کے ساتھ ساتھ اسے کسی محدود دائرے میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔نہ ہی ادب میں جدید رجحانات کے دروازے بند کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان اپنے موقف کی وضاحت میں کہتے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی نے ادبی کالم کے مطالعہ کو اُردو ادب کے نصاب کا حصہ بنایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ادبی کالم (جیسا کے نام سے ظاہر ہے) کو ادب کا حصہ تسلیم کر لینا چاہیے اور اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ادبی کالم کے لیے اپنے ضابطے اور قاعدے مختص کیے جائیں۔مثال کے طور پر ابنِ انشاء، خامہ بگوش، عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کئی ادبی کالم مجموعوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ابنِ انشاء کی مشہور طنزیہ ومزاحیہ کتاب ''اُردو کی آخری کتاب'' ابتدائی صورت میں کالم میں چھپتی رہی ہے اور اب اسے ایم۔اے اُردو کے نصاب میں پڑھایا بھی جاتا ہے۔

ادبی کالم نگاری

ادبی کالم کی ایک مقبول قسم کالم نگاری کی وہ زرخیز روایت ہے۔جس میں دلچسپ اور شگفتہ پیرائے میں قومی منظر نامے پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ادبی اُسلوب کے حامل کالم نگاری کی اس قسم میں طنز ومزاح کے سارے حربے اور وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں۔

طنز ومزاح کے دلچسپ طرز اظہار میں کالم لکھنا ایک مشکل امر ہے۔ یہ کالم طبعی میلان اور خداداد تخلیقی صلاحیت کے ذریعے وجود میں آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسے قارئین میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔اس سے پڑھنے والے کی حسِ مزاح کی تہذیب ہوتی ہے اور ذومعنی جملوں کے ذریعے معاشرے کے ناہموار رویوں اور

منفی طرزِ عمل پر تنقید کی جاتی ہے۔ کالم نگار اپنے منفرد اُسلوب اور طرزِ بیان کے پردے میں مشاہدے اور تجزیے کی باریک بین صلاحیت کو بروئے کار لاتا ہے۔ وہ رمز و کنایہ، موازنہ، مبالغہ، اور کبھی لفظی بازی گری، تحریف وغیرہ کے ذریعے اپنا مقصد بطریق احسن حاصل کر لیتا ہے۔ اس میں بے پناہ تنوع پایا جاتا ہے۔

طنز و مزاح کی تعریف:

طنز و مزاح کو عام طور پر ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے جبکہ طنز ایک علیحدہ اور مزاح ایک علیحدہ ادبی اصطلاح ہے۔ اسی لیے محققین نے دونوں کی علیحدہ علیحدہ تعریف کی ہے۔ طنز کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر شمع افروز زیدی لکھتی ہیں:

''طنز بحیثیت صنف ادب بڑا اہم اور اثر آفریں حربہ ہے۔ اس کے ذریعے طنز نگار اہل وطن کی دکھتی ہوئی رگوں پر اُنگلی رکھتا ہے۔ اس سے اس کا مقصد تفریح طبع نہیں ہوتا۔ بلکہ قوم کی اصلاح ہوتا ہے۔ طنز نگاری، نثر یا نظم میں قوم کی حماقتوں کی مذمت کرتا ہے۔ مگر اس میں کسی قسم کی مسخری کو دخل نہیں ہوتا کیوں کہ طنز تبسم کے ساتھ ساتھ غور و فکر کا بھی مطالبہ کرتا ہے'' (۱۰)

اس ضمن میں ڈاکٹر ظفر عالم ظفری کا خیال ہے:

''طنز دراصل اصلاح کا ذریعہ ہے۔ طنز نگار مسلمہ اصولوں اور آفاقی قدروں کے پامال کرنے والوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نہ فلسفہ کا انداز گفتگو اختیار کرتا ہے اور نہ پولیس والے کی زبان ۔ وہ مبلغ کی طرح تبلیغ کرتا ہے نہ جج کی طرح سزا سناتا ہے۔ وہ تو کھٹے میٹھے اور ترش و شیریں انداز میں کبھی ہلکا کبھی اُونچا سنتا ہے، تاکہ بھٹکے ہوؤں کو شرمندگی کا احساس ہو جائے''۔ (۱۱)

بالعموم طنز کو پگڑی اچھالنا، سر عام رسوا کرنا، دوسروں کو حقیر سمجھ کر ان کا مذاق اڑانا، سمجھا جاتا ہے جیسا کہ خواجہ عبدالغفور سمجھتے ہیں:

''طنز تنقید ہے، صدائے احتجاج ہے، دشنام یار ہے، تبصرہ ہے، تازیانہ ہے، اس کا مقصد اصلاح ہے۔ پگڑی اُچھالنا ہے۔ احساس برتری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ بے ہودہ اشیا اور اشخاص کا مضحکہ اڑانا ہے۔ طنز مبالغہ ہے، مشغلہ ہے۔ مہتابی ہے، انار ہے، پھلجڑی ہے، اپنے آپ پر ہنسنے کا نام ہے، چٹکی لینا ہے۔ ہمدردانہ نقطہ نظر سے انسانی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کا فن ہے''۔(۱۲)

طنز ایک باشعور فنکار کے ذہنی ردعمل کا ایسا اظہار ہے جس کی بنیاد میں ہمدردانہ غور وفکر اور اصلاحی جذبہ کارفرما ہو۔ یہ ماحول کی ناہمواریوں کے خلاف اظہار کا ایک ہمہ جہت وسیلہ ہے۔ اُردو میں طنز ومزاح کے ابتدائی خدوخال ہمیں انگریزی دور کے ظلم و استبداد کے خلاف ردعمل کے طور پر نظر آتے ہیں۔ طنز کو ایک تخریبی عمل نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تو دلچسپ پیرائے میں اپنے ماحول کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی بے اعتدالیوں کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

مزاح:

مزاح خوش طبعی اور خوش کلامی کے ذہنی میلان سے جنم لیتا ہے۔ اس میں ایک فطری برجستگی کا وصف موجود ہے۔ ایک ماہر مزاح نگار میں ذہانت وذکاوت، بزلہ سنجی، احساس دل کی خداداد صفات پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا مزاح کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''خالص مزاح طنز، تحریف، رمز وغیرہ سے اپنی بقا کے لیے خون گرم حاصل کرتا ہے۔ وہ خود کن عناصر کے اجتماع سے مرتب ہوتی اور کس انداز سے مزاحیہ وطنزیہ ادب کی معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے خالص مزاح کو

لیجیے۔ جس کی تعریف اسٹیفن نے ان الفاظ میں کی ہے۔ مزاح کیا ہے؟ یہ زندگی کی ناہموار یوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے۔ مزاح کی یہ توضیح دراصل مزاح کی تخلیق سے متعلق ہے اوراس بات کا انکشاف کرتی ہے کہ مزاح نگار اپنی نگاہ دور بین سے زندگی کی ان ناہمواریوں اور مضحکہ کیفیتوں کو دیکھ لیتا ہے۔ جوایک عام انسان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ دوسرے ان ناہمواریوں کی طرف مزاح نگار کے ردعمل میں کوئی استہزائی کیفیت پیدانہیں ہوتی بلکہ وہ ان سے محظوظ ہوتا اوراس ماحول کو پسند بھی کرتا ہے جس نے ان ناہمواریوں کو جنم دیا ہے۔ چنانچہ ان ناہمواریوں کی طرف اس کا زاویۂ نگاہ ہمدردانہ ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ مزاح نگار اپنے تجربے کے اظہار میں فنکارانہ انداز اختیار کرتا ہے اوراسے سپاٹ طریقے سے پیش نہیں کرتا''۔(۱۳)

ڈاکٹر ظفر عالم ظفری نے مزاح کا نفسیاتی تجزیہ یوں کیا ہے:

''مزاح کا مقصد سنجیدگی کو توڑنا اور روح کو بالیدگی بخشنا ہے۔ مزاح میں فکر کی گہرائی، باریک بینی یا بلند خیالی نہیں ہوتی۔ یہ تو مضحک کیفیات پر ہنسنے اور ہنسانے کا عمل ہے''۔(۱۴)

اس باب میں خواجہ عبدالغفور کی رائے ہے:

''کہتے ہیں کہ جب دستور زبان بندی کھل کر بات نہیں کرنے دیتا تو طنز ومزاح کے پھول کھلنے لگتے ہیں۔ مزاح صرف جملے کس دینے یا کسی کی عیب جوئی پر منحصر نہیں بلکہ حسیات اور شعور کے سمندر کی گہرائیوں میں ڈوب کر موتی نکالنا، ہم آہنگی اور تضاد میں امتیاز کرنا، نامقبولیت کورد کرنا اوراپنی منطق کوایسے دل پذیر انداز میں پیش کرنا کہ سامعین

قائل ہو جائیں۔ یہ سب مزاح کے اوصاف ہیں''۔(۱۵)

ڈاکٹر سلطانہ بخش مزاح کے داخلی اور خارجی آہنگ کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''مزاح کا قوی ترین محرک اشیاء کی اعجوبگی کا ادراک ہے اور کسی چیز کا اعجوبہ پن تناسب کے فقدان سے پیدا ہوتا ہے۔ تناسب کی یہی کمی اور یہی ناموزونیت یا مناسبت ہنسی پیدا کرتی ہے۔ ہنسی ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ایک طرح کی بشاشت ہے، ایک انبساط ہے۔ مزاح نگار اپنی دور رس نگاہوں سے زندگی کی ان ناہمواریوں کا ادراک کر لیتا ہے، جو عام نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہیں اور نہ صرف ان کا ادراک کرتا ہے بلکہ ان سے لطف بھی اٹھاتا ہے اور ہمدردانہ رویے سے ان کا فنکارانہ اظہار بھی کرتا ہے۔ مزاح نگار جس چیز پر ہنستا ہے اسے ایک ذہنی کھیل سمجھتا ہے اور اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے خود بھی اس کھیل میں برابر کا شریک ہو جاتا ہے۔ لیکن ان خامیوں اور بے ڈھنگے پن کو دور کرنے کا خواہش مند نہیں ہوتا بلکہ اپنے تخیل کی مدد سے اس میں حسنِ صداقت پیدا کرتا ہے''۔(۱۶)

بالعموم طنز و مزاح کے فرق کو واضح کرنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ طنز ٹوٹے ہوئے تانے کو بکھیر دیتا ہے اور مزاح اس کو جوڑنے کی سعی و تدبیر کرتا ہے۔ ایک مزاح نگار اپنی باریک بینی اور مشاہداتی صلاحیت سے اپنے گرد و نواح کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتا ہے۔ چنانچہ اس کے موضوعات اپنے معاشرے سے منتخب کردہ ہوتے ہیں۔ اعلیٰ قسم کے مزاح میں ایک نوع کی ذو معنویت اور پہلوداری ہوتی ہے۔ جن میں طنزیہ، لطیف ستم ظریفانہ، الم ناک، مضحک اور سنجیدہ مزاح شامل ہے۔ ان اقسام کے علاوہ مزاح کی دیگر صورتوں میں مبالغہ، زبان و بیان کی کاری گری، تکرار، غلط تلفظ، غلط املا، رعایت لفظی، بذلہ سنجی، مزاحیہ کردار، مزاحیہ صورت واقعہ، شوخی، پھبتی،

پھکڑ پن، ہزل گوئی تمسخر، تحریف، اور رمز نگاری وغیرہ شامل ہیں۔

ادبی کالم کی اس صورت کا فکاہیہ کالم بھی کہتے ہیں۔ اس کی روایت تقریباً ایک صدی پر محیط ہے۔ جس میں بے پناہ تنوع اور موضوعات کی رنگارنگی ملتی ہے۔ ان کالموں میں سیاسی، مذہبی، معاشرتی، استحصال، فریب کاری، مکر اور ان سے بچاؤ کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔

ان میں سے اکثر کالم نگار شاعر و ادیب رہے ہیں۔ ''اودھ پنچ'' کی روایت سے لے کر خامہ بگوش تک اکثر و بیشتر کالم نگار شعری و ادبی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق جالندھری نے طائرانہ نظر سے اس کا جائزہ یوں لیا ہے:

> ''اخبارات معلومات، تفریحی اور فکری رہنمائی کے مقاصد پورے کرتے ہیں لیکن کالم کی تحریریں، اخبارات کے ان تین بڑے مقاصد کے علاوہ بھی بہت سے ایسے مقاصد پورے کرتی ہیں جو اخبارات کے دوسرے مندرجات کے ذریعے پورے نہیں ہوتے۔ کالم اخبارات سے قارئین کی جان پہچان اور گہرے رابطے کا ذریعہ ہیں۔ کالموں کے ذریعے قارئین اخبارات میں ایسی شخصیتوں سے روشناس ہوتے ہیں۔ جن کے خیالات وہ پسند کرتے ہیں۔ جن کے اسلوب میں انھیں بے تکلفی ملتی ہے۔ جو انھیں جانے پہچانے ہمدرد اور دوست معلوم ہوتے ہیں۔ فکر و خیال کے تنوع اور رنگارنگی کے علاوہ کالموں میں اُسلوب اور طرز نگارش کا تنوع بھی میسر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر کالم کا مزہ الگ ہے۔ خبروں، اداریوں اور مضامین کی سیدھی سادی اور خشک تحریروں سے قاری بور ہو جاتا ہے تو کالم کی دنیا میں آنکلتا ہے جہاں اسے ادب کی چاشنی ملتی ہے اور شاعر کا تخیل بھی۔ کسی کالم میں طنز و مزاح ہے تو کسی میں افسانوی اور ڈرامائی رنگ۔ کسی میں

سرسید کی بے تکلفی اور سادگی تو کسی میں ابوالکلام اور ظفر علی خان کی خطابت ، زور اور طنطنہ ، کسی میں شبلی کی علمیت تو کسی میں رازی وغزالی کی حکمت ، کسی میں حالی کا درد تو کسی میں میر کا سوز ، کسی میں رومی کی فکر تو کسی میں اقبال کے جگر کا سوز۔ غرض کالم کی دنیا ایسی ہے۔ جس میں سیر کو نکلنے والا نہیں تھکتا''۔ (۱۷)

ادب کے فروغ اور صحافت کے نکھار میں ادبی کالم کی روایت کو کسی طور نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ صحافت کی پُرخار وادی میں ادبی کالم احساس کی نزاکت ، فکر کے آہنگ ، ذوقِ جمالیات کی تہذیب اور صحافت کے نکھار کا ایسا نقیب ہے جس کی تاریخ سے نامور اہل ادب وابستہ رہے ہیں۔ جن کا جائزہ آئندہ میں پیش کیا جارہا ہے۔

فصل سوّم

قیام پاکستان کے بعد منتخب ادبی کالم نگاروں کا جائزہ

پاکستان وجود میں آیا تو جہاں دوسرے تمام شعبوں میں وسائل کی عدم دستیابی مسئلہ تھا۔ وہیں صحافت کے میدان میں بھی تہی دامن تھا۔ مشرقی ومغربی پاکستان میں مسلمانوں کے اخبارات ورسائل کی تعداد انگلیوں پر گنا جاسکتا تھا۔ ہندو، لاہوراور دوسرے اہم شہروں سے اپنے اخبارات ورسائل ہندوستان لے گئے۔ لاہور میں صرف زمیندار، انقلاب، احسان، نوائے وقت، شہباز، سول اینڈ ملٹری گزٹ اور پاکستان ٹائمز رہ گئے۔ کراچی میں صرف ایک اخبار روزنامہ، ملت، بچا۔ پشاور میں خیبر میل کے علاوہ بے قاعدگی سے شائع ہونے والے الفلاح، الجمعیت ورسرحد تھے۔ کوئٹہ میں الاسلام اور تنظیم میں کچھ دم خم تھا۔ کراچی دارالخلافہ بنا تو، جنگ، دہلی، انجام، دہلی اور ڈان، دہلی، کراچی منتقل ہو گئے۔ انھی دنوں چند نئے اخبارات، نئی روشنی، انقلاب، اور مسلمان بھی جاری ہوئے، لیکن زیادہ دیر نہ چل سکے۔

یہ وہ دور تھا جب ایک نیا ملک بنا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب ادیبوں نے اخبارات میں کالم، اداریے، تبصرے لکھے اور عوام کے دکھ درد پر مرحم کا کام کرتے رہے۔ عوام بھی دل کی تشفی اور تسکین کے لیے اخبارات میں کالم بڑے شوق وذوق سے پڑھنے لگے۔ اور اس طرح عوام اور کالم نگاروں کے درمیاں ایک رشتہ استوار ہونے لگا۔ عوام کالم نگاروں کو اپنے جذبات واحساسات کا ترجمان سمجھنے لگے۔ کالم نگار ایک طرف عوام کے جذبات کی ترجمانی کرنے لگا تو دوسری طرف اردو زبان کی خدمت پر بھی مامور ہوا۔ زبان وبیان کے نت نئے تجربات کرنے لگا اور علاقائی زبان کے الفاظ کو اردو زبان میں سمونے لگا۔ اب اردو ہی ایک ایسا واحد سہارا تھا جس سے ملک میں وحدت پیدا کیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ قومی زبان ہے کسی قوم کی وحدت کی نشانی ہوتی ہے۔

قیام پاکستان کے تھوڑے ہی عرصے بعد ملک کے مختلف شہروں سے صحافت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ نئے اخبارات نکلنے شروع ہوئے۔ لاہور سے روزنامہ امروز کا اجراء ہوا۔ راولپنڈی سے نسیم حجازی نے روزنامہ

تعمیر نکالا اور عنایت اللہ نے روز نامہ کوہستان جاری کیا۔ چند سال بعد عنایت اللہ نے ایک نیا اخبار روز نامہ مشرق جاری کیا۔ یہ اپنے طرز کا نیا اخبار تھا۔ مشرق ہی کو پاکستان میں جدید طرز کا پہلا اخبار کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس گٹ اَپ اور پیش کش نے تمام اخبارات کو حسن دھندلا دیا۔ عنایت اللہ نے اپنی صحافتی زندگی کا تمام تر تجربہ مشرق کی نذر کر دیا۔

پاکستان میں اخبارات اور عوام کے درمیان رشتہ قائم کرنے میں ادیبوں کو بڑا ہاتھ ہے۔ ان کے بے لاگ تبصرے اور کالم نے عوام میں سیاسی، معاشی اور سماجی شعور پیدا کیا۔ ادیب کو بات کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ وہ اگر تلخ بات بھی کرتا ہے تو طنز و مزاح کا حربہ استعمال کرتا ہے۔ وہ کسی کی برائی یا خامی بیان کرتا ہے تو میٹھی چٹکی لیتا ہے۔ اس طرح فکاہیہ کالم نگاری نے رواج پکڑا۔ اور جس کا سہرا یقیناً ادیبوں کے سر ہے۔ اگر حالات ناگفتہ بہ ہیں اور جبر کا دور ہے، سیاسی نظر بندیاں ہیں، حقیقت کہنے پر زبان کٹتی ہے تو ادیب نے علامت نگاری سے کام لیا اور اپنے جذبات و احساسات عوام تک پہنچائے۔

ادیب لفظ کا کھلاڑی ہے۔ وہ بے جان لفظوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ پرانے الفاظ میں نئی معنویت پیدا کرتا ہے۔ پرانے اور فرسودہ خیال میں روح پھونک کر تازگی کا احساس بخشتا ہے۔ کالم نگار کا ایک بڑا کارنامہ عوام کو الفاظ سے مانوس کرانے کی روش پیدا کرنا ہے۔ کالم نگار کے لیے ضروری نہیں ہے کہ پورا معاشرہ جب تک بولنے نہ لگے تب تک وہ اس لفظ کو نہ لکھے۔ کالم نگار الفاظ کو نہ صرف متعارف کراتے ہیں بلکہ ان کو مانوس بھی کراتے ہیں۔ دوسری طرف کالم نگار زیادہ تر وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو سماج کا ایک بڑا طبقہ بولتا ہے۔

ادیب اگر اپنی ادبی تخلیقات میں ادق، غیر مانوس، مشکل اور بھاری بھرکم الفاظ یا تراکیب استعمال کرتا ہے تو دوسری طرف صحافتی یا کالم کی زبان میں سادہ اور عام فہم اسلوب اپناتا ہے۔ کیونکہ اُس کے پیشِ نظر اب ادب کا قاری نہیں بلکہ معاشرہ کا ہر فرد ہوتا ہے۔ اس لیے کالم نگار دو طرح سے زبان کی خدمت کر رہا ہوتا ہے۔

صحافتی زبان کے کچھ اپنے اُصول ولوازم ہوتے ہیں۔ اس میں اختصار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ الفاظ

کی تکرار تو ہو سکتی ہے مگر خیالات کی تکرار کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے صحافتی مواد کو کسی اسلوب کے سانچے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ اس کی غرض و غایت صرف اتنی ہوتی ہے کہ قارئین تک کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معلومات اور اطلاعات کو سلاست اور اختصار کے ساتھ پہنچایا جا سکے۔

اسی طرح کالم کی زبان کسی خاص لب و لہجے یا اسلوب کی نہ پابند ہے نہ محتاج۔ اس کے باوجود اگر کوئی کالم نگار ابلاغ کی تمام تر شرائط پوری کرتے ہوئے ایک خاص اسلوب وضع کر پاتا ہے تو یہ اس کی کامیابی ہے ساتھ ہی صحافتی زبان کی ترقی کا ثبوت بھی۔ اس لیے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ کالم نگار ایک طرح زبان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اب ہم اگلے صفحات میں اردو کے چند منتخب ادبی کالم نگاروں کا جائزہ لیتے ہیں جنھوں نے ادبی کالم نگاری کی روایت اور ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ویسے تو اردو کالم نگاری کے ابتداء میں کئی کالم نگاروں کا حصہ ہے۔ لیکن تمام کالم نگاروں کو احاطہ تحریر میں لانا ناممکن ہے۔ اس لیے یہاں پر صرف نمائندہ کالم نگاروں کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ ان نمائندہ کالم نگاروں کو ان کالم نگاروں کا بھی نمائندہ سمجھا جائے جن کو ذکر یہاں نہیں ہوا ہے۔ جن کالم نگاروں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے یہ بنیادی طور پر ادیب تھے اور ان کی وجہ شہرت بھی ادب ہے اس لیے ان کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ہاں چند ایسے کالم نگار بھی سامنے آجائیں گے جو بنیادی طور پر تو ادیب نہیں ہیں لیکن ان کے ہاں ادبی چاشنی اور رنگ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے زورِ قلم اور دلکش انداز بیان سے خشک موضوع کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس لیے ان کو ذکر کرنا ناگریز ہے۔

☆☆☆☆

عبدالماجد دریاآبادی (۱۸۹۲ء۔۱۹۷۷ء):

عبدالماجد دریاآبادی کی کالم نگاری پر بحث سے پہلے ہم ان کے سوانحی خاکہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں تاکہ ان کی کالم نگاری کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

مختصر تعارف

ولدیت: حاجی عبدالقادر

ولادت: ۱۸۹۲ء ،دریاباد ضلع بارہ بنکی وفات: ۶ جنوری ۱۹۷۷ء لکھنؤ

نامور ادیب، سفرنامہ نگار، شاعر، محقق، کالم نگار، مترجم

ادارت: بانی، اخبار ''سچ''، رسالہ ''صدق''۔

کالم نگاری: ہفت روزہ ''سچ'' میں فکاہی کالم لکھتے رہے۔

کتب:

☆ اقبالیاتِ ماجد	☆ اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں	☆ انشائے ماجد	
☆ مضامینِ ماجد	☆ مقالاتِ ماجد	☆ نشریاتِ ماجد	
☆ معاصرین	☆ آپ بیتی	☆ تغزل ماجدی (شاعری)	
☆ نفسیاتِ عوام	☆ سچی باتیں		

اُردو کالم کے ابتدائی دور میں کالم نگاری کو ادب کے ذائقوں سے آشنا کرنے والے اہل قلم میں عبدالماجد دریا آبادی کا نام اور کام بھی لائق تحسین ہے۔ عبدالماجد دریاآبادی نے ۱۹۲۸ء میں ہفتہ روزہ ''سچ'' سے فکاہی کالم نگاری شروع کی اور باوجود مصروفیات کے اس شغل کو زندگی کے آخری دور تک جاری رکھا۔ بقول ڈاکٹر تحسین فراقی:

> ''سچ'' کا آغاز جنوری ۱۹۲۵ء سے ہوا اور اس کے دوسرے ہی نمبر سے ماجد نے اس میں ''سچی باتیں'' کے مستقل کالم کا آغاز کیا، جس کا سلسلہ ان کی وفات سے چند ماہ سے تک جاری''۔(۱۸)

ماجد کے کالموں میں ایک علمی و ادبی فضا چھائی رہتی ہے۔ جو ان کی گہری علمیت کی پروردہ ہے۔ ان کے ادبی

کالموں میں ادبی رجحانات سمیت مختلف علمی، ادبی مباحث کی گونج بھی ملتی ہے۔ مثال کے طور پر تیس کی دہائی میں تہلکہ مچانے والے افسانوی مجموعے انگارے کی شدید مخالفت بھی ان ہی کالموں میں ہوتی رہی ہے۔ ماجد کے کالم ان کے نظریۂ ادب کے پرچاک بھی ہیں۔ چنانچہ عظیم بیگ چغتائی کی قابل اعتراض کتب پر شور خیزی کا معاملہ ہو یا ''انگارے'' کی فحاشی اور سوقیت کے سلسلے میں تائید اندوزی کا محشر خیال کی لبرازم کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کا معاملہ ہو یا یگانہ چنگیزی کے خلاف محاذ آرائی کا یا نیاز فتح پوری کے خلاف صنف بندی کی مہم ماجد ایک باہمت اور ان تھک کالم نویس کی صورت میں اپنا مقدمہ لڑتے ہیں۔ خاص طور پر ادبی محاذ آرائی میں ان کے کالموں میں ادبی اُسلوب کی شان وشوکت در آتی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''ماجد بنیادی طور پر ایک ادیب تھے اور ادیب بھی ایسے جن کا ایک اپنا منفرد اور ناقابل تقلید اسلوب تھا انھوں نے ہر جگہ اس اسلوب کا جادو جگایا ہے''۔(۱۹)

مولانا عبدالماجد کے کالم میں علمی وادبی اسلوب کے ساتھ ایک ہلکی پھلکی خیال آرائی بھی ملتی ہے۔ ان کے ہاں طنز شدت کے ساتھ سامنے نہیں آتا۔ بلکہ وہ ہلکے پھلکے انداز میں چبھتا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر ان کے کالموں میں مزاح کی کمی ہے وہ اپنے لمحۂ موجود سے مطمئن نہیں، تاہم وہ اپنے طنزیہ کالموں میں تہذیب وشائستگی کا دامن تھامے رکھتے ہیں۔ ان کے کالم علمی، ادبی اور ہند اسلامی تہذیب کے ترجمان ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری اان کے کالموں کا تنقیدی جائزہ یوں لیتے ہیں:

> ''(ماجد) عام فہم اور سادہ انداز میں وہ کہہ دیتے ہیں۔ جو حق ہوتا ہے۔ حق کا اظہار ہی ان کا موضوع ہے مولانا کے کالموں میں تشبیہات، استعارات، مجاز و کنایہ اور مناسبات وغیرہ نہیں ہیں۔ ان کے طنز کا بنیادی حربہ ''موازانہ'' ہے''۔(۲۰)

موازنے کے ساتھ ساتھ ماجد کے کالموں میں لفظوں کے ظریفانہ استعمال کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ وہ ایک صاحب

آسلوب ادیب اور کالم نگار تھے۔جس کی جھلک ان کے انداز تحریر میں بخوبی نظر آتی ہے۔مثال کے طور پر ان کے قلم سے نکلا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں نے اودھ کی حکومت پر گہرا طنز کیا ہے:

''ملکہ گرمیوں میں خامہ نوش کرنے سے قبل مربوں اور محلول موتیوں کا شربت استعمال کرتی تھیں۔ ملکہ کا خامہ محل سرا میں نہایت ہوشیار اور واقف کار مامائیں تیار کرتی تھیں اور بادشاہ کا خاصہ ان کے خاص رکاب داد باہر کے باورچی خانوں میں تیار کرتے تھے۔ جب باشاہ ملکہ کے ساتھ خامہ نوش کرنے کو تشریف لاتے تھے۔ تو شہنائی نواز شہنائی بجاتے تھے۔ بادشاہ کا کھانا نقرئی کشتیوں سفینوں میں آتا تھا۔۔۔۔ یہ سامان مکہ معظمہ کی زندگی کے ہیں؟ کوئی ملکہ روئے زمین تھیں؟ مکہ ہفتہ اقلم تھیں؟ نہ سہی ملکہ ہند تھیں؟ صرف ملکہ اودھ کا اطلاق بھی اس وقت سمٹ سمٹا کر لکھنؤ اور گردونواح کے چند اضلاع تک رہ گیا تھا''۔(۲۱)

ماجد اپنے کالموں میں موقع محل کے مطابق اشعار کا برجستہ استعمال کرتے ہیں۔اسی طرح ان کے کالموں کے عنوان بھی کسی مصرعے پر مبنی ہوتے ہیں۔جن سے ان کے کالموں کی ادبی فضا مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔ ماجد کا اسلوب ان کی انفرادیت اور ان کی علمی شخصیت اور احساس کا پرتو ہے۔ان کے انداز تحریر کے بارے میں ڈاکٹر تحسین فراقی لکھتے ہیں:

''ماجد نے جس زمانے میں اپنے ادبی کیریر کا آغاز کیا۔متحدہ ہندوستان میں دو اکابر اپنے اسلوب کا سکہ بٹھا چکے تھے یا کم از کم بٹھا رہے تھے۔ ماجد کی شخصیت کی انفرادیت نے ان دونوں حضرات یعنی ابوالکلام اور اقبال سے اثرات ضرور قبول کیے لیکن ان کا ضمیمہ کبھی نہ بنے۔ان کے اسلوب پر ان کی اپنی متنوع، علمی اور ادبی شخصیت کی چھاپ ہے۔ وہ اپنے اسلوب کے بانی بھی خود ہیں اور خاتم بھی خود''۔(۲۲)

☆☆☆☆

عبدالمجید سالک (۱۸۹۴ء۔۱۹۵۹ء):

مختصر تعارف

ولدیت: غلام قادر

ولادت: ۱۲ ستمبر ۱۸۹۴ء پٹھان کوٹ وفات: ۲۷۔ستمبر ۱۹۵۹ء، لاہور

نامور صحافی، شاعر و ادیب، افسانہ نگار، خاکہ نگار و مزاح نگار، مترجم،

ادارت: بانی مدیر روزنامہ ''انقلاب'' لاہور (۴۸۔۱۹۲۷ء)

کتب: ☆ راہ و رسم منزلہا (شعری مجموعہ) ☆ ذکر اقبال ☆ سرگزشت (خودنوشت)

ادبی کالم کے ابتدائی دور کے اہم کالم نگاروں میں عبدالمجید سالک کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔قدرت نے آپ کو بے پناہ اور ہمہ جہت صلاحیتوں سے نوازا تھا۔آپ نے صحافت وادب کے میدان میں اپنی ان تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا۔ خاص طور پر کالم نگاری کے لیے جس صلاحیت و قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔وہ صلاحیتیں ان میں موجود تھیں۔

اُنھوں نے اپنے قلمی سفر کا آغاز شعروشاعری سے کیا۔ادب وانشا میں ان کی تربیت سید مولوی ممتاز نے کی تھی۔مولوی ممتاز علی سرسید تحریک کے پیروکار تھے۔سالک ۱۹۱۵ء میں ان کے دو ہفتہ وار رسالوں ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' کے مدیر مقرر ہوئے۔اپنے دور کے تاریخی اخبار ''زمیندار'' نے سالک کی ادبی وصحافتی زندگی کو خوب ترقی سے نوازا۔یکم اپریل ۱۹۲۰ء کو مولانا سالک ''زمیندار'' سے وابستہ ہوئے۔پروفیسر ڈاکٹر ظفر سعید سلیفی اس تناظر میں لکھتے ہیں:

> ''ہماری قومی اور ملی تاریخ میں صحافت اور خصوصاً اُردو صحافت نے جو دردمند اور مخلص صحافی ورہنما ہمیں عطا کیے۔ان میں مولانا عبدالمجید سالک کا نام بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔یہ اس دور میں ہماری قومی جدوجہد اور صحافتی زندگی میں داخل ہوئے تھے۔جب مسلمانان برعظم کی سیاسی تحریکات اردو صحافت کے

زیر اثر کامیابی کی جانب گامزن تھیں۔ مولانا سالک نہ صرف ادارتی صرف ذمہ داریاں سنبھالتے رہے بلکہ مزاحیہ کالم نگاری بھی شروع کی اور ''افکار وحوادث'' کے زیر عنوان وہ کالم لکھتے رہے جو اردو صحافت کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں''۔(۲۳)

مولانا سالک کی تربیت مولانا ظفر علی خان کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ یکم اپریل ۱۹۲۰ء کو وہ ''زمیندار'' سے وابستہ ہوئے اس تاریخی اخبار کی ایک وجہ شہرت تو مولانا ظفر علی خان کی طنزیہ شاعری تھی۔ دوسری ''افکار وحوادث'' کے عنوان سے کالم کا اجراء تھا۔ اس کالم کا عنوان ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' سے مستعار تھا۔ اس میں مولانا غلام رسول مہر بھی کبھی کبھی کالم لکھتے رہے۔ جب یہ کالم مولانا سالک کے حصے میں آیا تو انھوں نے اسے مستقل حیثیت دی اور شہرتِ دوام کے اعلیٰ مرتبے پر پہنچایا۔(۲۴)

اس کالم کی مقبولیت نے اُردو صحافت میں فکاہیہ اور ادبی کالم نگاری کے ایک مستقل گوشے کی بنیاد رکھی۔

۱۹۲۷ء میں سالک نے اپنا اخبار ''انقلاب'' نکالا تو اپنا مشہور اور مستقل کالم بھی انقلاب میں لے آئے۔ مولانا اس کالم کو مستقلاً لکھتے رہے مولانا کے منفرد ادبی اُسلوب اور صحافتی بصیرت نے اسے قارئین کے ایک وسیع حلقے میں متعارف کرایا۔ یہ کالم ادبی لطافت اور سیاسی وسماجی زندگی کی ناہمواریوں پر طنز ومزاح کا ایک مرقع تھا جس میں مضمون آفرینی اور زبان وبیان کی چاشنی قاری کو مسحور کیے رکھتی تھی۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> ''افکار وحوادث'' کے کالم کا اجراء اردو صحافت میں طنز ومزاح کی شاہراہ پر اہم سنگ میل سمجھنا چاہیے۔ طنز ومزاح کے سلسلے میں مولانا سالک کو جو مقام امتیاز حاصل ہے ان کی نگاہ دور بین اشیاء اور واقعات کے مضحکہ پہلوؤں تک نسبتاً آسانی سے جا پہنچتی ہے چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ وہ بالعموم واقعات ہی سے طنز ومزاح کے لیے سامان فراہم کرتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ نہ صرف کسی خاص

واقعہ کا چھپا ہو مضحک پہلو ہی دکھاتے ہیں بلکہ اس کا تقابل ایسے مضحک واقعات یا اشیاء سے بھی کر جاتے ہیں کہ اس کی سنجیدگی بڑی حد تک انحطاط پذیر ہو جاتی ہے''۔(۲۵)

سالک سے پہلے طنز و مزاح کے نام پر عامیانہ انداز، پھکڑ پن، ذاتیات اور غیر شائستہ انداز تخاطب رائج تھا۔ سالک نے طنز و مزاح کو ادبی اُسلوب کے ساتھ ساتھ شائستگی کے دائرے میں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالموں کی تر و تازگی اور شگفتگی وقت گزرنے کے باوجود بھی برقرار ہے۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال کو جب ''سر'' کا خطاب ملا تو سالک نے اس موقع پر یہ دلچسپ کالم لکھا۔

''جب میاں محمد شفیع کو ''سر'' کا خطاب ملا تو کسی قومی اخبار نے ایک لفظ تک نہ لکھا لیکن حضرت علامہ اقبال کے ''سر'' ہو جانے پر تمام دنیائے ادب و سیاست میں تہلکہ مچ رہا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ میاں محمد شفیع کو قوم اپنا نہیں سمجھتی ۔لیکن اقبال ہمارا اپنا قوم کی آنکھوں کا تارا اگر ہم سے چھن جائے اور حکومت ایک دو حرفی لفظ دکھا کر اسے مولے تو وہ یقیناً ماتم کا مقام ہے۔۔۔۔اگر آج سے ۱۵ سال قبل یہی ''سر'' کا خطاب آپ کو دیا جاتا تو وہ ہم مزید تہنیت پیش کرنے میں سب سے پیش پیش ہوتے۔ لیکن جب حکومت برطانیہ کے ہاتھوں جزیرۂ عرب کی مقدس سرزمین کی بے حرمتی ہو چکی۔ خلافت مقدسۂ اسلامیہ کو انگلستان کے ہاتھوں فتنۂ تا تار سے زیادہ ہولناک حوادث پیش آئے اور اب تک کرزن چاہتا ہے کہ ایک دفعہ ہندوستان اور اسلام کو پھر لا کر میدان جدال و قتال میں کھڑا کر دے تو ہم اقبال کی برطانوی ''عزت افزائی'' پر کیا خوش ہوں اور اب اگر اقبال سر ہوتے تو کیا ہوتے۔

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی

پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا

اقبال ''سر'' کے دو حرفی اعزاز پر قناعت کر گئے حالانکہ ہم انھیں کسی عظیم اسلامی

سلطنت کی وزارت عظمیٰ پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے''۔(۲۶)

سالک کے کالموں کی زبان سادہ اور آسان فہم ہے۔ وہ اپنی تحریر کو مشکل الفاظ کی شعوری کوشش سے نہیں سجاتے بلکہ الفاظ وتراکیب رواں دواں لہجے کی تشکیل کرتے ہوئے آمد کی سی کیفیت کے ساتھ آتے چلے جاتے ہیں۔ بے تکلفی، تصنع اور بناوٹ سے پاک انداز تحریر سے وہ قاری کو اپنے گرفت میں لیتے ہیں۔ ان کے کالم ادب اور صحافت کا حسین امتزاج ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریر کو صحافتی عیوب سے بچایا ہے۔''افکار وحوارث'' کے کالم بے ساختگی اور برجستگی کی عمدہ مثال ہیں۔ مولانا سالک موقع بہ موقع برجستہ محاورات ضرب الامثال اور تشبیہات واستعارات کا بھی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ ظرافت سے نوازتے ہیں۔ ان کے ہاں محض مضامین ہی شگفتہ اور پرلطف نہیں ہوتے بلکہ زبان کا حسن بھی موجود ہوتا ہے۔ مثال کے لیے ان کے کالم سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''بیوی صوفیوں کے ہتھے چڑھ گئی اور شوہر صاحب ایڈیٹروں اور لیڈروں کے سر

ہو رہے ہیں۔ کمہار پر تو بس نہ چلا گدھیا کے کان اینٹھنے لگے۔ کرے ڈاڑھی والا

پکڑا جائے مونچھوں والا''۔(۲۷)

سالک کالم کے مزاج کو بخوبی سمجھا ہے۔ ان کے کالموں میں بات سے بات نکلتی ہے اور یوں پہلو بہ پہلو طنز وظرافت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان کے کالم اس مقصدیت کے علم بردار ہوتے ہیں کہ معاشرے میں سدھار آئے لیکن مقصدیت کے آگے وہ ادبیت کے کے تقاضوں کو قربان نہیں کرتے تاہم کبھی کبھی وہ طنز شدید کی رو میں بہہ نکلتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر ظفر عالم:

''سالک اپنی زبان اور قلم دونوں کو نازیبا کلمات سے بچائے رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن چند موقعوں پر انھوں نے بھی اپنے دامن کو آلودہ کیا ہے۔ اگرچہ ایسے مواقع بہت کم ہیں۔ تاہم ہیں ضرور۔۔ اس طرح کی چند شخصی طنزیات کو چھوڑ کر سالک کے کالم تلخ و شیریں، کھٹ میٹھے، کبھی لطیف کبھی شریر کہیں ہلکی ہلکی چبھن، کہیں مٹھاس، اصلاح کی حد درجہ سنجیدگی بلند قہقہے، طنز میں شائستگی اور مزاح میں شگفتگی، زبان صاف ستھری اور سادہ انھی خصوصیات کے مجموعے کا نام مولانا عبدالمجید سالک اور ان کا کالم ''افکار و حوادث'' ہے''۔ (۲۸)

☆☆☆☆☆

حاجی لق لق (۱۸۹۴ء۔۱۹۶۱ء)

مختصر تعارف

اصل نام: ابوالعلاء عطاء محمد چشتی ولدیت: بندو علی

ولادت: ۱۴۔ستمبر ۱۸۹۴ء پٹی مغلاں، لاہور وفات: ۲۶۔ستمبر ۱۹۶۱ء، لاہور

صحافی، ممتاز شاعر، افسانہ نگار،

کالم نگاری: روزنامہ ''احسان''، اور ''زمیندار'' لاہور میں فکاہیات کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔

شعری کتب: ☆ منقار لق لق (۱۹۴۷ء) ☆ پرواز لق لق ☆ ماڈرن غزلیں

نثری کتب: ☆ اردو کی پہلی کتاب (۱۹۴۶ء) ☆ جناح اور پاکستان ☆ مضامین لق لق

☆ تقدیر کشمیر (۱۹۵۰ء) ☆ آدم اللغات (۱۹۵۱ء)

☆ حاجی لق لق کے افسانے ☆ حاجی لق لق کی درانتی

حاجی لق لق نے فکاہیہ کالم اور ظریفانہ شاعری میں خوب نام پیدا کیا۔ابوالعلا چشتی کو بچپن ہی سے شعروادب سے مناسبت تھی۔اگر چہ آپ نے مڈل تک تعلیم حاصل کی تاہم ذاتی لیاقت اور محنت کے بل بوتے پر ادبی کالم نگاری میں ایک مستند قلم کار کی حیثیت سے منفرد شناخت بنائی۔ان کی تخلیقی اور ذہنی صلاحیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے قلمی نام'' حاجی لق لق'' کا انتخاب عراق میں ملازمت کے دوران ایک پرندے ''لق لق'' کو دیکھ کر کیا۔دراصل یہ ایک سیلانی پرندہ ہے۔ابوالعلا چشتی اس پرندے کی عادات وخصائل سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس کا نام اپنا لیا۔حاجی لق لق کے زیادہ تر کالم روزنامہ ''زمیندار'' میں'' فکاہات'' کے عنوان سے شائع ہوتے رہے۔تاہم اُنھوں نے'' احسان'' اور'' شہباز'' میں'' نوائے وقت''،'' شیرازہ'' اور'' نمکدان'' میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنے قلم کا سکہ جمایا۔لق لق نے عوامی دلچسپی کے موضوعات کو اپنے مخصوص مزاحیہ اندازِ بیان کے ذریعے برتا۔فکر تونسوی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مفہوم تو ان کے کالم کی زیریں تہوں میں ہوتا تھا جس میں وہ ایسی ایسی چٹکیاں لیتے تھے کہ وہ عربی کے عالم کم فوجی اس سے بھی کم (کیوں کہ فوجی سروس میں بھی

دنیا جہاں کے سیادت نوردرہ چکے تھے۔) مگر عوام پسندانہ سب سے زیادہ معلوم
ہوتے تھے۔ مزاحیہ نظم ونثر دونوں پر عبور کامل رکھتے تھے۔ لوگ صبح اخبار میں پہلے
ان کا کالم پڑھتے تھے‘‘۔(۲۹)

حاجی لق لق کو قدرت کی طرف سے مزاح کی حس ملی تھی۔ ان کے ہاں صورتِ واقعہ کا مزاح فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ برتنے کا سلیقہ ملتا ہے۔

انھوں نے اپنے کالموں کے ذریعے ادبی طرز بیان لبادے میں سیاست وسماج کے تضادات کو ظریفانہ ہنرکاری کے ساتھ نمایاں کیا ہے ان کی تحریر میں چٹکلوں اور لطیفوں کے ذریعے اپنے ہدف کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ ذیل میں ان کے کالم سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

’’لیجیے صاحب آپ اُردو اور بنگالی کو روتے تھے۔ جمیعتہ اخوان المسلمین سلہٹ
(مشرقی بنگال) نے یہ جھگڑا ہی مٹا دیا ہے۔ انھوں نے قرارداد منظور کی ہے کہ
پاکستان کی اسلامی مملکت کی سرکاری زبان عربی ہو۔ آپ کہیں گے کہ جب تک
باشندگان پاکستان کو عربی زبان پر عبور حاصل نہ ہو۔ پاکستان کی سرکاری زبان
عربی کیسے ہوسکتی ہے؟ جواباً گزارش ہے کہ مسلمان عربی زبان میں کام چلا لیا
کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ہمارا اخبار نویس قاہرہ کی سیر کے لیے رات کے وقت
اکیلا نکلا۔ ایک بازار میں اس نے ایک کوٹھے پر جانا چاہا۔ راستہ معلوم نہ تھا اس
لیے اس نے با آواز بلند سے کہا۔ ’’اهدنا الصراط المستقیم‘‘ بدرقہ اسے کوٹھے
پر لے گیا اور اس کی مشکل حل ہوگئی‘‘۔(۳۰)

حاجی لق لق کے کالم تخیلِ پرواز، باریک بینی، سماج شناسی اور جملہ سازی کے پُرتبسم نمونے ہیں۔ ان کی زبان اپنی سادگی اور بے ساختگی کی وجہ سے ہر طرح کے لفظی ومعنوی الہام سے پاک ہے۔ وہ کم سے کم لفظوں اور جملوں میں زیادہ سے زیادہ معنویت پیدا کرنے پر بھی قادر تھے۔ زور بیان کے لیے لطائف وحکایات کا بھی سہارا لیتے تھے۔ لیکن انداز بیان ایسا کہ وہ بھرتی اور خانہ پری کے طور پر محسوس نہ ہوتے بلکہ لق لق زرخیز ذہن کی پیداوار کی صورت میں کالم کی فضا کو ایک شگفتگی عطا کرتے۔

مولانا غلام رسول مہر (۱۸۹۵ء۔۱۹۷۱ء)

مختصر تعارف:

ولدیت:	چودھری محمد علی خان
ولادت:	۱۵۔اپریل ۱۸۹۵ء، پھول پور ضلع جالندھر وفات: ۱۶۔نومبر ۱۹۷۱ء لاہور
	نامور صحافی، ادیب، مورخ، محقق، شارح اقبال و غالب،
ادارت:	بانی روزنامہ ''انقلاب'' لاہور (۴۹۔۱۹۲۷ء)
	روزنامہ ''زمیندار'' سے ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۷ء وابستہ رہے۔
شرحیں:	☆ نوائے سروش (غالب) ☆ مطالب بال جبریل ☆ اسرار و رموز
	☆ بانگ درا ☆ ضرب کلیم
دیگر کتب:	☆ تاریخ سندھ ☆ سیرت ابن تیمیہ ☆ سید احمد شہید
	☆ رسول رحمت ﷺ
اردو ترجمہ:	انسائیکلو پیڈیا یا تاریخ عالم

مولانا غلام رسول مہر کا شمار اردو کے ان چند صحافیوں میں ہوتا ہے جو ابتداء میں صرف اخبار کے مدیر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ مولانا مہر ۱۹۰۱ء میں بغرض تعلیم لاہور آئے تو لاہور سیاسی ہنگاموں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ علامہ اقبال کی نظموں اور ظفر علی خان کے ''زمیندار'' نے مسلم نوجوان کے دنوں میں ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ تعلیمی زندگی کے آخری برسوں میں مولانا مہر ''الہلال'' کا مطالعہ بھی کرنے لگے۔ انھی اثرات کے باعث ان کا دل سرکاری ملازمت سے نفور ہو گیا اور مولانا مہر نے اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن چونکہ یہ زمانۂ جنگ تھا اور اس زمانے میں اخبار کے اجرا میں بہت دشواریاں حائل تھیں لہٰذا وہ حیدر آباد دکن چلے گئے۔ اور ملازمت اختیار کر لی۔ مولانا نے یہاں سے بھی اپنا اخبار جاری کرنے کی کوشش کی جس کا نام بھی تجویز کر لیا گیا۔ لیکن ''سلطنت'' کے اجرا کا منصوبہ ابھی تشنۂ تکمیل تھا کہ انھیں حیدر آباد دکن چھوڑ کر جالندھر آنا پڑا۔ یہاں کچھ عرصہ مجلسِ خلافت کی مصروفیتوں میں گزرا۔ انھی دنوں اپنے ایک دوست پروفیسر عبدالقادر کے توسط سے مولانا مہر کو روزنامہ ''زمیندار'' میں کام کرنے کا موقع میسر آیا۔ اس زمانے میں چونکہ مولانا ظفر علی خان، اختر علی خان اور عبدالمجید سالک قیدِ فرنگ میں تھے، لہٰذا اداریہ نویسی کا مشکل کام مولانا مہر کے سپرد

ہوا جسے مہر وسالک کو ''زمیندار'' سے الگ ہونا پڑا اور انھوں نے دوستوں کے تعاون سے روزنامہ ''انقلاب'' جاری کیا۔ جس کا پہلا پرچہ ۲۔ اپریل ۱۹۲۷ء کو منظرِ عام پر آیا۔ (۳۱)

مولانا غلام رسول مہرؔ کی صحافی زندگی کا پہلا دور تقریباً نو سال پر محیط ہے۔ اس زمانے میں انھوں نے دو اخباروں یعنی ''زمیندار'' اور ''انقلاب'' میں ادارتی کالم لکھے۔ دونوں اخبارات سے تعلق کے زمانے میں مولانا مہر کی سیاسی فکر میں ایک تسلسل نظر آتا ہے۔ مثلاً روزنامہ زمیندار میں رہتے ہوئے بھی مولانا مہر کانگریسی ذہن رکھتے تھے، لیکن مولانا مہر کی کانگریس کے ساتھ ہمدردی، مسلمانوں کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی تحفظات کی ضمانت سے مشروط تھی اور اسے مولانا اصطلاحاً ''تصفیہ حقوق'' کا نام دیتے تھے۔ یہی پالیسی ''انقلاب'' میں بھی جاری رہی۔ (۳۲) انقلاب کی سیاسی پالیسی میں اس تبدیلی کی وجہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں:

> ''ہم ترکِ موالات کے آغاز سے لے کر ۱۹۲۸ء تک مسلسل ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپیلیں کرتے رہے، لیکن جب نہرو رپورٹ کے سلسلے میں گاندھی جی کی معاندانہ روش ہمارے سامنے آئی اور یہ ثابت ہوا کہ گاندھی جی ہندو راج کے سامنے پوری ملتِ اسلامیہ کے اختلافات کو بھی قابلِ توجہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو پھر پہلی مرتبہ یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ کانگریس قطعاً نیشنل جماعت نہیں بلکہ محض ایک ہندو جماعت ہے۔ یہ پہلا دن تھا کہ ہم نے کانگریس کی مخالفت شروع کی۔'' (۳۳)

غلام رسول مہر کے کالموں اور اداریوں میں ادبیت کی شان ہے۔ جو سرسید اور ابوالکلام آزاد کے ہاں ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''انھوں (غلام رسول مہر) نے صحافت میں ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خان کی ادبیت کو زندہ رکھا اور اس کے ساتھ سرسید کی حقائق پسندی کو رواج دے کر اداریہ نویسی کی ایک نئی روایت قائم کی۔'' (۳۴)

مولانا مہر کے کالم سادہ اور منطقی ہونے کے باوجود موثر ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف وہی بات لکھتے جس پر ان کو یقین ہوتا۔ چنانچہ خلوص کے ساتھ کہی ہوئی بات ہمیشہ موثر ہوتی ہے، خواہ وہ کسی بھی انداز میں کہی جائے اور یہی کسی تحریر کی ادبی حیثیت ہوتی ہے۔ جو ہمیں غلام رسول مہر کے ہاں نمایاں طور پر ملتی ہے۔

☆☆☆☆

وقار انبالوی (۱۸۹۲ء۔۱۹۸۸ء)

مختصر تعارف:

اصل نام: ناظم علی

ولادت: ۲۲۔جون ۱۸۹۶ء وفات: ۲۶۔جون ۱۹۸۸ء

ممتاز صحافی، اردو شاعر و ادیب، افسانہ نگار و کالم نگار اعزاز: تمغۂ امتیاز (۱۹۸۴ء)

ادارت: ☆ روزنامہ ''احسان'' لاہور (۴۶۔۱۹۳۹ء)

☆ روزنامہ ''سفینہ'' لاہور (۴۹۔۱۹۴۷ء)

☆ روزنامہ ''آفاق'' لاہور (۵۶۔۱۹۵۲ء)

کالم نویسی: نوائے وقت کے قطعہ نگار و کالم نگار سر راہے (۸۸۔۱۹۵۶ء)

کتب: ☆ آہنگ رزم (قومی نظمیں، ۱۹۳۵ء) ☆ زبانِ حال (نظمیں۔۱۹۴۸ء)

☆ دیہاتی افسانے ☆ بیان حال

وقار انبالوی نے اپنی صحافی زندگی کا آغاز ۱۹۱۹ء میں روزنامہ ''پرتاپ'' لاہور سے کیا۔۱۹۲۳ء میں وہ روزنامہ ''ملاپ'' سے وابستہ ہوگئے۔ جب کہ ۱۹۲۸ء میں وہ روزنامہ ''ملاپ'' کو چھوڑ کو ''ویر بھارت'' کے ساتھ منسلک ہوگئے۔۱۹۳۴ء میں روزنامہ ''زمیندار'' کے ساتھ وابستہ ہوگئے اور یہاں انھوں نے فکاہات کا کالم لکھنا شروع کیا۔ لاہور سے ملک نور الٰہی نے اپنا اخبار ''احسان'' جاری کیا تو انھوں نے ۱۹۳۹ء میں اس کی ولادت سنبھال لی۔ (۳۵)

لاہور میں روزنامہ ''احسان''، مسلم لیگ کی پہلی موثر آواز ثابت ہوئی۔ مسلم لیگ پر ہندو اخبارات کے حملوں کے جواب دینے کے لیے انھوں نے اپنا زورِ قلم صرف کیا اور اس دوران انھوں نے ہندوؤں کے متعلق ایسی ایسی تشبیہات اور محاروے تخلیق کیے کہ وہ عوام کی زبان پر چڑھ گئے اور اس وقت کے معاشرے کے روزمرہ کا حصہ بن گئے۔

ان کا یہی علمی، ادبی اور صحافتی پس منظر تھا جس کی وجہ سے ان کے کالم ''سر راہے'' اور ''قطعے'' نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ صحافت کے ایک اُستاد ان کی کالم نویسی کے متعلق لکھتے ہیں:

''وقار انبالوی اپنے کالم ''سرراہے'' میں زیادہ تر سیاسی امور و معاملات پر
قلم اٹھاتے ہیں۔مختلف واقعات بیان کر کے اور شعر چست کر کے
طنز و مزاح کا سامان کرتے ہیں۔ان کی تحریر میں ۴۱ سالہ صحافتی تجربے
تاریخ، سیاست، ثقافت اور معاشرت کے وسیع مطالعے کا رنگ موجود
ہے''۔ (۳۶)

وقار انبالوی کے کالموں کا اندازِ بیان دلچسپ ہے۔ان کے ہاں ادبیت بھی ہے۔ان کے ایک فکاہیہ کالم میں طنز کا جس قدر بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

''جالندھر سے شائع ہونے والا اخبار ''ہندسمی چار'' سکھوں کی تحریک کے دباؤ
سے اعصابی تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہے۔اپنی ایک حالیہ اشاعت میں اس نے یہ
بے پر کی اڑائی ہے کہ ریگن انتظامیہ نے سارا کشمیر صدر ضیا الحق کو تحفے میں دے
دیا ہے۔بقائمی ہوش و حواش تو کوئی آدمی اس قسم کی بات نہیں کرتا تھا لیکن غالباً
بھارتی پرشوں کے اس نئے خیال کی تائید میں کہ ''کشمیر'' کا مسئلہ اگر ہے تو
صرف اتنا ہے کہ پاکستان آزاد کشمیر میں امریکہ کی ٹاسک فورس مقرر کر
رہا ہے''۔ (۳۷)

وقار انبالوی محض اخبار نویس نہیں تھے۔وہ اعلیٰ درجہ کے شاعر، زبان دان اور سخن فہم تھے۔اس کے علاوہ اسلام، ہندو مذہب اور ہندوستان کی تاریخ اور ثقافت کے متعلق ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ان کی تحریروں میں ہمیں علمی اور تاریخی معلومات بھی ملتی ہیں اور زبان کے کمالات بھی۔انھیں اُردو، فارسی، ہندی اور سنسکرت پر عبور تھا۔اس لیے ان کے کالموں میں ان زبانوں کے شعر یا ان کا مفہوم بھی ملتا ہے۔

☆☆☆☆

شوکت تھانوی (۱۹۰۴ء-۱۹۶۳ء):

مختصر تعارف:

اصل نام: محمد عمر ولدیت: منشی صدیق احمد

ولادت: ۳-فروری۱۹۰۴ء ، بندرابن ضلع متھرا وفات: ۴،مئی۱۹۶۳ء، لاہور

ممتاز ادیب، مزاح نگار، شاعر، صحافی ، ناول نگار

ادارت: ☆ روزنامہ ''اودھ پنچ'' ☆ روزنامہ ''جنگ'' کراچی۔راولپنڈی

کالم نگاری: روزنامہ ''ہمدم''، ''حق و باطل''۔

اعزاز: تمغۂ امتیاز

کتب: ☆ موج تبسم ☆ بحر تبسم ☆ سیلاب تبسم
☆ بار خاطر ☆ دنیائے تبسم ☆ مابدولت (خود نوشت)
☆ قاعدہ بے قاعدہ ☆ شیش محل (خاکے) ☆ گہرستان (شعری مجموعہ)

شوکت تھانوی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت تھے۔ انھوں نے لگ بھگ ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ کالم نگاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے ناول لکھے، ڈرامے لکھے، خاکہ نگاری کی، شاعری کی۔

شوکت تھانوی بنیادی طور پر ایک اعلیٰ پائے کے مزاح نگار تھے۔ اُنھوں نے ۴۰ سال سے زیادہ عرصہ تک کئی اخبارات و رسائل میں مزاحیہ کالم نگاری کی۔ سکول کے زمانے میں ہی جب ابھی وہ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ انھوں نے قلمی رسالہ نکالا۔ ۱۹۲۵ء میں وہ رسالہ ''حسن ادب'' لکھنو کے ایڈیٹر بنے۔ جب ۱۹۲۸ء میں لکھنو سے ہفت روزہ ''تحریک'' جاری ہوا۔ شوکت تھانوی اس کا فکاہی کالم ''لالہ زار'' لکھتے تھے۔ تاہم تھوڑے عرصے بعد وہ ''ہمدم'' لکھنو سے منسلک ہوئے۔ ظریفانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر اس کا مزاحیہ کالم ''اور دو باتیں'' لکھنے لگے۔ جب طنز و مزاح کی صحافتی روایت کا اہم اخبار ہفتہ وار ''سرپنچ'' ۱۹۳۱ء میں لکھنؤ سے نکالا۔ تو شوکت تھانوی کو اس کا ایڈیٹر مقرر کر کے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا۔ اس اخبار کے ذریعہ شوکت تھانوی نے کمال مہارت سے ادبی ظرافت کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس اخبار میں ان کے کالم، اداریے،

شوکت تھانوی (۱۹۰۴ء۔۱۹۶۳ء):

مختصر تعارف:

اصل نام: محمد عمر   ولدیت: منشی صدیق احمد

ولادت: ۳۔فروری ۱۹۰۴ء ، بندرابن ضلع متھرا   وفات: ۴، مئی ۱۹۶۳ء، لاہور

ممتاز ادیب، مزاح نگار، شاعر، صحافی، ناول نگار

ادارت: ☆ روزنامہ ''اودھ پنچ'' ☆ روزنامہ ''جنگ'' کراچی۔راولپنڈی

کالم نگاری: روزنامہ ''ہمدم''، ''حق و باطل''۔

اعزاز: تمغۂ امتیاز

کتب: ☆ موج تبسم ☆ بحر تبسم ☆ سیلاب تبسم

☆ بار خاطر ☆ دنیائے تبسم ☆ مابدولت (خودنوشت)

☆ قاعدہ بے قاعدہ ☆ شیش محل (خاکے) ☆ گہرستان (شعری مجموعہ)

شوکت تھانوی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت تھے۔انھوں نے لگ بھگ ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔کالم نگاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے ناول لکھے، ڈرامے لکھے، خاکہ نگاری کی، شاعری کی۔

شوکت تھانوی بنیادی طور پر ایک اعلیٰ پائے کے مزاح نگار تھے۔اُنھوں نے ۴۰ سال سے زیادہ عرصہ تک کئی اخبارات ورسائل میں مزاحیہ کالم نگاری کی۔سکول کے زمانے میں ہی جب ابھی وہ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔انھوں نے قلمی رسالہ نکالا۔۱۹۲۵ء میں وہ رسالہ ''حسن ادب'' لکھنو کے ایڈیٹر بنے۔جب ۱۹۲۸ء میں لکھنو سے ہفت روزہ ''تحریک'' جاری ہوا۔شوکت تھانوی اس کا فکاہی کالم ''لالہ زار'' لکھتے تھے۔تاہم تھوڑے عرصے بعد وہ ''ہمدم'' لکھنو سے منسلک ہوئے۔ظریفانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر اس کا مزاحیہ کالم ''اوردوباتیں'' لکھنے لگے۔جب طنزومزاح کی صحافتی روایت کا اہم اخبار ہفتہ وار ''سرپنچ'' ۱۹۳۱ء میں لکھنؤ سے نکالا۔تو شوکت تھانوی کو اس کا ایڈیٹر مقرر کر کے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا۔اس اخبار کے ذریعہ شوکت تھانوی نے کمال مہارت سے ادبی ظرافت کی روایت کو آگے بڑھایا۔اس اخبار میں ان کے کالم، اداریے،

تبصرے، مزاحیہ ناول، افسانے اور مضامین ہوتے تھے۔ تقسیم ہند سے قبل وہ لکھنو کے ''اودھ'' اخبار، روزنامہ ''ہند'' اور ''حق'' سے وابستہ رہے۔ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے اپنا ذاتی اخبار ''طوفان'' نکالا جو ایک سال تک چھپتا رہا۔ تقسیم ہند سے ذرا پہلے وہ لاہور آئے اور یہاں مجید لاہوری کی وفات کے بعد روزنامہ ''جنگ'' میں ''حرف وحکایت'' لکھنے لگے۔ ''جنگ'' میں ان کا کالم ''وغیرہ وغیرہ'' کے عنوان سے چھپتا تھا۔ جب دارلحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوا تو ''جنگ'' بھی راولپنڈی سے نکلنے لگا۔ شوکت تھانوی پنڈی آئے اور یہاں اپنا کالم ''پہاڑ تلے'' کا آغاز کیا۔ شوکت تھانوی کے کالموں میں ایک نوع کی ادبی چاشنی پائی جاتی ہے۔ ان کے موضوعات روایتی نہیں ہیں۔ بلکہ نئے اور غیر محدود ہیں۔ زندگی کے مسائل کو وہ ادبی اسلوب کے طنز ومزاح میں اس کے کمال مہارت سے پیش کرتے ہیں کہ طنز ومزاح کی تلخی محسوس نہیں ہوتی۔ بقول ڈاکٹر ظفر عالم ظفری:

> ''ان کا کوئی مخصوص موضوع نہیں ہے۔ سیاسی، سماجی، آفاقی اور علاقائی نوعیت کے سینکڑوں موضوعات ان کے ذریعے ادبی کالم میں ڈھل چکے ہیں۔ وہ عام موضوع میں بھی ادبی شان پیدا کر دیتے ہیں۔ ہر موضوع میں وہ اپنے فنِ ظرافت سے خوش رنگ پھول، تبسم اور مسکراہٹیں یوں بھر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا موضوع سے بے نیاز فن میں کھو جاتا ہے''۔ (۳۸)

شوکت تھانوی کا طرز ظرافت اعلیٰ ادبی اقدار سے پھوٹتا ہے۔ ان کی تحریریں پھکڑ پن اور مزاح کی سستی اور سطحی قسم سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالموں سے ادب کے قارئین کی جمالیاتی تسکین ہوتی ہے۔

ان کے طنز میں ہنر کاری لفظ کے فنکارانہ مہارت کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ حالات واقعات اور قارئین کی نفسیات کے مطابق لفظوں سے ظریفانہ کیفیات پیدا کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب کو تشبیہ، استعارہ، کنایہ کے برمحل استعمال سے ایک ادبی شان عطا ہوتی ہے۔ موضوع کے انتخاب میں وہ سوچ سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ ان

کے کالموں کے عنوانات سے ہی قاری ان کی حسن ظرافت اور ذہانت کا قائل ہو جاتا ہے۔ ادبی موضوعات پر لکھے ان کے کالم میں یہ اوصاف کھل کر سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کالم کا اقتباس ملاحظہ کیجیے۔ جو انھوں نے ۱۹۳۳ء میں ترقی پسندی کے نام نہاد علمبرداروں کی طرف سے ''انگارے'' کے نام سے افسانوی مجموعے کی اشاعت کے بعد لکھا:

''یہ ''انگاری'' وہ نہیں جو آگ لگانے کے بعد کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ بلکہ ہمارا مقصد ''انگارے'' سے وہ کتاب ہے جو آج کل اخبارات کا دلچسپ ترین اور مسلم اخبارات اہم ترین مبحث بنی ہوئی ہے۔ یہ کتاب دراصل دس مہمل اور بے تکے افسانوں کا ایک بے ڈھنگا سا مجموعہ ہے۔ جس کو ایک عورت اور مردوں کی اجتماعی کوششوں نے مرتب کیا ہے۔ پانچ افسانے سجاد ظہیر نے لکھے ہیں۔ دو افسانے احمد علی صاحب کی ادبی بدہضمی کا نتیجہ ہے۔ دو افسانے رشید جہاں صاحبہ کی انشا پردازانہ ہیضہ کا نمونہ ہیں اور ایک افسانہ محمود الظفری صاحب نے لکھ مارا ہے۔ ان دسوں افسانوں کو پڑھ کر اگر پہلی مرتبہ کوئی شخص اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ لکھنے والے نے کیا لکھا ہے اور پڑھنے والے نے یہ کیا پڑھا ہے۔ تو دعوے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ بریلی یا آگرے کے پاگل خانے کا مہتمم بننے کا اہل ترین ہوگا۔ اگر ان افسانوں کو کوئی بار بار پڑھے تو وہ یقیناً ہماری طرح صرف اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔ کہ یہ کتاب صرف ایک صفت کے تحت لکھی گئی ہے۔ جس کو صفت بے دھڑک کہہ سکتے ہیں۔ یا وہ گوئی کی طرح گویا ان حضرات نے یاوہ نگاری کے کمالات ان افسانوں میں دکھائے ہیں''۔ (۳۹)

شوکت تھانوی نے مارشل لاء دور میں حق گوئی پر لگنے والی قدغن کے دوران اصطلاحات اور علامتوں سے سہارا

لیا۔ ہلکے پھلکے انداز میں سیاسی جبر کے خلاف ادبی رنگ میں طنز کرنا ان کا خاصا ہے۔ وہ جدت پسند مزاج کے تخلیق کار تھے۔ اس لیے ان کے کالم بھی فنی جدت طرازی کی تازگی اور شگفتگی کا نمونہ ہیں۔ وہ ان کالم نگاروں کی صف میں شامل ہیں۔ جن کی زبان ادبیت اور شعریت کی عمدہ مثال ہے۔ رشید احمد صدیقی ان کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں:

''شوکت صاحب کی زبان بہت اچھی ہے۔ اور بیان بھی بہت اچھا۔ اس موقع پر بعض لوگ کوثر و تسنیم کا لفظ استعمال کیے بغیر نہیں رہتے۔ لیکن محض اس مار سے آج کل ہماری انشاء پردازی پر سب سے بڑا جرم یہ لگا دیا جاتا ہے کہ ہم عرب و فارس اور ترکستان وغیرہ سے بدکتے کیوں ہیں؟ میں کوثر و تسنیم کے الفاظ سے ہاتھ دھوتا ہوں اور اپنے دوستوں کی خاطر یہ کیوں کہوں کہ شوکت صاحب کی زبان و بیان میں وہی لطافت ہے جو لکھنؤ کی بالائی اور کھٹیوں میں ہے شوکت صاحب نے لکھنؤ کی زبان میں یورپ کے بعض الفاظ اور لہجے بڑے لطف و لطافت سے سموئے ہیں''۔ (۴۰)

شوکت تھانوی نے مزاح کے دیگر حربوں مبالغہ، صورتِ واقعہ اور مزاحیہ کردار کا بھی خوب استعمال کیا ہے اور فنکارانہ حسن کے ساتھ اپنے کالموں کو ادبی کالم نگاری کی روایت میں اہم مقام سے نوازا ہے۔

☆☆☆☆

مولانا چراغ حسن حسرت (۱۹۰۴۔۱۹۵۵ء)

مختصر تعارف

ولدیت: بدرالدین بدر

ولادت: ۱۹۰۴ء بمیار ضلع پونچھ (کشمیر) وفات: ۲۶۔جون ۱۹۵۵ء، لاہور

نامور صحافی، ادیب، مزاح نگار، خاکہ نگار، کالم نگار، مترجم،

ادارت:
- ☆ بانی، ماہنامہ ''آفتاب'' کلکتہ (اجراء ۱۹۲۶ء)
- ☆ بانی، ماہنامہ ''فکاہی ہفت روزہ، شیرازہ لاہور (اجراء دسمبر ۱۹۳۶ء)
- ☆ روزنامہ ''امروز'' لاہور (۱۹۴۸۔۵۱ء)

کالم نگاری: روزنامہ ''احسان''، ''امروز'' م اور ''نوائے وقت'' میں ''سندباد جہازی'' کے قلمی نام سے فکاہیہ کالم لکھتے رہے۔

کتب:
- ☆ بغاوت عرب اور کرنل لارنس (۱۹۳۰ء) ☆ سرگزشت اسلام (۱۹۳۷ء)
- ☆ مردم دیدہ (خاکے۔۱۹۳۹ء) ☆ مطائبات (فکاہی مضامین۔۱۹۳۹ء)
- ☆ اقبال نامہ (شیرازہ کے اقبال نمبر کی کتابی صورت۔۱۹۴۰ء) ☆ کشمیر (۱۹۴۸ء)
- ☆ دوڈاکٹر (ڈاکٹر عالم وڈاکٹر سیتہ پال۔۱۹۴۰ء) ☆ جدید جغرافیہ پنجاب (۱۹۴۰ء)
- ☆ قائداعظم (۱۹۴۹ء) ☆ کیلے کا چھلکا اور دوسرے مضامین (۱۹۴۹ء)
- ☆ زرنخ کے خطوط (۱۹۵۱ء) ☆ پربت کی بیٹی (کہانیاں۔۱۹۵۲ء)
- ☆ مضامین حسرت (۱۹۵۶ء) ☆ حرف وحکایت (منتخب کالم۔۱۹۵۶ء)

ادبی کالم نگاری کی روایت میں چراغ حسن حسرت اپنے منفرد اسلوب، بذلہ سنجی اور امتیازی خصوصیات کی بنا پر صف اول کے بے مثال کالم نگاروں میں شامل ہیں۔ وہ ایک سماج دوست انسان تھے اور ان کی شخصیت کا یہی پرتو ان کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کے کالموں میں معاشرتی شعور اور سماجی مسائل کی تصویر کشی دلچسپ پیرائے تحریر میں نظر آتی ہے۔ انھیں کالم نگاری کے فن پر ایسی دسترس حاصل تھی کہ قاری پہلے لفظ سے لے کر آخری لفظ تک مکمل یکسوئی کے ساتھ کالم سے لطف اٹھاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے دور کے ہم عصر کالم نگاروں میں وہ معتبر پہچان رکھتے ہیں۔

ان کے کالم کا ایک بڑا حسن یہ بھی تھا کہ وہ قادر الکلام ادیب تھے۔ زبان و بیان اور روزمرہ اور محاورہ کے کہنہ مشق شاعر و ادیب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالموں میں ایک صاف شیشہ اور رواں دواں زبان کی لہر چلتی ہے۔ انھوں نے کلاسیکی ادب کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ اور ''فسانہ آزاد'' اور ''طلسم ہوش ربا'' کی تمام جلدیں ذوق و شوق سے پڑھی تھیں۔ ان کے مطالعہ کا عکس ان کی کالم نگاری میں بھی جھلکتا ہے۔ وہ زبان دان ادیب تھے۔

حسرت کی کالم نگاری پر طنز و مزاح کا اثر غالب ہے۔ وہ شگفتگی اور بذلہ سنجی کے پیرائے میں تہہ داری کے ساتھ اپنی بات کرتے ہیں۔ اُردو کے معروف کالم نگار نصر اللہ خان نے چراغ حسن حسرت کو اُردو صحافت کا سب سے بڑا طنز و مزاح نگار قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ حسرت صاحب کے بارے میں بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان سے بڑا مزاحیہ کالم نویس اور طنز نگار آج تک پیدا نہیں ہوا''۔ (۴۱)

طنز کی نسبت ان کے ہاں مزاح کا رجحان غالب ہے انھوں نے اپنے کالموں میں مزاح کے نمائندہ حربوں کو بخوبی استعمال کرتے ہوئے اپنی تحریر میں شگفتگی کی ایسی شان پیدا کی کہ قاری مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ زندگی کے تضادات اور معاشرے کی ناہمواریوں پر طنز کے گہرے وار کرتے ہیں۔ ان کا مزاح ادبی اُسلوب میں رچا بسا ہے۔ اس لیے عامیانہ پن اور سستی پھکڑ بازی کی بدصورتیوں سے پاک ہے۔ وہ لفظی ہیر پھیر کے حربے کا بڑی فنکارانہ مہارت سے استعمال کرتے ہیں اور مضحکہ خیز واقعات کے ذریعے کالم کو دلچسپ بناتے ہیں۔ وہ ایک صاحبِ مشاہدہ ادیب تھے۔ اور بڑی باریک بینی سے اپنے کالم کے موضوع کا انتخاب کرتے۔ ان کی اسی باریک بینی کا کرشمہ ہے کہ ان کے ہاں موضوعات میں ایک رنگا رنگ دنیا آباد ہے۔ اُنھوں نے اپنے کالموں کے ذریعے زندگی کی مضحکہ خیز تصویروں کو نمایاں کیا ہے۔ صحافت میں ظرافت، طنز اور شگفتگی کو پروان چڑھانے میں حسرت نے بنیادی نوعیت کا کردار بطریق احسن ادا کیا ہے۔

حسرت نے ۱۹۳۵ء میں کلکتہ سے نکلنے والے عصر جدید میں ''کوچہ گرد'' کے نام سے فکاہیہ کالم نویسی کا آغاز کیا۔ کالم نویسی سے ان کو فطری مناسبت تھی یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کی آخری سانسوں تک کالم نویسی سے وابستہ رہے۔ اس دوران اُنھوں نے ''نئی دنیا''، ''زمیندار''، ''احسان''، ''شہباز''، ''انصاف''، ''امروز'' اور نوائے وقت" میں بھی کالم لکھے۔ اُنھوں نے کالم نویسی کے لیے مختلف قلمی نام استعمال کیے۔ کبھی کوچہ گرد، کبھی ہمیں اور کبھی سندباد جہازی۔ ان کے کالموں میں محض ہنسی مذاق کی سطحی کیفیات ہی نہیں بلکہ درد وغم کا احساس بھی شگفتہ اندازِ تحریر میں بیان کیا جاتا ہے۔ چراغ حسن حسرت نے ۱۹۳۶ء میں ہفتہ روز رسالہ ''شیرازہ'' لاہور سے جاری کیا، یہ ایک طنزیہ ومزاحیہ پرچہ تھا۔ اسی رسالے میں ان کی مشہور تحریر ''جدید جغرافیہ پنجاب'' قسط وار چھپا۔

حسرت کے مزاح کا سب سے نمایاں حسن کا ان کا لفظی ہیر پھیر ہے جس کے ذریعے شگفتگی پیدا کرتے ہیں۔ وہ عام لفظوں میں اپنے فن کے کرشمے کے باعث ایسے ایسے ظرافت خیز نکات پیدا کرتے ہیں کہ قاری لطف وسرور کے حیرت انگیز ذائقوں سے شناسا ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور یہ اقتباس دیکھیے:

> ''سنا ہے کہ ایک جغادری کنکوے باز کے کنکوے کی ڈور کٹ گئی یا کٹنے کو ہے۔ کنکوا الٹ کیا یا لٹ جانے کو ہے۔ سے ڈور کاٹ کر کنکوا اور کنکوے کے ساتھ ڈور لوٹ لینا۔ کچھ ایسا مشکل نہیں۔ خاص طور سے پر جب لگا ''ڈان'' یا بقول شخصے ''ڈانگ'' کا ہو۔ بہر حال اب کنکوے بازی کا فن لندن ہی میں ترقی کرے تو کرے۔ ہمارے ہاں سے یہ فن اٹھ گیا۔ اس کے قاعدے اور آداب بھی مٹ گئے۔ کہاں لمڈورے پیچ لڑانا اور کنکوے کو سیروں ڈور پلاتے چلے جانا اور کہاں لگے سے کنکوا لوٹنا۔ سچ پوچھیے تو استاد جمن کے ساتھ کنکوے بازی کا فن بھی ختم ہوگیا۔ اور ہمارے پاس لے دے کہ صرف ایک ''ڈانگ'' کا لگا رہ گیا۔ اب

اس سے کنکوے لٹتے دیکھے اور مرحوم جمن کے لمڈورے بیچوں کو یاد کیجیے''۔(۴۲)

چراغ حسن حسرت اُردو زبان کے ایک قادر الکلام ادیب تھے۔ان کے ہاں زبان کا بے ساختہ اور برجستہ اظہار ملتا ہے۔سلاست اور روانی نے ان کے لہجے میں ایک نکھار پیدا کیا ہے۔زبان و بیان پر عبور کی صفت ظرافت نگاری کی بنیادی شرط ہے۔حسرت کا فن اس وصف سے مالا مال ہے۔زبان کی اس زرخیزی نے ان کے کالموں میں تازگی کی ایسی لہر پیدا کی کہ آج بھی ان کے کلام موضوعات کی خدمت کے باوجود قاری کو بھر پور حظ و لطف سے نوازتے ہیں۔مولانا حسرت اُردو کے جدید اور کلاسکی ادب کے ایک صاحب ادراک قاری اور ادیب تھے۔اُنھوں نے کئی پرانے الفاظ اور محاوروں کو موقع محل کے مطابق سلیقے اور ہنر سے برتا ہے۔ان کا انداز تحریر تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔وہ مشکل سے مشکل موضوع میں بھی فن وخیال کے نئے نئے دلچسپ پیرائے تراشے ہیں۔عبدالمجید سالک ان کے اُسلوبِ بیان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''زبان کے معاملے میں محاورہ اہل زبان کی پابندی حسرت کے لیے مذہب کا حکم رکھتی تھی۔میں بھی اس بارے میں کافی محتاط ہوں لیکن حسرت صاحب سے ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا۔کہ''ماڈرن اُردو'' لکھا کرو۔''طلسم ہوش ربا'' اور ''فسانہ آزاد'' کی اُردو بلاشبہ پاکیزہ ہے۔لیکن زبان کوئی کھڑے پانی کا جوہڑ نہیں بہتا دریا ہے۔زمانہ حال میں اظہار و بیان کی ضرورتیں متقاضی ہیں کہ کچھ نئے محاورے نئی ترکیبیں اور جملوں کے نئے انداز اختیار کر لیے جائیں۔لیکن حسرت اپنے مسلک سے ایک انچ بھی انحراف کرنے کو تیار نہ تھے۔وہ متین وسنجیدہ مزاحیہ، خالص ادبی ورومانی ہر قسم کی نثر لکھتے تھے۔ان کی مزاحیہ تحریروں کی

خصوصیت یہ تھی کہ وہ الفاظ کے عجیب پہلو نکالتے اور بات میں بات پیدا کرتے۔
لطائف البتہ کم بیان کرتے لیکن احوال وواقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے چھوٹے
چھوٹے چٹکلوں کی بھرمار کردیتے''۔(۴۳)

اُسلوب بیان کے ساتھ ساتھ فکری حوالے سے بھی ان کالموں میں فکر وخیال کی بلند آہنگی ملتی ہے۔ ان کالموں میں ایک جہاندیدہ معاملہ فہم اور ذہین کالم نگار کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں جو سیاست کے در پردہ قباحتوں کو اپنی باریک بین نظروں سے دیکھ لیتا ہے۔ کالم نگاری کے لیے عمیق مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھیں بات سمجھنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے اور بات سمجھانے کا ڈھنگ بھی۔ وہ بحث برائے بحث کے قائل نہیں بلکہ عقل ودلیل کے ساتھ بات کرنے کا وصف رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں بات کو تہذیب کے پیرائے میں بیان کرنے کا ہنر ملتا ہے۔ بقول ضمیر جعفری:

''مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کی تنہا ذات میں بیک وقت بہت سی
خوبیاں جمع ہوگئی تھیں۔ مرحوم ان کم یاب شخصیتوں میں سے تھے جو ایک فرد سے
بڑھ کر ایک ادارے ایک وضع کا مرتبہ حاصل کرلیتی ہیں۔ مولانا حسرت کی پوری
زندگی تحصیلِ علم کی ایک ان مٹ پیاس اور ابلاغِ علم کی ایک مسلسل تگ وتاز کی
روداد ہے''۔(۴۴)

حسرت کے کالموں میں طنز سے زیادہ مزاح کا حربہ زیادہ ملتا ہے۔ تاہم ان کے مزاح میں ہنستی مسکراتی کیفیت زیادہ ہے۔ اس وصف سے ان کا مزاح زہرناک کیفیت سے پاک ہے۔ طنز کے استعمال مین بھی اُنھوں نے بہت سے حربوں مثلاً مبالغہ، موازانہ وغیرہ سے بخوبی کام لیا ہے۔ ان کی طنزیات ہجو اور گالی گلوچ سے مبرا ہیں۔ حسرت کی ان خوبیوں کو سمجھنے کے لیے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ہمارے خیال میں ''پھر بساؤ'' اچھی اصطلاح ہے پاکستان کو بھی ''بحالیات'' کی جگہ ایسے ہی اختیار کر لینا چاہیے۔''ریفیو جی'' کا ترجمہ کرتے وقت یہی قاعدہ ملحوظ رکھا جاتا تو بڑی آسانی سے ''چھوڑ آؤ'' کی اصطلاح گھڑی جا سکتی تھی۔محکمہ مہاجرین و بحالیات تو محض تکلف ہے۔اسے بھی چھوڑ آؤ۔ اور پھر بساؤ کہنا چاہیے۔ ترجمے کے اسی قاعدے کو سامنے رکھا جائے تو وضع اصطلاحات کا جھگڑا ہی طے ہو جاتا ہے۔مثلاً وزیر زراعت کو ہل چلاؤ وزیر کہنا چاہیے۔وزیر خزانہ کو''روپیہ بچاؤ'' ہوم منسٹر کو''گھر گھر آؤ'' اور وزیر خارجہ کو ''باہر جاؤ''۔شیخ کرامت علی صاحب وزیر صحت بھی ہیں۔اور وزیر تعلیم بھی۔ اس لیے انھیں''لڑکے پڑھاؤ، فیض دکھاؤ فیض دکھاؤ وزیر'' کہنا چاہیے''۔(۴۵)

حسرت کے کالموں میں بعض اوقات موقع محل کے مطابق شعروں کا دلچسپ استعمال بھی نظر آتا ہے۔حسرت خوبصورت لہجے کے شاعر گزرے ہیں۔شاعری بطور وسیلہ ان کے کالموں میں ایک شعری آہنگ کی تخلیق کا سبب بنتی ہے۔

تیرے گورے گورے گال — اتحاد پارٹی
تیرے لمبے لمبے بال — اتحاد پارٹی
تیرا یار مرندار ناتھ — اتحاد پارٹی
سارے ٹوڈی تیرے ساتھ — اتحاد پارٹی۔(۴۶)

حسرت کے کالموں میں ہماری تاریخ کے ایسے بھی جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔مثال کے طور پر قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی آمد سے الاٹمنٹ کی صورت میں اس وطن عزیز میں کرپشن کا جو بیج بویا گیا۔وہ اب تناور درخت بن چکا

ہے اس دور کے اس ناسور کو چراغ حسن حسرت نے یوں اپنے کالموں میں طنز کی زد پر رکھا ہے۔

''۔۔۔۔بعض حضرات ایسے ہیں جنھیں الاٹمنٹ کی لوٹ میں صرف ایک کوٹھی یا ایک کارخانہ ہاتھ آیا ہے۔حالانکہ انھیں کوٹھیا اور تین کارخانے ملنے چاہیں تھے۔ وہ تو ان لوگوں کی ہمت اور حوصلے کی داد دینا چاہیے کہ انھوں نے وقت کی نزاکت کا لحاظ کرتے جلوس نہیں نکالا ورنہ اگر ڈاکیوں کی طرح یہ حضرات یعنی الاٹمنٹ کے ڈاکو بھی جلوس نکال لیتے تو کوئی ان کا کیا کر لیتا۔ڈاکیوں کے حقوق سے ہمیں انکار نہیں لیکن ڈاکوؤں کے بھی تو کچھ حقوق ہیں۔ہمیں ان کا بھی خیال رکھنا چاہیے''۔(۴۷)

حسرت کے کالموں میں ادبیت وشعریت کی جو انفرادی شان پائی جاتی ہے۔یہ بہت کم کالم نگاروں کو ملتی ہے اور یہی ان کی اہم اور نمایاں کامیابی ہے۔

☆☆☆☆

میاں محمد شفیع (م ش) (۱۹۱۱ء۔۔ ۱۹۹۳ء)

مختصر تعارف:

ولادت: ۲۷۔نومبر ۱۹۱۱ء، وہان ضلع جالندھر وفات: یکم دسمبر، ۱۹۹۳ء، لاہور

معروف صحافی، ادیب، سیاستدان، سول اینڈ ملٹری گزٹر

کالم نگاری: زمیندار اور نوائے وقت میں کالم لکھتے رہے۔

خدمات: ☆ کارکن تحریک پاکستان (گولڈ میڈل ۱۹۸۷ء)

☆ بانی صدر انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ (۳۸۔۱۹۳۶ء)

☆ پرائیوٹ سیکرٹری علام اقبال (۳۸۔۱۹۸۲ء)

☆ رکن پنجاب اسمبلی (۵۵۔۱۹۵۱ء)

☆ رکن مجلس وفاقی شوریٰ (۱۹۸۲ء)

☆ رکن مغربی پاکستان اسمبلی (۵۸۔۱۹۵۵ء)

میاں محمد شفیع نے کالم نویس، رپورٹر اور سیاستدان کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ صحافتی اور سیاسی حلقوں میں وہ میاں محمد شفیع کی بجائے م ش کے قلمی نام سے معروف رہے۔

''زمیندار'' میں ان کے انگریزی سے ترجمہ کیے ہوئے مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس پر انھیں مولانا ظفر علی خان سے داد بھی ملتی تھی۔ تحریک سول نافرمانی میں حصہ لینے کی بنا پر انھیں پابند سلاسل ہونا پڑا۔ قیام پاکستان کا سورج اُنھوں نے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھا۔ رہائی کے کے بعد ''پاکستان ٹائمز'' میں چیف رپوٹر کے طور پر کام کرنے لگے۔ ۱۹۵۲ء میں اُنھوں نے اپنا ہفت روزہ ''اقدام'' جاری کیا جو ۱۹۶۲ء میں بند ہو گیا۔ ۱۹۶۲ء میں وہ نوائے وقت کے ساتھ بطور کالم نویس منسلک ہو گئے۔ قاہرہ حادثہ میں عرفان چغتائی کی شہادت کے بعد نوائے وقت میں ان کا کالم ''لاہور کی ڈائری'' بند ہو گیا۔ یہ کالم میں محمد شفیع م۔ش کے قلمی نام سے لکھتے رہے۔ (۴۸)

جون ۱۹۶۹ء میں انھوں نے ''ندائے ملت'' میں اپنا ذاتی اداریہ نما کالم ''م۔ش'' کی ڈائری شروع کیا۔ ہفت روزہ ''ادکار'' میں بھی لکھتے رہے۔ ''مشرق'' میں بھی ان کا کالم شائع ہوتا رہا۔ بعدازاں وہ دوبارہ ''نوائے وقت'' میں لکھنے لگے۔

میاں محمد شفیع کا شمار ایسے کالم نگاروں میں ہوتا ہے جو اپنی ذات کے حوالے سے زیادہ گفتگو کرتے ہیں۔ وہ مختلف مسائل کے حوالے سے یہ بتاتے ہیں کہ جب ماضی میں یہ مسئلہ سامنے آیا تھا تو اس وقت اس سے کیسے نبٹا گیا

تھا؟ محمد اسلم ڈوگر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ان کے کالم کا یہ انداز ان کے طویل صحافی اور سیاسی تجربات کا مرہونِ منت ہے۔
ان کی تحریروں میں ایک جذبہ نظر آتا ہے۔ وہ اسلام اور پاکستان سے محبت کے جذبے
سے سرشار ہو کر کالم لکھتے ہیں۔ تحریک پاکستان کے حوالے سے جب کوئی ایسی بات سامنے آتی
ہے جس میں کہنے والا اپنے تعصب اور بغض سے کام لے کر سچ کو جھوٹ بنا دیتا ہے تو اس
وقت م۔ش کے کالموں کا انداز ہی بدل جاتا ہے۔'' (۴۹)

میاں محمد شفیع کے کالموں میں ان کے تجربات اور مشاہدات پر زیادہ ہوتا ہے۔ تاہم ان کے ہاں ہمیں منطق اور استدلال کا وہ معیار نظر نہیں آتا جس کا مطالعہ ہم اس کے وقت دوسرے کالم نگاروں کے ہاں نظر آتا ہے۔ لیکن ان کی تحریر کا خلوص اور جذبہ پڑھنے والے پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔ جہاں تک ان کے کالموں کے موضوعات کی بات ہے تو ان کے ہاں سماجی، معاشرتی، اخلاقی اور دیگر موضوعات پر کالم ملتے ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں وہ بڑی دردمندی سے مسائل کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کے حل کی تدبیریں بیان کرتے ہیں۔ ان کے بعض سیاسی کالموں میں ایسے فقرے بھی نظر آتے ہیں جو ان کے طویل تجربے اور تخلیقی صلاحیتوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ عموماً سیاست یا سیاست دانوں کے متعلق ان کے یہ فقرے اکثر لوگوں کی زبان پر رہتے ہیں۔

ان کی تحریر میں خطابت کا انداز بھی ہے لیکن زیادہ مشکل زبان استعمال نہیں کرتے۔ ان کے ہاں ادبی چاشنی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اگر موضوع خشک بھی ہو تو بھی اپنے اسلوب سے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ ان کی شگفتگی ان کے موضوعات کو خوشگوار بنا دیتے ہیں۔ ان کے کالم کی ضخامت بھی ایک ہزار الفاظ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ (۵۰)

محمد میاں شفیع کے کالموں میں ایک رپوٹر کا سا انداز بھی نظر آتا ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے کالم میں کوئی اچھوتی خبر بیان کرتے ہیں۔ کبھی کبھار بے تکلفی کے ماحول میں وہ چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ ایسے کالموں میں ان کا انداز ایک مشفق بزرگ کا سا ہوتا ہے۔

سعادت حسن منٹو(۱۹۱۲ء۔۱۹۵۵ء)

مختصر تعارف:

ولدیت: غلام حسن

ولادت: ۱۱مئی ۱۹۱۲ء ،سمرالہ ضلع ہوشیار پور وفات: ۱۸۔جنوری ۱۹۵۵ء، لاہور

نامور افسانہ نگار، فلمی مکالمہ نگار، ڈرامانگار، خاکہ نگار، ناول نگار، کالم نگار

افسانوی مجموعے: ☆ آتش پارے ☆ منٹو کے افسانے ☆ لذت سنگ

☆ چغد ☆ پھندنے ☆ افسانے اور ڈرامے

☆ سیاہ حاشیے ☆ خالی بوتلیں خالی ڈبے ☆ کالی شلوار

☆ ٹھنڈا گوشت ☆ شکاری عورتیں ☆ بغیر اجازت

ڈرامے: ☆ منٹو کے ڈرامے ☆ جنازے ☆ کروٹ

خاکے: ☆ گنجے فرشتے ☆ لاؤڈ سپیکر

مضامین وکالم: ☆ منٹو کے مضامین ☆ تلخ ترش اور شیریں

اردو تراجم: ☆ سرگزشت اسیر (ڈراما) ☆ گورکی کے افسانے

☆ ویرا (انگریزی ڈراما) ☆ دو ڈرامے

سعادت حسن منٹو کی بنیادی وجہ شہرت افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے لیکن اُنھوں نے کالم نگاری کے شعبے میں بھی کامیاب تجربے کیے ہیں۔ اور اپنے ادبی اسلوب اور کاٹ دار جملوں کے باعث اپنے دور کے کالم نگاروں میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

منٹو نے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۴ء تک رونامہ ''آفاق'' میں کالم لکھے۔ کچھ کالم اُنھوں نے ''تلخ، ترش اور شیریں'' کے عنوان سے لکھے تاہم اکثر بیشتر ان کے کالم عنوان کی قید سے آزاد ہی رہے۔ ان کے کالموں کا انتخاب ''تلخ، ترش اور شیریں'' کے نام سے کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔

منٹو کالم کے مزاج وکردار کو سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کے کالموں میں ایک افسانوی اور ڈرامائی فضا ملتی ہے۔

جو قاری کو پہلے لفظ سے آخری لفظ تک اپنے گرفت میں رکھتی ہے۔ طنز منٹو کا خاص ہتھیار ہے درحقیقت منٹو نے جس دور میں کالم لکھے۔ یہ پاکستان کے نامساعد حالات کا دور تھا۔ اس لیے منٹو نے اس دور کی ترجمانی کے لیے طنز ومزاح کو ادبی شان کے ساتھ ہتھیار کے طور پر برتا۔ منٹو معاشرے کی اخلاقی کمزوریوں پر کڑھتا ہے اور بے چین رہتا ہے۔ اس لیے وہ ان کو طنزیہ پیرائے میں بیان کرتے اس کی حقیقت کو قارئین کے سامنے لے آتا ہے۔

وہ خود کہتا ہے:

''مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے''۔ (۵۱)

منٹو نے تخیل آرائی کی مدد سے اپنے کالموں میں زندگی کو سمجھنے کا ایک نظریہ دریافت کیا ہے وہ خارجی واقعات کو موضوع بنا کر زندگی کی بڑی حقیقتوں کا ذکر کمال مہارت سے کرتا ہے:

''کل ایک دیوار پر یہ حکم لکھا نظر آیا۔ اس دیوار پر لکھنا منع ہے۔ میں نے سوچا جب دیوار کے مالک کو اپنی دیوار پر کسی قسم کی تحریر پسند نہ تھی تو یہ حکم ہی کیوں لکھوایا۔ غالباً اسی نفسیاتی غلطی کا نتیجہ تھا کہ ساری دیوار پر بے شمار چھوٹے موٹے بدخط اور خوش خط حروف سے بھری ہوئی تھی۔ کتابی ادب ہے اخباری ادب ہے رسائلی ادب ہے۔ اسی طرح دیواری ادب ہے کاغذ پر صرف کلیجہ نکال کے رکھا جاسکتا ہے لیکن دیوار پر آپ کلیجہ، گردے، دل، پھیپھڑے سبھی نکال کر رکھ سکتے ہیں''۔ (۵۲)

منٹو نے اپنے دور کے ادبی مباحث اور تنازعات پر بھی کالم لکھے اور اپنے تیکھے اندازِ تحریر سے اس میں مضمون آفرینی کے نئے نئے نکتے پیدا کیے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندی اور اردو کے عنوان سے لکھے گئے ایک کالم سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ہندی اور اُردو کا جھگڑا ایک زمانے سے جاری ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر تارا چند جی اور مہاتما گاندھی اس جھگڑے کو سمجھتے ہیں۔ لیکن میری سمجھ سے یہ ابھی تک بالاتر ہے۔ کوشش کے باوجود اس کا مطلب میرے ذہن میں نہیں آیا۔ ہندی کے حق میں ہندو کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟ مسلمان اُردو کے تحفظ کے لیے کیوں بے قرار ہیں؟ زبان بنائی نہیں جاتی خود بنتی ہے اور نہ ہی انسانی کوششیں کسی زبان کو فنا کرسکتی ہیں''۔ (۵۳)

ہندوستان اور بعد ازاں پاکستان میں جس طرح اقبالیات کے شعبے میں فکرِ اقبال اور شاعری کی جس طرح الٹی سیدھی تاویلیں کی گئیں۔ اور اس بہتی گنگا میں نالائق لوگوں نے جس طرح ہاتھ دھو کر دانشور اور محقق بننے کی مذموم کوشش کی۔ منٹو نے اردو ادب کے اس المیے پر یوں کالم باندھا ہے:

''ایک دکھ مجھے اب ہو رہا ہے۔ جب میں رموزِ بے خودی میں آسمانوں، زمینوں، ہواؤں، دریاؤں، پہاڑوں اور وادیوں، سورج چاند اور ستاروں پھلوں اور پھولوں غرض یہ کہ ساری کائنات کو انسان کی میراث قرار دینے والے شاعر کے قلندرانہ کلام پر چند خود غرض مجاوروں کا قبضہ دیکھتا ہوں۔ اقبال نے خدا کے

حضور دعا مانگی تھی۔ میرا نور بصیرت عام کر دے۔۔۔ یہ دعا اور جو ایک درد مند دل
سے نکلی ضرور قبول ہوگی۔ لیکن صابنوں، تیلوں اور ہوٹلوں اور لانڈریوں کے ساتھ اس
شاعرِ اعظم کا نام منسوب ہوتے دیکھ کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نور بصیرت
بہت دیر تک جہالت کی تنگ اور اندھیری گلیوں میں بھٹکتا رہے گا''۔(۵۴)

منٹو کے کالموں کے طنز و مزاح کے ادبی رنگ معاشرے کے اصلی چہرے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کا طنز گہرا اور تھکیا ہے۔ مزاح سے منٹو کی خوش طبعی، خوش مزاجی، شوخی اور جلبلاہٹ ٹپکتی ہے۔ ان کے کالموں میں دھیما پن، نرم روی اور پُر تکلفی نام کو بھی نہیں کہ وہ بے باک بلند بانگ اور بے حجاب ہیں۔ لیکن منٹو کی بے حجابی اور بے باکی کا دامن ان کے متوازن ادبی شعور اور نازک فنی حس ہمہ وقت پکڑے رکھتے ہیں اور انھیں اپنے بلند مقام سے گرنے نہیں دیتے''۔(۵۵)

منٹو کے کالموں کا فنی حسن یہ بھی ہے کہ ان کو زبان و بیاں کے تخلیقی استعمال پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ وہ سیدھے سادے لفظوں اور چھوٹے چھوٹے جملوں سے بھی رنگینیٔ بیاں اور دلآویزی پیدا کرنا جانتے ہیں۔ ایک باشعور فن کار کی طرح ان کے کالموں پر مقصدیت کی اُکتاہٹ حاوی نہیں وہ ادبیت کے تقاضوں کی بخوبی تکمیل کرتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کمال مہارت سے کہہ دیتے ہیں۔ وہ گہرائی سے سوچنے والے معاملہ فہم فنکار ہیں۔ جو اپنے کالموں میں اپنے معاشرے کا احتساب کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے کالموں میں ادبی اُسلوب اور قدرت بیان خوبی کے ساتھ شوخی وطبع اور بے باکی کے اوصاف بھی نمایاں ہیں۔ وہ بے خوف ہو کر وہی کچھ لکھتے ہیں جو سچ ہے لیکن جسے جھوٹ کے پردوں میں چھپایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ترقی پسند تحریک پر منٹو ایک کالم میں یوں طنز کرتے ہیں:

''مجھے نام نہاد کمیونسٹوں سے بڑی چڑھتی۔ وہ لوگ مجھے بہت نکلتے تھے۔ جو نرم نرم

صوفوں پر بیٹھ کر درانتی اور ہتھوڑے کی ضربوں کی باتیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے

کہ چاند کی لیٹا سے دودھ پینے والا کامریڈ سجاد ظہیر میری نظروں میں ہمیشہ ایک

مسخرا رہا۔ محنت کش مزدوروں کی صحیح نفسیات کچھ ان کا پسینہ ہی بطریق احسن

بیان کرسکتا ہے۔ ان کو دوات کے طور پر استعمال کر کے اس کی روشنائی میں قلم ڈبو

کر گرانڈیل لفظوں میں منشور لکھنے والے ہوسکتا ہے۔ بڑے مخلص آدمی ہوں۔ مگر

معاف کیجیے میں اب بھی انھیں بہروپیے سمجھتا ہوں''۔(۵۶)

منٹو کے کالموں میں کہیں کہیں افسانہ نگار منٹو کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ واقعہ نگاری اور مکالمے کے ذریعے وہ اپنے کالموں میں نہایت برجستگی کے ساتھ اپنے موضوع کو نبھاتے ہیں۔ انسان فطری طور پر افسانویت کا دلدادہ ہے اور منٹو کی نفسیات شناسی اور فنکارانہ مہارت کی داد دیجیے کہ ان کے بعض کالموں میں افسانویت کا یہی حسن سرایت کیے ہوتے ہیں۔ یہی وہ انفرادی شان ہے کہ منٹو نے نسبتاً کالم بہت کم لکھے لیکن یہ کالم اتنے جاندار ہیں کہ انھیں ادبی کالم کی روایت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆

مجید لاہوری (۱۹۱۳ء۔۱۹۵۷ء):

مختصر تعارف:

اصل نام: عبدالمجید چوہان ولدیت: منشی محمد دین چوہان

ولادت: ۱۹۱۳ء، گجرات وفات: ۲۶۔جون ۱۹۵۷ء کراچی

نامور مزاحیہ شاعر، ادیب، صحافی، کالم نگار

ادارت: ہفت روزہ ''نمکدان''، کراچی۔ رونامہ ''انقلاب، انصاف، خورشید، انجام، سے وابستہ رہے۔

کالم نگاری: روزنامہ ''جنگ'' میں حرف وحکایت'' کے عنوان سے تادم مرگ کالم لکھتے رہے۔

شعری کتب: ☆ نعرہ جنگ (نظمیں) ☆ کان نمک (مزاح) ☆ نمکدان (مزاح)

ادبی کالم نگاری کی روایت میں جن ہمہ جہت شخصیات نے اس روایت کو اعتبار بخشا ان میں ایک معتبر حوالہ مجید لاہوری کا بھی ہے۔اس ضمن میں پروفیسر شفیق جالندھری لکھتے ہیں:

''مولانا چراغ حسرت، مولانا عبدالمجید سالک اور حاجی لق لق کے بعد اُردو کالم نویسی کے ذریعے جس شخص نے شہرت حاصل کی اور اپنا مقام بنایا وہ مجید لاہوری ہیں''۔(۵۷)

ان کا اصل نام مجید چوہان تھا۔ وہ ۱۹۱۳ء میں گجرات میں پیدا ہوئے زندگی کا طویل عرصہ لاہور میں گزارا اور یہاں کے اخبارات ورسائل سے صحافت کا آغاز کیا قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے۔اس سے قبل لاہور کے اخبار روزنامہ ''آزاد'' میں فکاہی ادبی کالم لکھتے رہے۔کراچی میں روزنامہ ''جنگ'' میں ''حرف وحکایت'' کا کالم لکھتے رہے۔اس دوران اُنھوں نے مزاحیہ رسالہ ''نمک دان'' کا اجرا کیا۔ جب چراغ حسن حسرت نے ''امروز'' میں ''حرف وحکایت'' کے عنوان سے کالم نویسی شروع کی۔آپ نے اپنے کالم کا عنوان تبدیل کر کے ''رنگ وشرنگ'' رکھ لیا لیکن جلد ہی دوبارہ ''حرف وحکایت'' کا عنوان بحال کر دیا۔

وہ ادب وصحافت میں ہمہ جہت کے شخصیت کے مالک تھے۔قدرت نے ان کو شاعرانہ صلاحیت سے بھی

نوازا تھا اور نثر میں بھی۔ وہ کالم نویسی اور مضمون نگاری میں ان کی تخلیقی صلاحیتیں رواں دواں تھیں تاہم جس صنف میں انھیں زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ ان کی کالم نگاری ہے اُنھوں نے جس دور میں کالم نگاری شروع کی۔اس وقت عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت اور حاجی لق لق کالم نگاری پر چھائے ہوئے تھے۔یہ ایک مشکل کام تھا۔ کہ کوئی نیا کالم نویس اپنے لیے جگہ بنائے تاہم اُنھوں نے نا صرف اپنا جداگانہ تشخص قائم کیا بلکہ اس صنف کو عوامی سطح پر خوب مقبولیت بخشی۔

اُنھوں نے مزاح کا جو اُسلوب متعارف کرایا۔اسے عوامی رنگ سے تعبیر کیا گیا۔اُنھوں نے عوامی زندگی کے موضوعات کو طنز و مزاح کے ایسے رنگوں میں پیش کیا جن سے ہمارے معاشرے کی حقیقی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔وہ عوام کے ہمدرد قلم کار تھے۔اپنی کالم نگاری کے موضوعات کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میری آنکھیں دیکھتی ہیں اور کان سنتے ہیں۔میرا دماغ ان سب کو محفوظ کر لیتا ہے اور میرا قلم کاغذ پر ان کو اُگل دیتا ہے۔جو کچھ میں لیتا ہوں وہی لوٹا دیتا ہوں جیسے پارٹیاں، تقریریں، زندہ باد، مردہ باد، واپس جاؤ، سینما ہوٹل، پارک، کلب فٹ پاتھ، جھونپڑیاں، بنگلے چانڈو خانے، غرضیکہ جدھر جاتا ہوں۔مجھے کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔کچھ زمانے کی حماقتیں کچھ اپنی اور کبھی کبھی میں ان دونوں کو اس طرح ملا دیتا ہوں۔جیسے گھی میں تیل یا دودھ میں پانی ---۔لیڈروں کے بیان سماج کی برائیاں ---۔جلسوں کی خبریں قرار دادیں ---۔دلچسپ واقعات غرضیکہ چیونٹی سے ہاتھی اور گدھے سے ہوائی جہاز تک میری دنیا ہے''۔(۵۸)

مجید لاہوری کو مزاح کے کئی مقبول حربوں کے استعمال میں فنی مہارت حاصل تھی۔خاص طور پر انھیں صورتِ واقعہ کے حربے سے شگفتگی پیدا کرنے کا سلیقہ اور ادراک حاصل تھا۔سب سے پہلے وہ موضوعات کی بھیڑ میں سے نئے

انوکھے اور پرمزاح واقعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ جن کے اندر مزاح اور لطف اور ہنسانے کی خوبی پائی جاتی ہو۔ اس کے بعد وہ ان واقعات کو ادبی رنگ میں حسن ترتیب کے ساتھ اپنے کالم کی زینت بناتے ہیں۔

۱۸ جنوری ۱۹۵۶ء کے روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں شائع ہونے والے ان کے کالم ''موسم کی بات'' سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''آج کل مشاعرے کا موسم چل رہا ہے۔ کسی دور میں یہ موسم بڑی دھوم دھام سے آتا تھا۔ ایک پاک ہند مشاعرے سے اس کی ابتداء ہوتی تھے اور شہر کے ہر کونے کھانچے میں مشاعرہ کر ڈالتے تھے تاکہ تمام محلے والے بجائے سونے کے رات بھر جاگتے رہیں اور جاسوسی ناولوں کی طرح راتوں کی نیند حرام ہوجائے۔ یہ قوم کی بیداری کا عظیم الشان مظاہرہ تھا مگر محلے والے پولیس میں رپٹ لکھواتے تھے کہ کم بختوں نے رات بھر سونے نہیں دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رقیب تھانے میں جا جا کر رپٹ لکھواتے تھے کہ ''اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں'' غرض یہ کہ برائے مشاعرے کی آل اولاد پورے شہر میں پوری شہری آزادی کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتی تھی اور مشاعرے کا موسم پورے جوبن پر ہوتا تھا''۔ (۵۹)

مجید لاہوری کے کالموں میں نہ ہی رعایت لفظی سے مزاح پیدا کیا جاتا ہے اور نہ ہی وہ زبان دانی کے ذریعے قاری کو مرعوب کرتا ہے۔ وہ عوام کی گفتگو کرتا ہے ان کے کالم چٹکلے بازیوں سے بھی پاک ہوتے ہیں۔ تاہم ان کے کالم مشاہدے، روزمرے اور محاورے کے برمحل استعمال کی خوب صورت مثال ہیں۔ ان کے ہاں مزاح کے دوسرے حربے، کردار نگاری کے ذریعے بھی ظریفانہ کیفیات پیدا کرنے کا ہنر ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر ظفر عالم ظفری:

''وہ طنزومزاح کی تاریخ جہاں مجید لاہوری کو عوامی انداز تحریر اور عوامی

موضوعات کی بنا پر یاد رکھے گی وہاں مجید کی ایک اور اہم بھی طنز و مزاح کی
روایت میں گراں قدر اضافہ ہوگی وہ ہے ان کے مخصوص کردار''۔(۶۰)

مجید کے ان کرداروں میں جنھیں نسبتاً زیادہ شہرت نصیب ہوئی ان میں رمضانی ہندو، مولوی گل شیر خان، ٹیوب جی، ٹائر جی، بنک بیلنس بھائی اور سائیں سلیمان بادشاہ خاص طور پر نمایاں ہیں۔ یہ مہنگائی ان کا مقبول ترین کردار ہے۔ یہ دکھی اور پریشان عوام کا نمائندہ کردار ہے۔ یہ نچلے اور کچلے طبقے کے عوام کی جذبات اور مسائل اور پریشانیوں کا عکاس کردار ہے۔ارمغانی کی کامیاب کردار نگاری ہی کا اثر ہے کہ بعد کے کالم نگاروں نے اپنے اپنے کردار تخلیق کیے۔ مجید کا دوسرا کردار مولوی گل شیر خان ہے جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں۔اور مولوی گل شیر خان کا تعلق علماء کے اس طبقے سے ہے جسے علماء یوں کہا جاتا ہے۔ یہ سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے لوگوں کو مذہب کی افیون کھلا کر سلاتا ہے۔ یہ ہر فتویٰ آب زر سے لکھتا ہے یہ رمضانیوں سے کہتا ہے کہ اللہ جسے عزت دیتا ہے ذلت دیتا ہے یہ لوگوں کو صبر و شکر کی تلقین کرتا ہے۔۔۔ یہ مذہب کی آڑ لے کر اپنا حلوہ مانڈہ سیدھا کرتا ہے اور اوپر کی دلالی کرتا ہے اس کو مقدس دلال کہہ سکتے ہیں۔ مجید لاہوری کے اسی اُسلوب کا اعجاز ہے کہ ان کے بعد کئی کالم نگاروں نے ان کے مخصوص اندازِ بیان کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

سید ضمیر جعفری (۱۹۱۴ء-۱۹۹۹ء)

مختصر تعارف:

اصل نام: ضمیر حسین ولدیت: سید حیدر شاہ

ولادت: یکم جنوری ۱۹۱۴ء ، چک عبدالخالق ضلع جہلم

وفات: ۱۲-مئی ۱۹۹۹ء، نیویارک (خاک نشیں، راولپنڈی)

نامور شاعر، ادیب، مزاح نگار، خاکہ نگار، سفرنامہ نگار، مترجم، صحافی

ادارت: سہ ماہی ''اودھ پنچ'' راولپنڈی

خدمات: ڈائریکٹر تعلقات عامہ سی ڈی اے اسلام آباد

اعزاز: تمغۂ قائداعظم (۱۹۶۷ء) ☆ صدارتی تمغۂ برائے حسن کارکردگی (۱۹۸۵ء)

کتب: ☆ ضمیریات ☆ ضمیر حاضر ضمیر غائب ☆ کارزار مافی الضمیر
☆ لہو ترنگ ☆ جزیروں کے گیت ☆ ولایتی زعفران
☆ اڑتے ہوئے خاکے ☆ کتابی چہرے ☆ گورخند
☆ آنریری خسر ☆ جنگ کے رنگ ☆ مسدس بدحالی

سید ضمیر جعفری اُردو کی مزاحیہ شاعری کا ایک بڑا نام ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی اُنھوں نے نے کئی خوب صورت فن پارے تخلیق کیے ہیں۔ ان کا شمار ادبی کالم نویسی کے اہم کالم نویسیوں میں ہوتا ہے۔ ان کے کالموں کا آغاز روزنامہ ''جنگ'' سے ہوا۔ بعد میں وہ روزنامہ ''مشرق'' اور ''نوائے وقت'' میں ''نظر غبارے'' کے عنوان سے کالم نویسی کرتے رہے۔ آخری دور میں وہ ''خبریں'' میں ''ضمیر حاضر ضمیر غائب'' کے عنوان تلے کالم لکھتے رہے۔ ضمیر جعفری مزاجاً طنز و مزاح کی طرف زیادہ مائل رہے ہیں۔ ان کی کالم نگاری بھی ان کی شگفتگی اور ظرافت کی ایک شکل ہے۔ ان کی کالم نگاری بھی ان کی شگفتگی اور ظرافت کی ایک شکل ہے۔ وہ دلچسپ پیرائے میں معاشرے کی ناہمواری کی نشان دہی کرتے ہیں۔ تاہم ان کی کالم نگاری ماضی کی یادیں تازہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے وہ ماضی کے واقعات کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب کی رائے کے مطابق:

''اُنھوں (ضمیر جعفری) نے کہیں کہیں طنز مزاح کی لطیف مثالیں پیش کی ہیں۔
لیکن مجموعی طور پر وہ شاعری کے برعکس اپنا کوئی الگ سا اسلوب نہیں بنا سکے۔
مجموعی طور پر ان کا کالم ان کی ذاتی زندگی کے تجربے اور تاثرات پر مشتمل ہوتا
ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کالموں میں ماضی کے واقعات کا حوالہ ضرور
دیتے ہیں''۔(۶۱)

ضمیر جعفری ماضی کے ذکر کو حال سے ملانے کا تجربہ کرنے اور ظرافت کے پردے میں گہری باتیں سمجھانے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ اشعار اور مصرعوں کے برمحل استعمال پر قادر ہیں۔ کبھی کبھی کسی مصرعے کا ایسا تڑکا لگاتے ہیں کہ وہ اپنے اصل مفہوم اور سنجیدہ معنی سے ہٹ کر دوسرے معانی دیتا ہے۔ ضمیر جعفری کی کالم نگاری سے قاری خوب حظ اُٹھاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے کالم کا یہ اقتباس دیکھیے:

''ہمارے ہاں رشوت کا روگ اب بجوگ، ناسور کی صورت اختیار کر گیا ہے۔
وزیر اعظم محمد خان جونیجو کے پانچ نکات میں بھی اس بیماری کی نشان دہی کی گئی
ہے۔ اور مریض (ملک) کے علاج معالجے کا اعلان کیا گیا ہے۔ صحت کی بحالی
کے لیے مریض کی نبض لیفٹننٹ جنرل مجید ملک کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے۔
جنرل مجید ملک آرمی کے چیف آف جنرل سٹاف رہ چکے ہیں۔ حکمت عملی میں وہ
''دماغ'' سے زیادہ ''دھاوے'' میں یقین رکھتے تھے۔ آزاد کشمیر کے یادگار
معرکہ لیبیا میں پاکستان کی شاندار کامیابی انھی کی جارحانہ قیادت کا کارنامہ تھی۔
اب وہ رشوت کے محاذ پر کشتیوں کے پشتے لگاتے جا رہے ہیں۔ تیور کہہ رہے ہیں
کہ یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک''۔(۶۲)

ضمیر جعفری کے کالم کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ طنز و مزاح کے ایک صاحب اسلوب شاعر ہیں اور ان کی یہ شاعرانہ خوبیاں ان کے کالموں میں بھی آئی ہے۔ ذو معنویت اور ذکاوت نے ان کے کالموں میں ادبی شان پیدا کر دی ہے۔ اگرچہ مجموعی طور پر انھوں نے شاعری کی طرح کالم کے میدان میں اپنی علیحدہ شناخت نہیں بنائی تاہم ادبی کالم نگاری کی روایت کو بڑھانے میں ان کا بھی حصہ ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مرزا ادیب (۱۹۱۴ء-۱۹۹۹ء)

مختصر تعارف:

اصل نام: دلاور علی

ولادت: ۱۹۱۴ء، لاہور وفات: ۱۹۹۹ء نامور افسانہ نگار، ڈارمانگار، صحافی

ادارت: ادبِ لطیف

کالم نگاری: روزنامہ ''نوائے وقت'' میں لکھتے رہے۔

کتب:
☆ ادب کالم ☆ صحرانورد کے خطوط ☆ صحرانورد کے رومان
☆ جنگل ☆ کمبل ☆ دیواریں ☆ ستون
☆ لہواوقالین ☆ خوابوں کے مسافر ☆ مٹی کا دیا (خودنوشت سوانح عمری)

مرزا ادیب اُردو کے ایک معتبر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت نگاری کا جو امتزاج ملتا ہے۔ وہ بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ ادبی دنیا کے ایک مخلص کارکن رہے ہیں اور بغیر کسی ستائش وتمنا کے کارِ ادب میں مصروف رہے۔

تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ کالم نگاری بھی ان کا خاص شغل رہا۔ ان کے کالم خالصتاً ادبی موضوعات سے متعلق ہوتے ہیں اور یہی ان کا شعبۂ خاص ہے۔ ''نوائے وقت'' میں لکھے ہوئے ان کے کالم بعد ازاں ''ادب کالم'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ادبی کالموں کے اس مجموعے کے چار حصے ہیں جو اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ ان کالموں کا لکھنے والا ادبی دنیا سے باخبر ہے۔

پہلے حصے کا عنوان ''ادب کے تابناک اُفق شخصیتیں'' ہے اس حصے میں ان بارہ ادبی شخصیات کو خراج تحسین پیش کیا

گیا ہے۔جنھوں نے ادبی روایت میں معتبر مقام حاصل کیا۔

دوسرے حصے کو عنوان ''ستارے ڈوب گئے''، ''وفیات'' ہے۔اس حصے میں وہ کالم شامل کیے گئے ہیں جو مرزا ادیب نے نامور اہل قلم کی وفات پر لکھے اور ان کے ادبی کارنامے نمایاں کیے۔

تیسرے حصے کا عنوان ''زاویئے اور نکتے مسائل'' رکھا گیا ہے اس حصے میں ان ادبی سوال کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے جن پر بالعموم اختلاف رائے کا اظہار کیا جاتا ہے۔

چوتھے حصے کا مقصد قارئین تک ادبی کتب کا تعارف پہنچانا اور کتاب کلچر کو فروغ دینا ہے۔اس حصے میں ۳۱ کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

مرزا ادیب فنافی الادب تخلیق کار ہیں۔کتاب کے پہلے حصے میں جن نامور ادیبوں کی ادبی خدمات کو سراہا گیا ہے۔مرزا ادیب ان کے باطن میں اتر کر ان کے شخصی اوصاف اور ادبی کمالات کا سراڈھونڈ لاتے ہیں۔وہ اُردو ادب کے معروف نقاد اور استاد ڈاکٹر سید عبداللہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب بڑے عالم فاضل، عالم دوست، بحر علمی سے بہرہ مند تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انسانی قدروں کے بھی علمبردار تھے۔جو شخص بھی ان کے پاس کسی غرض، کسی مقصد یا کسی کام کے لیے حاضر ہوتا تھا وہ ڈاکٹر صاحب کی علمیت وفضیلت اور ان کے درویشانہ رویے اور منکسرانہ مزاج سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔فروتنی اور عاجزی کا ان کی طبیعت میں بڑا دخل تھا۔میں سالہا سال تک ان کے قریب رہنے کا شرف حاصل کر چکا ہوں اور میں نے کبھی ان کے ہاں اس انا کا احساس نہیں کیا جو عام طور پر بڑے آدمیوں کی شخصیت کا لازمی جزو بن جاتی ہے''۔(۶۳)

مرزا ادیب انسان دوستی کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں اور یہی فکر ان کی تخلیقات میں بھی سرایت کیے ہوئے ہے۔

مرزا ادیب شخصیت نگاری کے فن اور کالم کی حدود سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس لیے وہ کالم میں کسی ادبی شخصیت کے بارے میں مجموعی تاثر اس مہارت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ شخصیت کی انفرادی خوبیاں اور ادبی صلاحیتیں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ شخصیت کے تذکرے میں وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں فصاحت و بلاغت کا تخلیقی اظہار بخوبی کرتے ہیں۔ جس کی مثال ان کا کالم ''پروفیسر مرزا محمد منور۔ اقبال ان کا آئیڈیل ہے'' کا یہ اقتباس ہے:

''میں پروفیسر مرزا محمد منور کا جب بھی تصور کرتا ہوں تو میرے سامنے روشنی کا ایک مینار آجاتا ہے۔ جو کئی راستوں کے سنگم پر کھڑا ہو اور اپنی روشنی ان تمام راستوں پر ڈال رہا ہو۔ ذرا ان کی ذہنی کاوشوں کی جہتوں پر ایک نظر ڈالیے ان کی شہرت ایک تو نام ور اقبالی سکالر کی حیثیت سے قائم ہے۔ مگر یہ تو ان کی تخلیقی شخصیت کا صرف ایک پہلو ہے باقی پہلوؤں کا احاطہ کریں تو وہ ایک معلم ہیں، شاعر ہیں اور شاعر بھی چار زبانوں کے مزاح نگار ہیں۔ اولادِ آدم کے حوالے سے فلسفی بھی ہیں''۔ (۶۴)

مرزا ادیب ایک درد مند دل کے تخلیق کار ہیں تعزیتی کالموں میں ان کا یہ رخ بڑی صفائی سے سامنے آتا ہے۔ یوں یہ ادبی کالم ان شخصیت نظریے اور احساس کے عکاس بن جاتے ہیں۔ انسان دوستی کی اسی سوچ کے تحت وہ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ اپنے نظریۂ ادب کا ذکر کرتے ہوئے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

''ادیب کی مستقل وابستگی ایک ایسی پارٹی سے برقرار نہیں ہوتی جسے عوام نے کچھ عرصہ کے لیے اقتدار سونپا ہے اس کی اصل وابستگی اپنے عوام سے ہوتی ہے۔ اس

خطۂ ارض سے ہوتی ہے۔ جس پر اس کے اپنے عوام رہتے ہیں۔ اس لیے ایک
سچے ادیب سے گروہی وفاداریوں کا مطالبہ غیر مناسب ہے۔ ادیب اپنی تخلیقی سر
گرمیوں کے لیے اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے اور یہ ضمیر اس کے اپنے
عوام کی روح سے نکلی ہوئی آواز ہے جو کبھی خاموش نہیں ہوتی جسے کبھی خاموش
نہیں کیا جا سکتا''۔(۶۵)

ایک تخلیق کار کے اندر ایک صاحبِ بصیرت نقاد بھی چھپا رہتا ہے۔ مرزا ادیب کی تنقیدی نظر ان کے کالموں میں تب نمایاں ہوتی ہے۔ جب وہ کسی فن پارے پر تبصرہ کر رہے ہوں۔ ان کا وصف یہ ہے کہ وہ تبصرہ برائے تبصرہ نہیں کرتے اور نہ ہی محض خانہ پری کے لیے کتاب کا سطحی تعارف پیش کرتے ہیں۔ وہ کتاب میں اتر کر عمیق مطالعے کے ذریعے اس کی روح کو قاری کے ذہنوں میں منتقل کرتے ہیں۔ حفیظ تائب کے نعتیہ مجموعے کے بارے میں اپنی تنقیدی رائے یوں بیان کرتے ہیں:

''حفیظ تائب نے کلاسیکی روایات سے صرف نظر نہیں کیا مگر ان علامات اور
استعارات سے اجتناب برتا ہے جو صنمیاتی تصورات کے پروردہ ہیں۔ دوسری
بات یہ ہے کہ نعت نگاری نے خدا کی صفات کو حضور مکرمؐ کی ذات سے وابستہ
نہیں کیا، حمد و نعت میں ایک فرق رکھا ہے۔ اور ایک ذمے دار نعت گو سے اسی کی
توقع رکھی جا سکتی ہے''۔(۶۶)

مرزا ادیب نے کالم کو ادبی رنگوں سے آشنائی دلائی۔ وہ ایک صاحب اُسلوب افسانہ نگار ہیں اور ان کا یہ تخلیقی وصف ان کے کالموں کی جان ہے کبھی کبھار وہ اپنے مخصوص طرزِ احساس یعنی رومانیت کے لمس سے بھی اپنے کالم کو

آشنا کرتے ہیں۔تب وہ منظر نگاری اور جزئیات نگاری کا بھی بھرپور استعمال کرتے ہیں:

''کیا کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ برسات کی کسی شام کو آپ نے اوپر دیکھا ہو اور چاند کو ایک کشتی سمیں کی طرح تیرتے ہوئے پایا ہو۔ ان لمحوں میں چاند کیسا خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ ایسا خوب صورت جیسا کنول کا پھول، جو جھیل کی سطح پر اپنی جھلک دکھا رہا ہو یا صبح سویرے وہ شبنم کا قطرہ جو برگِ گل پر ضیاء افروز ہو چاند ایک مثالی حسن کا استعارہ ہے، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ جس خاکداں ہستی میں ہم رہتے ہیں۔اس میں چاند نہیں ہوتے؟''۔(٦٧)

مرزا ادیب کے کالم اپنے دور کے ترجمان ہیں۔ان سے رفتارِ ادب کا اندازہ ہوتا ہے مرزا ادیب کا تخلیقی عہد اُردو کا ایک اہم تحریکی دور رہا ہے۔مرزا ادیب نے اجمالاً اس دور کا ذکر بھی کیا ہے۔یوں ان کے کالم تاریخِ ادب کا ایک اہم حوالہ بن جاتے ہیں۔بلاشبہ مرزا ادیب کے کالم اس قابل ہیں کہ انھیں ادبی دستاویز قرار دیا جائے۔

احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء۔۔۔۲۰۰۶ء)

مختصر تعارف:

اصل نام: احمد شاہ

ولادت: ۱۹۱۶ء، ضلع سرگودھا نامور شاعر، افسانہ نگار، محقق، نقاد، ڈرامانگار، کالم نگار

ادارت: بانی، فنون

کالم نگاری: روزنامہ ''جنگ''، پاکستان، ایکسپریس، مشرق، امروز، میں ''حرف وحکایت،، موج در موج، اور رواں دواں'' کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔

کتب:
- ☆ رم جھم (قطعات) ☆ کپاس کا پھول (افسانے)
- ☆ ندیم کی نظمیں ☆ ندیم کی غزلیں
- ☆ چوپال ☆ بگولے ☆ گھر سے گھر تک
- ☆ بازارِ حیات ☆ برگِ حنا ☆ طلوع وغروب

احمد ندیم قاسمی اُردو ادب کی سب سے بڑی تحریک انجمن ترقی پسند مصنفین کے فعال ترین رکن رہے ہیں۔ آپ کی وجہ شہرت ایک ترقی پسند شاعر اور افسانہ نگار کی ہے۔ اپنے ادبی نظریات کی اشاعت وترویج کے لیے احمد ندیم قاسمی نے رجحان ساز مجلّے ''فنون'' کا اجرا بھی کیا۔ اس مجلّے نے ادیبوں کی ایک نسل کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید کے ساتھ ساتھ قاسمی صاحب نے کالم نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔

ان کی کالم نگاری کے بارے میں ڈاکٹر عبدالغفار کوکب لکھتے ہیں۔

> ''احمد ندیم قاسمی کا شمار ان چند کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ جو اظہار و بیان کی بے پناہ صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ ان کے سیاسی اور تہذیبی مقاصد بڑے واضح اور نپے تلے ہیں''۔(۶۸)

قاسمی صاحب روزنامہ ''امروز'' میں اپنا مقبول عام کالم ''حرف حکایت'' لکھتے رہے۔ روزنامہ ''جنگ'' میں ان کا کالم ''لاہور، لاہور ہے''۔ اور ''موج در موج'' ''رواں دواں'' کے عنوان ہی سے چھپتے رہے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کی کالم نگاری کا سلسلہ نصف صدی پر محیط ہے۔ان کے کالموں میں ادبی رجحانات کے ساتھ فکاہیہ اور نیم فکاہیہ انداز تحریر کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

''تہذیب وفن''ان کے ادبی کالموں کا مجموعہ ہے۔یہ کالم انھوں نے ''امروز'' اخبار میں لکھے۔قاسمی صاحب کے کالموں کی فکری اساس ترقی پسند نظریے پر اُستوار ہے۔ان کے ہاں ادب،تہذیب اور سماج کی بدلتی اقدار پر ایک گہری اور سنجیدہ نظر ملتی ہے۔ان کا غالب موضوع علم وادب ہی ہے۔ترقی پسند نظریے کی ترویج و اشاعت ودفاع ان کا خاص طرز احساس ہے۔محمد عالم خان اس تناظر میں لکھتے ہیں:

> ''یہ ایسے کالم نگار ہیں جو مقبول عام روش سے ہٹ کر ادبی اور تخلیقی سطح پر خبر، شخصیت اور فکری رجحانات کا جائزہ لیتے ہیں اور یہی وہ انداز نگارش ہے جو کالم نگاری کے حقیقی خدوخال متعین کرتا ہے اور کالم نگاروں کو ان کے منصب سے آشنا کرتا ہے۔ایسے کالم نگاروں کی تعداد بہت کم ہے''۔(۶۹)

ان کالموں میں ادب کو ایک صحت منداور تہذیب سے سرشار معاشرے کی ایک معتبر اکائی قرار دیا گیا ہے اور ان امکانات کی راہ سمجھائی گئی ہے جو مہذب اور ترقی یافتہ سماج کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں ایک کالم میں لکھتے ہیں:

> ''پاکستانی تہذیب کا عنوان یقیناً تہذیب کا اسلامی تصور ہی ہے۔یہ حقیقت مفکرین اور دانشوروں کے ہر مکتب فکر کو قبول کر لینی چاہیے اور مزید کچھ مدت تک کسی خود فریبی میں مبتلا رہ کر پاکستان کی انفرادی تہذیب کے مسئلے کو ابہام کے سپرد نہیں کیے رہنا چاہتے۔البتہ اس حقیقت سے وابستہ ایک اور حقیقت سے آنکھیں چرانا بھی دانائی اور دور اندیشی نہیں اور یہ وہ حقیقت ہے کہ ہر تہذیب

میں اسی مٹی کی بو باس ضرور آجاتی ہے۔ جہاں وہ تہذیب پیدا ہوئی، پھیلی،

پنپی اور بدلی ہے''۔(۷۰)

وہ اپنے کالموں میں ادب کے زوال کو ایک لمحۂ فکریہ سمجھتے ہیں اور ان اسباب و محرکات کی نشاندہی کرتے ہیں جن کی وجہ سے اعلیٰ ادبی اقدار کو پھلنے پھولنے کا ماحول میسر نہیں آسکا۔ایسے ہی ایک مسلۓ کا ایک کالم میں یوں تجزیہ کرتے ہیں:

''آج کا ناشر خاصے نامور شاعر کا مجموعہ کلام شائع کرنے سے ہچکچاتا ہے۔کیونکہ وہ جانتا ہے کہ شاعری کے رسیا ہر ملک میں بہت کم تعداد میں ہوتے ہیں اور یہ ایسی صنف ادب ہے جس کی مانگ محدود ہے۔سو شاعر کی دنیا میں معیار کی پستی اتنی ہمہ گیری سے سرایت نہیں ہوتی۔ یہ کھیل ناول اور افسانے میں جاری ہے مگر افسانے میں بھی اس حد تک نہیں جس حد تک ناول میں اردو ناول تو بچوں کا کھیل ہو کر رہ گیا ہے۔ جو چاہتا ہے قلم اٹھاتا ہے ایک ضخیم ناول تخلیق کر کے ناشر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور ناشر ایسے ناولوں کی تاک میں ہوتا ہے۔ اس میں جذباتِ زندگی کو تولتا ہے۔ اس کی لذتیت کو ناپتا ہے اور پھر کہ ناول زیورِ طبع سے آراستہ و پیراستہ ہو کر جب منڈی میں آتا ہے۔تو ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے''۔(۷۱)

احمد ندیم قاسمی تخلیقی شخصیت کا پرتو ان تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔ شاعر اور افسانہ نگار کے ساتھ وہ ایک نظریاتی نقاد بھی ہین اور ادب برائے زندگی کا علم بردار بھی۔ وہ ہم عصر ادبی تخلیقات کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اپنے مطالعہ و تجزیے کو کالم کے ذریعے اپنے قارئین تک پہنچاتے ہیں۔فکری زاویے سے ان کالموں کو دیکھا جائے تو اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اپنے دور سے متعلق اہم سوالات کا احاطہ کرتے ہیں۔وہ ادبی دنیا

میں ہونے والی تبدیلیوں کے نبض شناس بھی ہیں اور ناقد بھی۔ ادبی مسائل کا جو تجزیہ احمد ندیم قاسمی کے ہاں ملتا ہے۔ وہ بہت ہی کم کالم نگاروں کا خاصا ہے۔

ہمارے ادب میں جمود کا سوال ایک عرصے تک زیر بحث رہا ہے۔ اپنے ایک کالم میں وہ اس پر ان لفظوں میں اظہار خیال کرتے ہیں:

''آج ادب میں نہ تو جمود ہے اور نہ یہ بات ہے کہ معیاری ادب تخلیق نہیں ہو رہا۔ اگر کوئی نقص ہے تو صرف یہ کہ ہم روح عصر سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ ادیبوں کی اکثریت روح عصر کی تلاش میں ذہنی طور پر مغرب میں قیام کر چکی تھی۔ آج ہمارے ادب میں تجدید اور علامت نگاری، ابہام اور مشکل پسندی اور زبان کے تجربوں اور نظموں کی تقلیدی صورتوں کے جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔ ان کی وجہ ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم آگے بڑھنے کی کوشش میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور ہم نے وہ ذمہ داریاں کما حقہ پوری نہیں کیں۔ جو بحیثیت پاکستانی ہم پر عائد ہوتی تھیں۔ ایک ہم پر ہی نہیں، دنیا کے ہر اس ادیب پر اس خطۂ زمین کی طرف سے عائد ہوتی ہیں۔ جہاں کا وہ رہنے والا ہے اور جس کی رعایت سے وہ اس کا ادب دوسرے لوگوں اور ان کے ادب سے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔
بے شک ہم عالمی حالات عالمی تحریکوں سے قطع نظر کر کے اپنے شعور کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ لیکن روح عصر کا تقاضا یہ ہے کہ یہ بین القومیت پس منظر کا کام دے اور پیش منظر میں پاکستان رہے''۔ (۲۷)

مٹی سے محبت ان کے فکر و فن کا بنیادی حوالہ ہے۔ وہ ایسے ادب کے داعی اور ترجمان ہیں جس کی جڑیں وطن کی

زمین میں گہرائی کے ساتھ پیوست ہوں۔ وہ اپنے کالموں میں بارہا اس سوچ کا پرچار کرتے ہیں کہ ایک شاعر وادیب کے لیے وطن سے محبت فرض کے درجے میں شامل ہے اور اسے ہر قیمت پر اپنے اس فرض سے دستِ بردار نہیں ہونا چاہیے۔ یوں ان کے کالم ادب کے ایک فکر انگیز نظریے کے آئینہ دار بن کر سامنے آتے ہیں۔ جس کی مثال ان کے کالم کا یہ اقتباس ہے:

''ادیب اور فنکار کی کومٹ منٹ بحیثیت انسان ایک انسانی برادری سے ہے وہ اس حقیقت سے کیسے انکار کرسکتا ہے کہ وہ نوع انسانی کا ایک فرد ہے اور اس وقت ذہنی یا روحانی یا تہذیبی، معاشرتی طور پر بلکہ جسمانی طور پر بھی، وہ جو کچھ بھی ہے۔ صد ہا صدیوں پر پھیلی ہوئی ایک عظیم انسانی جدو جہد کا نتیجہ ہے اور یوں وہ اس سلکِ گوہر کا ایک موتی ہے۔ یقیناً اس کی ایک الگ حیثیت بھی ہے۔ کیونکہ اگر ان الگ الگ اکائیوں کا وجود نہ ہو تو پورا سلسلہ نابود ہو جائے۔ مگر ان کی انفرادی حیثیت ایک کل کے جز کی حیثیت رکھتی ہے اس کو یہ انفرادیت عالم انسانیت سے وابستگی نے بخشی ہے اس لیے وہ اپنی ذات میں وہ پوری کائنات کے ساتھ اس کی کومٹ منٹ ازلی اور ابدی ہے''۔ (۷۳)

انسانی دوستی کے تناظر میں وطن پرستی کے جذبے کا یہی اظہار ایک اور کالم میں ملاحظہ فرمایئے:

''مجھے باقاعدہ تنقید نگار ہونے کا دعویٰ نہیں۔ ان مضامین کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے مفید رہے گا۔ یہ ایک تخلیقی فنکار کے تاثرات ہیں۔ جس کا نظریہ، یہ کہ جو شخص اپنے وطن اور قوم سے محبت نہیں کر سکتا وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتا اور جو محبت نہیں کر سکتا اسے حسن و خیر اور عدل و توازن کا شعور ہی حاصل نہیں ہو سکتا''۔ (۷۴)

احمد ندیم قاسمی کی کالم نگاری میں ایک جہانِ معنی آباد ہے۔ موضوعاتی تنوع سے نہ صرف ان کالموں کا فکری منظر نامہ وسعت اختیار کرتا ہے بلکہ یہ قاری کے ذوق سلیم کی اس طرز پر تربیت کرتا ہے کہ وہ ادب کے دریچے سے اپنی تہذیب اور سماج کے سبھی منظروں کو دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ادب، تہذیب، کلچر سیاست، عالمگیریت ان کے کالموں کے ایسے موضوعات ہیں۔ جسے انھوں نے اپنے رواں اُسلوب کے ساتھ کالموں میں برتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ قومی کلچر پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قومی کلچر نہ کوئی ایسی جنس ہے جسے بازار میں خریدا جا سکے۔ قومی کلچر تو اس قوم کے ہر فرد کے رگ وپے میں جاری وساری ہوتا ہے۔ وہ اسی کلچر کی روشنی میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے، سوچتا، فکر کرتا، محبت اور نفرت کرتا، ارادے باندھتا اور امنگیں پیدا کرتا تجربوں میں سے گزرتا اور آدرشوں کو اختیار کرتا، گاتا اور تصویریں بناتا، شعر کہتا اور مابعد الطبیعیات کو ادراک کی گرفت میں لاتا کائنات کو تسخیر کرتا ہے اور زندگی کو زندہ رہنے کے لائق بناتا ہے''۔ (۷۵)

احمد ندیم قاسمی اُردو کے ایسے کالم نویس ہیں جنھوں نے ادب کی ادراک کی صلاحیتوں کے ساتھ کالم کی صنف کو گہرائی عطا کی۔ ان کا اندازِ تحریر دلکش اور اُسلوب بیان آسان فہم اور رواں دواں ہے۔

ابراہیم جلیس (۱۹۲۳ء۔۱۹۷۷ء)

مختصر تعارف:

اصل نام: محمد ابراہیم حسن اعزاز: صدارتی تمغۂ برائے حسن کارکردگی

ولادت: ۲۲۔ستمبر ۱۹۲۳ء گلبرگہ (حیدرآباد دکن) وفات: ۲۶۔اکتوبر ۱۹۷۷ء، کراچی

ممتاز صحافی، ادیب، افسانہ نگار، خاکہ نگار، مزاح نگار، فلمی کہانی و مکالمہ نگار،

ادارت: ☆ روزنامہ'' انجام'' و ''مساوات'' کراچی

کتب: ☆ زرد چہرے ☆ الٹی قبر ☆ پتے کی بات ☆ قلمی جلیے
☆ دو ملک ایک کہانی ☆ نئی دیوار چین ☆ چالیس کروڑ بھکاری
☆ جیل کے دن جیل کی راتیں ☆ آزاد غلام ☆ جنگل میں منگل

ابراہیم جلیس ترقی پسند مصنفین کی ادبی تحریک کے اہم رکن ہیں۔ اور ان کے ترقی پسندانہ نظریۂ ادب کی جھلک ان کے افسانوں، ناولوں، رپورتاژ اور ادبی کالموں میں بھی ملتی ہے۔

۱۹۵۰ء میں جب وہ پاکستان آئے تو ''امروز'' لاہور اور کراچی کے علاوہ ''انجام'' لاہور اور ''مساوات'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ روزنامہ ''انجام'' میں بھی انھوں نے کالم نگاری کی۔ ۱۹۵۵ء میں روزنامہ ''جنگ'' کراچی کے کالم ''وغیرہ وغیرہ'' سے آپ کی کالم نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ کئی سال آپ اس سے وابستہ رہے اور اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ اس کے بعد آپ کا کالم روزنامہ ''حریت'' کراچی میں ''تکلف برطرف'' کے عنوان سے چھپتا رہا۔ ضیاء الحسن موسوی، ابراہیم جلیس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جلیس ذہین تھا۔ اس کے قلم میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ خود سماجی کیفیت کا مالک تھا۔ وہ معاشرے کی بے قراری اور اضطراب کا زمانہ تھا۔ اس نے بہت لکھا وہ بہت پڑھا گیا۔ وہ ایک حساس طبیعت رکھتا تھا۔ وہ اس آگ میں جلتا رہا مگر ہمیشہ قہقہے لگاتا رہا''۔(۷۶)

ابراہیم جلیس کے کالموں میں ترقی پسند نظریہ ادب کے زیراثر مساوات وجمہوریت کے خیالات ظریفانہ اندازِ تحریر کے پس منظر میں تحرک کا باعث بنتے ہیں۔انھوں نے اپنے کالموں میں با محاورہ اور رواں دواں آسان فہم زبان کو کمال مہارت سے برقرار رکھا ہے۔فصاحت و بلاغت کا یہی حسن ہے۔کہ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے تخلیقی ہنر سے اپنے کالم کی فضا کو سنوارتے ہیں۔وہ کسی کی تقلید کی اسیر نہیں۔اُسلوب ان کے اندر سے پھوٹتا ہے اس کے لیے وہ کسی شعوری کوشش یا تکلف کے قائل نہیں ہیں۔نہ ہی وہ لفظی ہیر پھیر کا سہارا لیتے ہیں۔نہ ہی وہ چبائے ہوئے نوالوں کے قائل ہیں۔ان کی خداداد ذہنی وتخلیقی صلاحیت کالم کے لفظ لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان کی کالم نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''الفاظ وتراکیب کا وہ مصنوعی اہتمام والتزام بھی ان کے یہاں نظر نہیں آتا جو آج کل ادیبوں کا فیشن بنتا جارہا ہے جلیس اپنے گردوپیش کی زندگی کے بارے میں جو کچھ محسوس کرتے ہیں۔اسی طرح روزمرہ کے لفظوں، سادگی، سچائی، بے خوفی، دیانت کے ساتھ پیش کردیتے ہیں۔ابراہیم جلیس بنیادی طور پر جذبوں کے آدمی ہیں۔ایسے جذبے جن کے بغیر سچائی، بے خوفی، دیانت، مردانگی، تخلیق کا فنکارانہ ظہور ممکن نہیں۔ظاہر ہے غوروفکر اور شعوروآگہی کا ہر پہلو جلیس کے ہاں بہت آسانی سے جذبے میں ڈھل جاتا ہے۔''(۷۷)

ان کے کالموں میں ایک جرات اِظہار اور حق گوئی کا وصف جابجا ملتا ہے۔وہ کسی لگی لپٹی رکھے بغیر کھل کر مگر ادبی مزاح کی صورت میں اپنا موقف بیان کرتے ہیں۔مثال کے طور پر قائد ملت لیاقت علی خان کی وفات کے بعد ان کے لکھے ہوئے ایک کالم سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''قائداعظم کے انتقال اور قائدِملت کی بشارت کے بزعم خود جتنے بھی ''پاکستان

بنانے والے'' تشریف لائے۔ اُنھوں نے پاکستان بنانے کی بجائے اپنی جان بنانی شروع کردی۔ جس کو دیکھو اقتدار کی لسی پی کر جان بنا رہا ہے۔ ''وزیر بنو اور جان بناؤ'' کا سلسلہ کچھ ایسا چلا کہ پاکستانی عوام تنگ آ کر پھر سے ''جان بُل'' کو یاد کرنے لگ گئے تھے۔'' (۷۸)

اُردو کالم کا اُسلوبیاتی مطالعہ کیا جائے تو جو صاف اور شستہ زبان ہنر اور سلیقے کے ساتھ ابراہیم جلیس نے استعمال کی ہے۔ وہ بہت کم کالم نگاروں کا حصہ ہے۔ وہ باریک بین قلمکار تھے۔ حالات اور واقعات کا ایک خاص نکتہ نظر سے جائزہ لیتے اور پھر ان میں سے بنیادی حوالے اخذ کر کے اسے اپنے تخیل کے رنگ میں رنگنے کے بعد شگفتگی اور لطافت کے ساتھ کاغذ پر اتارتے ان کے کالم پروپیگنڈے اور تنقید برائے تنقید کے عیب سے پاک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بوجھل اور بیزار موضوعات پر قلم اٹھاتے بھی ان کے لطف و لطافت کی وہ خاص فضا قائم رہتی ہے جو ایک بڑے کالم نگار کے دست ہنر کا کمال سمجھی جاتی ہے۔

تاج سعید (۱۹۳۳ء۔۲۰۰۲ء)

مختصر تعارف:

اصل نام: تاج محمد ولدیت: پیر محمد

ولادت: ۱۶۔ستمبر ۱۹۳۳ء پشاور وفات: ۲۳۔اپریل ۲۰۰۲ء پشاور

صحافی، شاعر و ادیب

ادارت: مدیر بانی، ماہنامہ ''قند'' مردان

اسکرپٹ رائٹر زریڈیو پاکستان پشاور

شعری کتب: ☆ سوچ سمندر ☆ رتوں کی صلیب ☆ لیکھ

نثری کتب: ☆ پشتو ادب کی مختصر تاریخ ☆ جہان فراق ☆ ہم قلم

☆ پشتو کے اردو تراجم ☆ خوشحال شناسی

تاج سعید کا شمار ادبیاتِ سرحد کے اہم ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک کثیر الجہت ادبی شخصیت تھے۔ شاعر، ،نثر نگار، اور ''قند'' اور ''جریدہ'' جیسے عہد ساز ادبی رسائل کے مدیر رہے۔ ادبی کالم کی روایت کو آگے بڑھانے میں بھی ان کا بڑا حصہ ہے۔ صوبہ سرحد میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے بعد جس ادبی شخصیت نے کالم نویسی میں نام کمایا وہ تاج سعید ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان تاج سعید کی کالم نگاری کے باب میں لکھتے ہیں:

''تاج سعید کی ادبی جہتوں میں ایک نئی جہت کا اضافہ ان کی ادبی کالم نگاری ہے
یہ کام انھوں نے دیر سے کیا مگر تھوڑے ہی عرصے میں مضامینِ قدیم ونو کے انبار
لگا دیے ہیں اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ ادبی نثر لکھنا بھی ان کے لیے مشکل نہ تھا۔

اب وہ ایک کالم نگار اور نثر نگار بھی بن چکے ہیں''۔(۷۹)

تادم تحریر تاج سعید کے ادبی کالموں کا ایک ہی مجموعہ ''رشتے اور رویئے'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ جو تین حصوں پر مشتمل ہے اور یہ تینوں حصے ادب اور ادبی شخصیات سے متعلق تبصرے اور تجزیوں پر مشتمل ہیں۔ پہلے حصے کا نام ''یادوں کے چراغ'' ہے۔اس میں کل ۵ کالم شامل ہیں۔جن کے عنوانات یہ ہیں۔

(۱) دوستوں کی یادوں کی زنجیر (۲) سمندر پار دوستوں کے نام (۳) نیاز مندان پشاور
(۴) گزرتے ہوئے لمحوں کی چاپ (۵) طفیل اختر کی پھرتیاں

دوسرے حصے یعنی شخص و عکس میں ادبی شخصیات کو ان کی نگارشات و شخصیت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس حصے میں شامل کالموں کی تعداد ۲۳ ہے۔جبکہ آخری حصے کا عنوان ''مطالعے اور تجزیئے'' ہے۔اس میں ۱۰ کالم شامل ہیں جو ادبی کتب و رسائل و جرائد کے تبصرے پر مشتمل ہے۔

تاج سعید نصف صدی سے زیادہ عرصے تک اُردو ادب کے کارواں میں شامل رہے ہیں۔ انھوں نے بحثیت شاعر اور دو موقر ادبی مجلوں ''قند'' ''مردان اور ''جریدہ'' پشاور کے مدیر بھی رہے ہیں۔اس لیے انھیں جدید اُردو ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کے براہ راست مواقع میسر آئے۔جن کی گواہی ان کے کالم بھی دیتے ہیں۔

تاج سعید بڑی فنکاری کے ساتھ ماضی کے اوراق اُلٹتے ہیں اور ان ادبی محفلوں اور ادیب دوستوں کا ذکر کرتے ہیں۔جن کے دم قدم سے ادبی دنیا کی رونق جاری و ساری رہتی ہے۔یاد نگاری کے اس لطیف عمل کا آغاز وہ بڑے رومانوی انداز میں کرتے ہیں۔اپنے ایک کالم بعنوان ''گزرے لمحوں کی چاپ'' میں وہ لکھتے ہیں:

''آج کچھ گزری ہوئی بھولی بسری یادوں کو تازہ کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔جن
دنوں میں ''قند'' کی ادارت کے سلسلے میں مردان میں مقیم تھا تو فارغ بخاری

صاحب کا کلینک بازار کریم پورہ میں تھا۔ ہفتہ میں ایک دو بار میں مردان کی
اداس فضا سے بھاگ کر جب پشاور آتا تو دوستوں سے مل کر دل خوش ہو جاتا۔
ان دوستوں سے پشاور کی ادبی سرگرمیوں اور چپقلشوں کا احوال بھی معلوم ہو جایا
کرتا تھا''۔(۸۰)

ماضی کے ذکر میں تاج سعید اتنی گہرائی کے ساتھ ڈوب کر لکھتے ہیں کہ قاری چند لمحوں کے لیے اپنے حال سے لاتعلق ہو کر کالم کی فضاؤں میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ یہ تاج سعید کے تخیل کا کمال ہے کہ اس کے حافظے میں وہ محفلیں ابھی تک چلتی پھر رہی ہیں۔ تاج سعید کو یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ وہ بڑی ترتیب کے ساتھ ماضی کی تصویر حال کے کینوس پر اتار دیتے ہیں۔ اس عالم میں وہ ایک کہانی گو کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یادگاری کے تناظر میں وہ لکھتے ہیں:

''۔۔۔دھندلی اور بھولی بسری یادوں کو زندہ اور تازہ کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے
کہ آپ اپنی فکر و خیال کی دنیا آباد کر کے بیٹھ جائیں اور گزرے دنوں کی یادوں میں
کھو جائیں اس طرح آپ کا ماضی حال بن کر آپ کے دوستوں کی یادوں اور ان کی
محفلوں کی رونق کو آپ کی نظروں کے سامنے لے آتا ہے اور آپ بالکل ایک نئی اور
آباد دنیا کا حصہ بن جاتے ہیں۔ میری یادوں کا یہ دریچہ بھی کھل رہا ہے۔ اس میں
جھانکنا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر کا منظر بڑا ہی دلکش ہے اور اس میں جو
صورتیں نظر آ رہی ہیں۔ ان کا دیدار محبوب کے دیدار سے کسی طرح کم نہیں ہے۔
شرکائے محفل کی پھلجڑی پر قہقہے لگائے جا رہے ہیں''۔(۸۱)

ماضی کی یہ یادیں ''ادبیات سرحد'' کی تاریخ کا روشن باب ہیں تاج سعید نئی نسل کو اپنے ماضی کے عہد ساز ادبی دور سے آگاہی دلانے کے لیے گاہے بہ گاہے بھولی بسری یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ نیاز مندان پشاور کا احوال بھی ایسا ہی کالم ہے جو ادبیات پشاور کی ۵۰ کی دہائی کی ایک زرخیز محفل کا تذکرہ ہے۔ ایک اور کالم ''سمندر پار دوستوں کے نام'' میں ان ادیب دوستوں کا ذکر ہے۔ جو کبھی پشاور کی ادبی زندگی کی رونق ہوا کرتے تھے۔ اور بعدازاں ساتھ سمندر پار امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں آباد ہوتے پشاور کے ان دوستوں میں ڈاکٹر امجد حسین انور خواجہ، ارشاد احمد صدیقی، سجاد حیدر وغیرہ کی یادیں تازہ کی گئی ہیں۔

ماضی سے وہ حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ اُردو ادب کی نئی کتب سے اپنے قارئین کو متعارف کراتے ہیں۔ تاج سعید اُردو دنیا کے باخبر شہری تھے جہاں کہیں بھی ادب کی کوئی نئی اہم کتاب شائع ہوتی چند ہی ہفتوں بعد وہ تاج سعید کے مطالعے کی میز پر موجود ہوتی۔ تاج سعید نے بڑی محبت اور توجہ سے ان کتابوں پر تبصرہ کیے ہیں۔ ان کالموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں تبصرہ نگاری کے فن میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے وقت وہ صاحب کتاب کا تعارف اتنی مہارت وضاحت سے کراتے ہیں۔ کہ کتاب کا پس منظر سمجھنے کے ساتھ ساتھ قاری ادبی دنیا میں صاحب کتاب کے مرتبے ومقام سے بھی واقف ہوجاتا ہے۔ تاج سعید کی اس صلاحیت کا اندازہ معروف شاعرہ ادا جعفری کے شعری مجموعوں پر لکھے گئے کالم ''ادا جعفری۔۔۔ اُردو شاعری کی خاتون اول'' سے بھی ہوتا ہے۔ کالم کے آغاز میں ادا جعفری کی مجموعی ادبی شخصیت پر ایک تاثر سپرد قلم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان کی شعری خدمات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ آخر میں ان کی شاعری سے انتخاب پیش کر کے قارئین کے ذوق شعری کے لیے تسکین کا سامان فراہم کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

ایک دوسرے کالم ''آغا بابر اپنی تحریروں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے'' میں معروف افسانہ نگار آغا بابر کی تخلیقی

صلاحیتوں کا تعارف ہے۔تاج سعید کے اندازِ تحریر کی خوب صورتی یہ ہے کہ وہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے فن سے آگاہ ہیں۔معروف ونقاد ڈاکٹر انعام الحق کوثر، تاج سعید کی ادبی کالم نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''محترم تاج سعید کی کتاب ''رشتے رویئے'' ان کے ادبی کالموں کو مجموعہ ہے ان میں کتابوں کے ذکر کے علاوہ ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ جہاں کہیں ضرورت پڑی ہے۔ اُنھوں نے اپنی سوانح حیات کے بعض اہم واقعات کو بھی شامل کر کے آپ بیتی کو جگ بیتی میں بدل دیا ہے۔ان کی سوچ بے لاگ واضح اور سپاٹ ہے۔انھوں نے مختلف رویوں اور رشتوں کا اظہار بڑی مہارت، اثر انگیزی، چابکدستی اور ہنرمندی سے کیا ہے۔میری رائے میں تاج سعید نے زندگی کے انمول پل پل ،لمحہ لمحہ، گھڑی گھڑی اور دم دم کو خوب صورتی وزیبائی سے تحریر کی لڑی میں پرو کر اپنے حلقہء اثر کو بہت وسیع کر لیا ہے''۔(۸۲)

تاج سعید کا اُسلوب عام فہم اور رواں دواں ہے ان کی تحریر پڑھتے وقت قاری کسی مشکل کا شکار نہیں ہوتا۔ ان کا اندازِ تحریر تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ادبیت کے حسن نے ان کی تحریر کو پرکشش اور دلکش بنا دیا ہے۔ان کے کالم نہ صرف ان کی مضمون آفرینی کے عکاس ہیں بلکہ ان کی شعر فہمی کا مظہر بھی ہیں۔کالموں کے اس مجموعے میں جہاں شاعروں کے بارے میں تاج سعید نے انتقادی جائزے پیش کیے ہیں، وہی شاعری کے بارے میں اپنا نکتۂ نظر بھی صفائی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔اُسلوب کی یہ خوب صورتی جلیل عالی کی شاعری کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔تاج سعید کے کالم میں دیکھیے:

''جلیل عالی کی من موہنی اور خاموش شخصیت اور دھیما انداز دلوں میں ترازو

ہونے والا ہے اور یہی انداز اس کی شاعری کا بھی حصہ ہے۔ زندگی کے خُوب
صورت رنگوں پر جاں نثار کرنے والا یہ شاعر جب شعر کہتا ہے تو اس کے شعروں
میں لفظوں اور حرفوں کی خوشبو پھوٹ پڑتی ہے اور یوں کویتا کے رنگ نکھر
نکھر جاتے ہیں۔ یہ رنگ بالکل دھنگ کے رنگوں کی طرح ہیں اور ان کی روشنی
ماند پڑنے والی نہیں بلکہ انھی وجہ سے ستاروں کی روشنی جواں ہے اور جلیل عالی
نے جس دریا کو پار کرنے کے لئے رنگ اور روشنی کا سہارا لیا ہے اس پر مکمل اعتماد
ہے اور اسی اعتماد کے بھروسے پر تو دنیا سر کی جاسکتی ہے''۔(۸۳)

تاج سعید اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے بوجھل اور ثقیل تراکیب سے اجتناب برتتے ہیں۔ وہ مشکل لفظیات وتراکیب سے قاری کو مرعوب کرنے کی بجائے مانوس لفظوں کا تخلیقی استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تاج سعید ایک شاعر بھی ہے اور جو لفظوں کے صوتی، معنوی اور تخلیقی جہتوں کا شناسا ہے جس کا احساس تاج سعید کے کالموں کے عنوانات سے بھی ہوتا ہے۔''ادب وشعر کا تابندہ ستارہ اور شاعری کا سنگ زادہ''، ''رشید امجد منفرد تخلیق کار''، ''مرتضٰی برلاس سچا اور کھرا شاعر''،''یادوں کے سہارے جینے والا فنکار'' اور دیگر عنوانات تاج سعید کی لفظ شناسی کے آئینہ دار ہیں۔

تاج سعید کی کالم نگاری نئے ادب اور تازہ ادبی صورتحال کو سمجھنے کے لیے سامان فکر فراہم کرتے ہیں اپنے ایک کالم میں وہ پشاور کی نئی ادبی صورتحال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ان دنوں پشاور کی اُردو ادبی انجمنیں جمود کے حصار میں ہیں۔ انجمن ترقی پسند
مصنفین اور انجمن ترقی ادب اُردو تو اب قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔ حلقۂ ارباب

ذوق پشاور کسی زمانے میں خاصا فعال تھا یہ نوجوان لکھاریوں کی تربیت کا ایک
موثر ادارہ تھا۔لیکن اب یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ حلقۂ بے جان ہو گیا ہے اور اس
کی تنقیدی نشستیں تعطل کی شکار ہیں۔شاید حلقہ ارباب ذوق اور پشاور کی
دیگر ادبی انجمنیں تازہ خون کے انتظار میں ہیں۔جو اس کے چہرے کی تازگی
کو لوٹا سکے''۔(۸۴)

اُردو کالم میں تاج سعید ایک توانا آواز ہے۔ان کے مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ کالموں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ادبی کالم نگاری ان کے اس مشن کا حصہ رہا ہے۔جس کے ذریعے وہ اردو ادب کے فروغ کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے۔ممتاز ادیب ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی یہ رائے بجا ہے کہ:

''تاج سعید نے تھوڑے ہی عرصے میں ایک میٹھے اور مدھم کالم نگار کی حیثیت سے
اپنے آپ کو منوالیا ہے۔گزشتہ چند برسوں میں انھوں نے جتنے رسالوں، کتابوں
اور مصنفوں کو دنیائے ادب میں اپنے کالموں کے ذریعے پھر سے زندہ کیا ہے۔
اس کی مثال کسی دوسرے لکھنے والے کے ہاں نہیں ملتی ۔ان کے کالم سے ایک
طرح کی باقاعدہ توسیعی لیکچر اختیار کا درجہ حاصل کر جاتے ہیں''۔(۸۵)

ان کے کالموں کا ایک اور منفرد حوالہ یہ بھی ہے۔کہ انھوں نے صوبہ سرحد اور پشاور کی اُدبی زندگی کو اپنے کالم کے ذریعے پوری اُردو دنیا تک پہنچایا۔ بلاشبہ وہ ادبی کالم نگاروں کی صنف اول میں شامل ہیں۔

☆☆☆☆

انتظار حسین (۱۹۲۵ء):

مختصر تعارف:

ولادت: ۲۱ دسمبر ۱۹۲۵ء معروف افسانہ نویس، ناول نگار، سفر نامہ نگار، کالم نگار، ڈراما نگار

کالم نگاری: پچیس برس تک روزنامہ ''مشرق'' میں ''لاہور نامہ'' کے عنوان سے روزانہ کے حساب سے کالم لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ روزنا ''جنگ'، پاکستان، اور مقامی کئی اخبارات میں ان کے کالم چھپتے رہتے ہیں۔

کتب: ☆ ذرے (کالموں کا مجموعہ) ☆ بوند بوند (کالموں کا مجموعہ)
☆ چراغوں کا دھواں (آپ بیتی)

ناول: ☆ بستی ☆ چاند گرہن ☆ آگے سمندر ہے

افسانے: ☆ خیمے سے دور ☆ زمین اور فلک اور ☆ آخری آدمی
☆ دن اور داستان ☆ کنکری ☆ خالی پنجرہ
☆ گلی کوچے ☆ کچھوے ☆ شہر افسوس
☆ شہرزاد کے نام ☆ ملاقاتیں ☆ نئے شہر پرانی بستیاں

انتظار حُسین اُردو کے ایک بڑے افسانہ نگار ہیں۔ افسانوں کے ساتھ انھوں نے ناول بھی لکھے۔ ڈرامے بھی لکھے۔ تراجم بھی کیے تذکرے اور یادنگاری سے بھی تعلق رکھا۔ کئی اخبارات اور رسائل کی مجلس ادارت کے رکن بھی رہے اور اس کے ساتھ ساتھ ادبی کالم نگاری سے بھی ناطہ جوڑے رکھا ان کا کالم آج بھی لاہور کے مقامی اخبار میں چھپتا ہے۔ تاحال انتظار حُسین کے ادبی کالموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''ذرے'' ۱۹۷۶ء میں پاکستان فاؤنڈیشن لاہور کے زیر اہتمام چھپا۔ کتاب میں ڈاکٹر سہیل احمد خان ''دیباچہ'' ''ایک شہر کے

سراغ‘‘ میں بھی شامل ہے۔ان کے کالموں کا دوسرا انتخاب ’’بوند بوند‘‘ لاہور سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا ہے۔اس مجموعے میں ان کے کالموں ’’لاہور نامہ‘‘ کا وسیع انتخاب شامل ہے۔یہ کالم ۱۹۶۴ء سے لے کر ۱۹۸۸ء تک کے عرصے کے ہیں۔اس کتاب میں انتظار حُسین کا پیش لفظ ’’ڈیڑھ بات‘‘ کے عنوان سے شامل ہے۔

انتظار حُسین کے کالموں کے عنوان ’’لاہور نامہ‘‘ سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لاہور کے ادبی حلقوں ،ادبی محفلوں،ادبی انجمنوں،آرٹس کونسلوں اور دو ہوائی تہذیبی فضا کے گرد گھومتے ہیں۔ان کے کالموں کے بنیادی موضوعات میں کلچر،تہذیب وثقافت شامل ہے۔وہ ادب اور تہذیب کے بدلتے رویوں کے عکاس ہیں۔جیسا کہ ان کے کالموں کے مجموعے ’’ذرے‘‘ کے فلیپ پر لکھا ہے:

> ’’انتظار حُسین کے کالم وہ آئینے ہیں جن میں اس تہذیبی تاریخ کے مختلف نقوش کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔انتظار حُسین نے ہماری قومی زندگی کے اہم تہذیبی واقعات، حادثات اور روزمرہ زندگی کے بے شمار تجربوں کی بہت سی تصویریں اکٹھی کی ہیں۔انتظار حُسین کے اُسلوب میں ظرافت طنز و دردمندی کے لہجے گھل مل کر منفرد شکل اختیار کر گئے ہیں‘‘۔(۸۶)

ڈاکٹر سہیل احمد خان کی رائے بھی کافی معتبر ہے وہ لکھتے ہیں:

> ’’ان کالموں میں شہر کی مختلف تصویریں ہیں۔دانشوروں کی تصویریں ہیں۔ادبی جلسوں کی تصویریں ہیں۔مذاکروں،بحثوں اور مجموعوں کی روداد، جنگ کے دنوں اور بدلتے ہوئے موسموں کی تصویریں، جنازوں کی تصویریں اور رزمتگان کا ماتم‘‘۔(۸۷)

انتظار حُسین اپنے کالموں کی فضا تہذیب وادب کے گرد بنتے ہیں ان کے کالموں میں اپنے دور کے ادب ترجمانی بطریق احسن ملتی ہے۔وہ کبھی پاک ٹی ہاؤس،اور ادیبوں کے دیگر بیٹھکوں کی خبر دیتے ہیں،اور کبھی اپنے

موضوعات آرٹس کونسل پالیسی ادبی جیسے کی تقریب سے جیسے ہیں۔ادب کے باذوق قارئین ان کے حلقہ اثر میں رہتے ہیں۔انتظار حُسین کے کالموں میں کسی نئے شعری مجموعے یا نثری کتاب کے حوالے سے ہلکا پھلکا پرتبسم تبصرہ بھی مل جاتا ہے۔ادب کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ظریفانہ انداز میں سیاست کے ہنگامی موضوعات پر بھی کالم باندھتے ہیں تاہم ان کے زیادہ تر کالم ادب ہی کے گرد گھومتے ہیں۔سیاست پر لکھتے ہوئے بھی ان کے ہاں سنجیدگی کا عنصر محسوس نہیں ہوتا بلکہ وہ ادبی ظرافت کے رنگ میں اپنے سیاسی موضوع کو رنگتے ہوئے اسے کاغذ پر اُتارتے ہیں۔انتظار حُسین بڑے میٹھے لہجے میں خط ادب دوستی سے لے کر خطرات دوستی تک کے روّیوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ان کے نزدیک درختوں اور پھولوں کی مہک اور شادابی بھی تہذیب کا حصہ ہے اور ان کا زوال تہذیب کا زوال ہے۔ایک کالم میں وہ لکھتے ہیں:

''تہذیبیں اپنے پھولوں سے پہچانی جاتی ہیں مگر پاکستان کی نئی تہذیب انگریزی پھولوں سے پہچانی جاتی ہے۔اُجلے مہکتے پھول ہوا اور مٹی کے ایک مخصوص رنگ انسانوں کے ایک مخصوص مزاج کے نمائندے ہیں۔اب یہ سب پھول مرجھا چکے ہیں اور چنبیلی جسے قومی پھول قرار دیا گیا تھا ہمارے درمیان سے یوں گم ہے جیسے قومی شعور گم ہو۔اب بے بوخوشبو رنگ برنگے انگریزی پھول نئے بھڑکیلے ہوا کی بہار میں اور جناح باغ میں دیسی پھولوں کے سوا باقی سب پھولوں کی اجازت ہے''۔(۸۸)

اسی طرح ایک اور کالم میں پنجاب یونیورسٹی کے مرکزی دروازے کے سامنے ایک گھنے درخت کے کٹنے پر اپنی اداسی کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''۔۔۔۔اس ہفتے عجیب افتاد پڑی کہ سڑک کو توسیع کی فکر کرنے والوں نے اس پر آرا چلایا اور اس صاحبِ منزلت مقتول کی لاش کئی دن تک مال روڈ پر پڑی

رہی۔ ایک سابق طالب علم نے مال روڈ پر چلتے چلتے اس لاش کو دیکھا اور افسوس کے ساتھ کہا کہ میں اس کے نیچے کھڑا ہو کر اس کا انتظار کرتا تھا تب میں نے یہ سوچا کہ اس جوان علاقہ کے اس بوڑھے درخت سے انتظار کی کتنی یادیں اور ملنے نہ ملنے کے کتنے واقعات وابستہ ہوں گے۔۔۔۔'' (۸۹)

انتظار حسین بنیادی طور پر ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ ان کے کالموں میں بھی وہی پرکشش اور مانوس افسانوی فضا چھائی رہتی ہے۔ وہ معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی افسانوی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ چونکہ انھیں اس انسانی نفسیات کا ادراک ہے کہ ہر انسان بنیادی طور پر افسانے کو پسند کرتا ہے۔ اس لیے ان کے قاری ان کے کالموں سے اپنے اس ذوق کی تسکین بھی کرتے ہیں۔ وہ کالموں میں افسانوی رنگ بھرنے کے لیے واقعہ کو مکالمے کے انداز میں آگے بڑھاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ موقع محل کے مطابق ایک دو فقروں میں منظر نگاری کا حسن بھی پیدا کر لیتے ہیں اور قاری کو خط پہچانے کے لیے تجسس کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ جو افسانے کی جان سمجھی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل کالم کے اقتباس میں ان کا افسانوی رنگ دیکھیے:

''مگر اب تو یہ تجاویز اچھی خاصی باسی ہو چکی ہیں۔ منیر نیازی نے کرائے کے مکان کی تلاش رائٹرز کالونی کے تصور میں ملتوی کر دی تھی۔ اس نے مکان کی تلاش پھر سے شروع کی اور آخر ایک کونا تلاش کر لیا اور انجم رومانی نے اپنے خریدے ہوئے پلاٹ پر مکان کی تعمیر کا ارادہ رائٹرز کالونی کے حسین خواب کی نذر کر دیا تھا۔ اس نے سیمنٹ اور اینٹیں خرید لی ہیں۔ ادھر ریجنل سیکرٹری قتیل شفائی صاحب راولپنڈی میں تو ادیبوں سے کالونی کا وعدہ کر آتے ہیں مگر لاہور کے ادیب جب ان سے یہی سوال کرتے ہیں تو جواب میں وہ اپنی نئی غزل سنا

دیتے ہیں۔ بہر حال رائٹرز کالونی ہنوز شاعر کا خواب ہے یا یوں کہیے کہ مطلع تو ہو گیا ہے مگر زمین اتنی سخت ہے کہ اس میں غزل نہیں ہو پائی''۔(۹۰)

انتظار حسین کے کالم میں طنز وظرافت کے کئی ایک عمدہ نمونے بھی ملتے ہیں۔ان کے کئی کالموں کے عنوان ہی سے قاری زیر لب مسکرانے لگتا ہے۔مثال کے طور پر ان کے یہ عنوانات بے انتہا دلچسپی کے ہوتے ہیں۔''ٹماٹر بھی جذبات رکھتے ہیں'' ''سائیکل والی رخصت ہوگئی'' ،''محکمہ موسمیات ہمارے اندر ہے'' ،''جلیبیوں سے تجریدی مصوری تک'' ،''بارش اوے''، ''رخصتی اور نیند''، ''ایک نون غنہ پر براماں گئے تم'' وغیرہ وغیرہ۔ ان کے طنز میں تلخی نہیں ہوتی بلکہ ہمدردی اور پیار کے ایک جذبے کے زیر اثر ایک نرم ملائم احساس ملتا ہے۔ان کی قلم کی ظرافت سمجھنے کے لیے ذیل میں ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ممتاز مفتی صاحب کے پاس مال ہے نایاب، پر گاہک ہیں اکثر بے خبر، دینائے ادب میں پنڈی سے باہر کم ادیبوں کو یہ پتا ہے کہ اب مفتی صاحب افسانے اور ناول سے گزر کر ہومیو پیتھی میں بھی قدم رکھتے ہیں۔۔۔۔البتہ اشفاق احمد کا کیس عجب ہے ویسے تو ان کا انگوٹھا اور ساری انگلیاں ایک کام کرتی ہیں اور قلم خوب فراٹے بھرتا ہے۔مگر ٹی وی اور ریڈیو میں جولانیاں دکھانے کے بعد افسانے کی طرف آتا ہے۔انگوٹھا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اب یہ مفتی صاحب ہی تشخیص کر کے بتائیں گے۔کہ ایسا کیوں ہے؟''۔(۹۱)

انتظار حسین نے اپنے کالموں میں ادبی شخصیات مذاکروں اور مباحثوں کی تصویر کشی بھی اپنے مخصوص اسلوب میں کی ہے۔جب ان کے کالم میں کسی ادبی شخصیت کا ذکر ہوتا ہے۔تو ساتھ ساتھ ان کا ناک نقشہ نفسیات،انداز فکر اور مزاج کی پرچھائیاں بھی لفظوں میں منتقل کرتے ہیں۔اس وقت وہ جس روانی اور بے تعلقی کے ساتھ زیر بحث ادبی شخصیت کی نکتہ آفرینیاں بیان کرتے ہیں۔وہ ان کے کالموں کا خاص حوالہ ہے۔بقول اسحاق وردگ:

''انتظار حسین کے کالم پڑھتے ہوئے ہماری ملاقات ایک ایسے خاکہ نگار سے ہوتی ہے جو شاعروں اور ادیبوں کے اندر لکھی ہوئی کتاب پڑھنے اور سمجھنے کا اسم اعظم جانتا ہے''۔(۹۲)

اس رائے کی تفہیم کے لیے انتظار حسین کے کالم سے ایک ادبی شخصیت کا ذکر ملاحظہ کیجیے:

''حسرت موہانی کی مصروفیتیں دو تھیں جیل جانا اور غزل لکھنا۔ ویسے اس بزرگ کے یہاں سیاست اور شاعری شعور کے دو الگ الگ منطقے تھے۔غزل اک اپنا رنگ تھا۔سیاسی سرگرمی کا اپنا رنگ تھا''۔(۹۳)

ان کالموں کی زبان ایک اہل تخلیق کار کی زبان ہے۔اس لیے اس میں وہ فطری آہنگ اور روزمرہ ومحاورے کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ترکیب سازی کا تخلیق اظہار بھی اس زبان کا انفرادی وصف ہے۔کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی انتظار حسین کے کالموں کی زبان کی ادبی چاشنی سے قاری تادیر محظوظ ہوتا ہے۔

انتظار حسین کی ادبی کالم نگاری کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل احمد خان یہ ماہرانہ رائے دیتے ہیں:

''یہ کالم محض روزمرہ واقعات کا بیان نہیں نہ ہی یہ محفل موعظ حسنہ ہیں۔ یہ تو تہذیب کے ٹوٹے ہوئے آئینے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں۔ آیئے ان ٹکڑوں کو جوڑ کر دیکھتے ہیں۔شاید اپنے آپ سے آشنا ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہو''۔(۹۴)

انتظار حسین کے ادبی کالم ادب اور تہذیب کو سمجھنے کا وسیلہ ہیں۔زندگی کے روز وشب سے بھرپور ان کالموں میں تخیل آفرینی کے وہ پھول کھلے ہوتے ہیں۔ جو ہمیشہ تروتازہ رہیں گے۔

☆☆☆☆

''انتظار حسین کے کالم پڑھتے ہوئے ہماری ملاقات ایک ایسے خاکہ نگار سے ہوتی ہے جو شاعروں اور ادیبوں کے اندر لکھی ہوئی کتاب پڑھنے اور سمجھنے کا اسم اعظم جانتا ہے''۔(۹۲)

اس رائے کی تفہیم کے لیے انتظار حسین کے کالم سے ایک ادبی شخصیت کا ذکر ملاحظہ کیجیے:

''حسرت موہانی کی مصروفیتیں دو تھیں جیل جانا اور غزل لکھنا۔ ویسے اس بزرگ کے یہاں سیاست اور شاعری شعور کے دو الگ الگ منطقے تھے۔غزل اک اپنا رنگ تھا۔سیاسی سرگرمی کا اپنا رنگ تھا''۔(۹۳)

ان کالموں کی زبان ایک اہل تخلیق کار کی زبان ہے۔اس لیے اس میں وہ فطری آہنگ اور روزمرہ ومحاورے کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ترکیب سازی کا تخلیق اظہار بھی اس زبان کا انفرادی وصف ہے۔کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی انتظار حسین کے کالموں کی زبان کی ادبی چاشنی سے قاری تا دیر محظوظ ہوتا ہے۔

انتظار حسین کی ادبی کالم نگاری کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل احمد خان یہ ماہرانہ رائے دیتے ہیں:

''یہ کالم محض روزمرہ واقعات کا بیان نہیں نہ ہی یہ محفل موعظ حسنہ ہیں۔ یہ تو تہذیب کے ٹوٹے ہوئے آئینے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں۔آیئے ان ٹکڑوں کو جوڑ کر دیکھتے ہیں۔شاید اپنے آپ سے آشنا ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہو''۔(۹۴)

انتظار حسین کے ادبی کالم ادب اور تہذیب کو سمجھنے کا وسیلہ ہیں۔زندگی کے روز وشب سے بھرپور ان کالموں میں تخیل آفرینی کے وہ پھول کھلے ہوتے ہیں۔جو ہمیشہ تروتازہ رہیں گے۔

☆☆☆☆

جمیل الدین عالی (۱۹۳۰ء)

مختصر تعارف:

نامور شاعر، ادیب، سفرنامہ نگار، کالم نگار

کالم نگاری: روزنامہ ''جنگ'' میں ''نقار خانے'' کے عنوان سے گزشتہ چار دہائیوں سے کالم لکھ رہے ہیں۔

کتب: ☆ دنیا میرے آگے (سفرنامہ) ☆ تماشا میرے آگے (سفرنامہ)

☆ صدا کر چلے (کالم) ☆ دعا کر چلے (کالم)

جمیل الدین عالی کی بنیادی وجۂ شہرت شاعری ہے۔ آپ نے غزلیں بھی لکھیں۔ دوہوں میں بھی طبع آزمائی کی۔ نظمیں بھی تخلیق کیں اور گیت نگاری میں بھی نام کمایا۔ ''جیوے جیوے'' پاکستان ان کے گیتوں کا مجموعہ ہے۔ نثر میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی۔ ''تماشا میرے آگے'' (ایران، عراق، لبنان، مصر، دہلی، روس، فرانس، برطانیہ) اور ''دنیا میرے آگے'' (جرمنی، اٹلی، ہالینڈ، پیرس، سویٹزرلینڈ، اور امریکہ) ان کے سفر نامے ہیں۔

جمیل الدین عالی گزشتہ چار دہائیوں سے ملک سے سب سے بڑے اخبار ''جنگ'' میں کالم نویسی کر رہے ہیں۔ ان کے کالموں کے مجموعے ''صدا کر چلے''، اور ''دعا کر چلے'' کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ جمیل الدین عالی کے کالم ''نقار خانے'' کے عنوان سے چھپتے ہیں۔ ان میں علمی، ادبی، سیاسی اور ثقافتی شان ہوتی ہے۔ عالی ایک نظریاتی ادیب ہیں اور اسی نظریے نے ان کو ایک ایسا نکتہ نظر عطا کیا ہے۔ جس کا عکس ان کے کالموں میں بھی نظر آتا ہے۔

جمیل الدین عالی ملکی سیاسی صورتحال پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ مٹی سے محبت ان کے کالموں کی روح ہے۔ اکثر ان کے کالموں ادبی موضوعات زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ وہ اختصار کے ساتھ ادبی کتب، ادبی شخصیات تقاریب کا حال احوال بیان کرتے ہیں۔ اور گاہے گاہے اپنا تبصرہ بھی شامل کر دیتے ہیں۔ وہ ماضی کی یاد میں بھی ڈوب کر اس عہدِ رفتہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ جب علم و ادب عوام کا اوڑھنا بچھونا ہوا کرتا تھا اسی طرح کسی شاعر

ادیب کی وفات پر بھی وہ اپنے کالم میں مرنے والے کا نقشہ کھینچ لیتے ہیں۔ وہ اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

''آپ نے فرید جاوید کے انتقال کی خبر پڑھی ہوگی میں نے اسلام آباد میں سنی اور سن ہو کر رہ گیا۔ بہت مشہور شاعر نہ تھا مگر بہت اچھا شاعر تھا افتادطبیعت اور اس کے مخصوص حالات اور کراچی سے طویل غیر حاضری نے اسے ادبی حلقوں میں وہ مقام نہ ملنے دیا جس کا وہ کبھی مستحق تھا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔فرید جاوید کو شاید وہ مقام نہ دیا جائے کہ آج کل تقسیم مقامات نوعیت تعلقات سے وابستہ ہے شاید چند برس یا چند قرن اور رہے گی''۔(۹۵)

جمیل الدین عالی ایک صاحب نظر کالم نویس ہیں۔ بدلتی دنیا میں ادب کے کردار پر ان کی گہری نظر ہے۔ ادب اور کلچر کا باہمی تعلق ان کا خاص موضوع ہے۔ سماجیات کے تناظر میں بھی وہ قومی ادبی زندگی کو پرکھتے ہیں۔ وہ ایک باخبر انسان ہیں اس لیے نئے نئے سوالات اور تحقیقات ان کے ادبی کالموں کا فکر انگیز پہلو ہے۔ اردو زبان وادب سے عشق کا جذبہ ان کی رگوں تک میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ اس لیے وہ اُردو زبان اودب کی ترقی و ترویج کے لئے گاہے گاہے اپنے کالموں میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ وقار اور سنجیدگی کی فضا ان کے کالموں کو اپنے لپیٹ میں لیے رکھتی ہے۔ اسی طرح ان کا علمی رویہ بھی ان کالموں میں جھلکتا ہے اُردو اور فارسی اشعار کے موقع محل کے مطابق خوب صورت استعمال ان کے باذوق قارئین کے لیے ذوق سلیم کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔

☆☆☆☆

مستنصر حسین تارڑ (۱۹۳۹ء):

مختصر تعارف:

ولادت: یکم مارچ ۱۹۳۹ء لاہور

نامور ادیب، ڈراما نگار، سفر نامہ نگار، ناول نگار، کالم نگار،

کالم نگاری: روزنامہ ''جنگ''، ''مشرق''، ''آج'' اخبارِ جہاں، ''جناح'' اور ملک کے کئی دیگر اخبارات میں ''کارواں سرائے'' کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔

کتب: ناول: ☆ پیار کا پہلا شہر ☆ فاختہ ☆ پکھیرو ☆ دیس ہوئے پردیس ☆ جپسی ☆ بہاؤ

سفر نامہ: ☆ خانہ بدوش ☆ نکلے تیری تلاش میں ☆ ہنزہ داستان ☆ سفر شمال کے ☆ نانگا پربت ☆ کے۔ٹو

کالم: ☆ کارواں سرائے ☆ چک چک ☆ اُلو ہمارے بھائی ہیں ☆ گزارہ نہیں ہوتا

اُردو ادب کے جدید منظر نامے میں مستنصر حسین تارڑ مقبول ترین ادیب کے درجے پر فائز ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ بنیادی طور پر رائٹر ہیں۔ وہ ایک معروف سفر نامہ نگار ہیں اور ان کے سفر نامے ہاتھوں ہاتھ بکتے ہیں۔ ڈرامہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے بھی انھوں نے افسانوی ادب کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔

مستنصر حسین تارڑ روزنامہ ''مشرق'' میں ''کارواں سرائے'' کے عنوان سے کالم لکھتے رہے ہیں۔ بعدازاں وہ روزنامہ ''جنگ'' سے وابستہ ہوئے اور اس کے ساتھ ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' میں بھی ان کا کالم چھپنے لگا۔ آج کل وہ روزنامہ ''جناح'' میں کالم لکھتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ ایک کامیاب سفر نامہ نگار، ڈراما نگار اور ناول نگار ہیں ان کی ان تینوں حیثیتوں کا اظہار کالم میں بھی ہوتا ہے۔ تاہم کالم میں وہ ایک تخیلاتی دنیا میں سفر کرتے ہیں۔ وہ بات سے بات نکالنے کے فن سے آگاہ ہیں۔ اس لیے ان کے کالم میں انشائیہ خدوخال بھی نمایاں ہوجاتے ہیں۔ عام طور پر وہ اپنے کالم کا آغاز کسی

واقعے سے کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے ہاں کہانی پن در آتا ہے۔ جسے قاری بڑے انہماک سے پڑھتا ہے۔ کہانی پن کے اسی ہنر کے تحت ان کے ہاں تجسس، کردار اور مکالمے کی فضا جنم لیتی ہے اور یوں انکا کالم ادبی سانچے میں ڈھل کر پڑھنے والے کو محظوظ کرتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے کالم کو ایک فکر انگیز نکتے پر ختم کرتے ہیں۔ ان کے کالم انداز تحریر اور موضوعات کے حوالے سے یکسانیت سے پاک ہوتے ہیں۔

ادب بھی ان کا موضوعِ خاص ہے۔ ادبی دنیا کے روز و شب پر ان کی گہری نظر ہے۔ کوئی بھی اہم ادبی واقعہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر مشہور ناول نگار و خاکہ نگار رحیم گل جس کسمپرسی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس المیے پر ''رحیم گل کے حصے کے سانس'' کے عنوان سے کالم لکھا۔ اس کا ایک اقتباس پڑھیے:

> ''ایک ادیب دوست نے پوچھا ''رحیم گل کو دیکھنے گئے ہو''؟ میں نے کہا ''نہیں جا نہیں سکا۔ فرصت ہی نہیں ملی ویسے وہ دوست آدمی ہے۔ اعلیٰ پائے کا ادیب ہے۔ اس کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے۔ بھئی اگر تم اخبار میں اس کے بارے میں کوئی تشویش بیان دے رہے ہو تو اس میں میرا نام ضرور شامل کر لیجیے۔ تا کہ کل کلاں سند رہے کہ ہم نے ایک ادیب کی جان بچانے کے لیے سر توڑ کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ ایک بیان بھی دیا تھا'' ادب دوست کہنے لگا میں رحیم گل کی خیریت دریافت کرنے گنگا رام جا رہا ہوں تم بھی چلو''۔ بھئی جی تو بہت چاہتا ہے۔۔۔۔ لیکن یار آج نہیں اور ہم اس کے پاس جا کر کریں گے کیا؟ اللہ تعالیٰ انہیں صحت دے ویسے اگلے جمعہ کو مجھے یاد دلانا، میں حلقہ ارباب ذوق میں رحیم گل کے لیے کوئی قرارداد وغیرہ پیش کر دوں گا''۔(۹۶)

انھوں نے نامور اہل قلم کی وفات پر بھی تعزیتی کالم لکھے لیکن یہ محض خانہ پری نہیں بلکہ اس میں ایک نیا انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے کالم پڑھنے سے لگتا ہے کہ انھیں گھسے پھٹے اندازِ تحریر میں کالم لکھنے سے چڑ سی ہے اور وہ ہر آن اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کالم میں فکری و معنوی سطح پر تازگی لائی جائے۔فیض کے انتقال پر مستنصر حسین تارڑ نے جو کالم لکھا اس میں بھی ایک نیا رنگ بکھرا ہے:

''ایچ ۱۲ ماڈل ٹاؤن میں فیض صاحب نے دربار لگا رکھا تھا۔بڑے بڑے وزیر، امیر کبیر، عالم فاضل اور غریب حاضری دے رہے تھے۔ان میں بیشتر فیض صاحب کے مقروض تھے اور اقرار کرنے آئے تھے اور کچھ سوگوار کھڑے ہیں۔جن چیدہ چیدہ شخصیات نے شرکت کی تھی میں بھی اس قطار میں شامل ہوگیا''۔(۹۷)

مستنصر حسین تارڑ نے تہذیب کے منظرنامے کے بدلتے رنگوں پر بھی ادبی توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔وہ مشرقی تہذیب کے بدلتے دھاروں کو بنظر غائر دیکھتے ہیں اور تبدیلی کے اس عمل کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو اپنے کالم کا موضوع بناتے ہیں۔اس مناظر میں ایک کالم کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

''شام کو جیسکی میرے پاس آگیا وہ یقیناً محمد شریف نہیں تھا۔ بارہ برس کے یورپ نے اسکی جون ہی بدل ڈالی تھی۔وہ اب کندھے اچکا کر بات کرتا تھا اور اس کی گفتگو میں جرمن الفاظ کی بھرمار تھی۔وہ بات کرتے کرتے کوئی جرمن لفظ استعمال کرتا اور پھر ہنس کر کہتا مجھے ان کا پنجابی نہیں آتا۔۔۔۔بس جرمن جانتا ہوں''۔(۹۸)

طنز و مزاح کی گل کاریاں بھی ان کالموں میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔مستنصر حسین تارڑ کی طنز شدت اور زہرناکی سے پاک ہوتی ہے۔وہ ہلکے پھلکے انداز میں چٹکیاں بھرتے ہوئے جاتے ہیں۔وہ تفریح اور اصلاح کا عمل پہلو بہ پہلو لیے چلتے ہیں۔خانگی زندگی کا ایک پر تبسم جائزہ لیتے ہوئے ان کے طنز کی یہ کاٹ دیکھے جو اپنے اندر شگفتگی

لیے ہوئے ہے۔ یہ کالم انھوں نے ایک لڑکی کے خط کے جواب میں لکھا ہے جس کی شادی ہونے والی ہے اور وہ اسے ایک مسئلہ سمجھ کر پریشان بیٹھی ہے۔

''باقی رہی آپ کی اصلی الجھن یہ کہ آپ کی منگنی ہوئی ہے اور اگلے سال آپ کی شادی ہو جائے گی تو بی بی پرابلم تو اسے ہوگی جس کے ساتھ آپ کی شادی ہوگی۔ کیونکہ اس کو کبھی نہ کبھی تو پتہ چل جائے کہ آپ بلی ہیں کیونکہ شادی کے بعد اکثر شوہروں کو پتہ چل جاتا ہے کہ ان کی بیویاں دراصل بلیاں ہیں کیونکہ وہ پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ البتہ شوہر گربہ کشتن بروز اول ۔۔۔۔ قسم کا ہوا تو پھر واقعی پرابلم بن جاتی ہوگی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو کوئی اچھا سا مشورہ نہیں دے سکتا۔ اگر میں مشورے دینے کے قابل ہوتا تو سب سے پہلے اپنے آپ کو کوئی اچھا سا مشورہ دے کر اس پر عمل نہ کرتا؟ ۔۔۔۔ اور اپنی بلی سے ۔۔۔۔ معاف کیجئے گا اپنی بیوی کے پنجوں سے بچ نہ جاتا''۔(۹۹)

مستنصر حسین تارڑ کے کالم فکری و معنوی لحاظ سے ادبی کالم کی روایت میں تازہ ہوا کا جھونکا ہیں۔ ان کے کالم ان کی تخلیقی انفرادیت کا پرتو ہیں جس میں مستنصر حسین تارڑ کی تخلیقی شخصیت سے لے کر ہمارے معاشرے کے اجتماعی احساسات کی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ اُردو ادب کے جدید طرز احساس کی ایک جھلک ان کالموں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

☆☆☆☆

امجد اسلام امجد (۱۹۴۴ء)

مختصر تعارف:

ولادت: ۴ اگست ۱۹۴۴ء لاہور

نامور شاعر، ڈارمانگار، کالم نگار

کالم نگاری: امروز، جنگ، مشرق، ایکسپریس

کتب (کالم): ☆ چشمِ تماشا ☆ کٹھے میٹھے ☆ دیکھتے چلے گئے ☆ چھاؤں

☆ نئی آنکھیں پرانے خواب ☆ تیسرے پہر کی دھوپ

دیگر کتب: ☆ اپنے لوگ ☆ وارث (ڈراما) ☆ وقت (ڈراما)

☆ ریشم ریشم (سفرنامہ) ☆ یہ افسانے ☆ عکس

☆ آنکھوں میں تیرے سپنے ☆ سپنے کیسے بات کریں

☆ سپنے بات نہیں کرتے ☆ خواب جاگتے ہیں

امجد اسلام امجد ایک معتبر ادبی شخصیت ہیں۔ وہ ایک صاحبِ اُسلوب شاعر ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ ایک منفرد ڈراما نگار اور سفرنامہ نگار کی حیثیت سے بھی ان کا قابلِ رشک ادبی مقام ہے۔

ادبی کالم نگاری میں بھی انھوں نے طبع آزمائی اور اب ان کا شمار اُردو کے اہم ادبی کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے کالم نویسی کا آغاز جولائی ۱۹۸۳ء کو ''امروز'' سے کیا۔ ''امروز'' میں ان کا کالم فروری ۱۹۵۸ء تک باقاعدگی سے ''جمعہ میگزین'' میں چھپتا رہا۔ کچھ عرصہ کے لیے انھوں نے کالم نویسی ترک کی اور شاعری اور ڈرامے کی اور ڈرامے کی طرف متوجہ ہوئے، تاہم ان کے اندر کے کالم نگار نے دوبارہ انگڑائی لی۔ اور ان کی کالم

نویسی کا دوسرا دور ۲۷ اپریل ۱۹۹۴ء کو ''چشمِ تماشا'' کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔

امجد اسلام امجد کے کالموں کی موضوعاتی حدود بہت پھیلی ہوئی ہیں۔ ادب، سیاست ، معاشرت، تہذیب، تعلیم، خواتین کے مسائل سمیت کبھی کبھار عالمی موضوعات پر بھی کالم لکھتے ہیں۔ تاہم ان کے کالموں میں ایک ادبی فضا برقرار رہتی ہے۔ جو قاری کو شگفتگی اور تر و تازگی سے نوازتی رہتی ہے۔ امجد اسلام امجد اپنے معاشرے میں ہونے والے تماشوں اور ٹوٹتی بکھرتے اقدار کو چشم تماشا سے دیکھتے ہیں۔ اسی رعایت سے انھوں نے اپنی کالم کا عنوان بھی ''چشم تماشا'' رکھا ہے۔ امجد اسلام امجد اپنی کالم نویسی کے بارے میں کہتے ہیں:

''یہ کالم مختلف موضوعات اور واقعات پر میرے خیالات اور احساسات کے عکس ہیں ان میں ہلکی پھلکی باتیں بھی ہیں اور سوچنے والی بھی۔ لیکن ان سب کی اہم خصوصیت (جو اصل میں اس مجموعے کی وجۂ اشاعت بھی ہے) اپنے اردگرد تہذیبی اور اقداری انتشار کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ جس کا پھیلاؤ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور جسے سمیٹنے سے چشم پوشی کا عمل ہماری بقاء کے راستے کا سب سے بڑا پتھر ہے''۔ (۱۰۰)

امجد اسلام امجد کے کالم ''ادب برائے زندگی'' کے ترجمان ہیں۔ وہ اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتے ہیں۔ انھیں تخیل کی رنگ آمیزی کے ساتھ کالم میں اتار دیتے ہیں۔ ان کے ادبی کالم کسی ایک اندازِ تحریر کے پابند نہیں۔ کبھی کبھی وہ عالمانہ انداز میں ادبی کتابوں اور ادبی دنیا کے اتار چڑھاؤ کو موضوع بناتے ہیں۔ تو کبھی کبھی ظرافت کے پردے میں ہمارے معاشرے کے غیر متوازن رویوں پر طنز آمیز پیرائے میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

مرزا ادیب کی طرح ان کے کالموں میں بھی ادبی شخصیات، تقاریب و واقعات اور دیگر فکر انگیز نکتوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک کالم ''اُردو اُردو'' میں سرکاری سطح پر اس المیے پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں:

''کہ اُردو تا حال اپنے آئینی حق سے محروم ہے۔ اُردو پاکستان کی سرکاری زبان
بنے۔ حکومت، گزشتہ حکومتوں سمیت اپنا کیا ہوا وعدہ کہ ۱۹۸۸ء تک اُردو کو
سرکاری زبان کا درجہ دے کر ہر سطح پر رائج کر دیا جائے گا، پورا کرے نہ کرے،
اُردو کے دیوانے اس عروسِ دل نواز کی مشاطگی کرنے کے بہانے ڈھونڈتے
رہیں گے''۔(۱۰۱)

امجد اسلام امجد کے کالم شعریت کا حُسن لیے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شاعر بھی ہیں اور ڈارمہ نگار بھی اس لیے وہ اپنے کالم کی فضا کومل اور مترنم لفظوں سے بناتے ہیں۔ شعریت کے اس حسن کے ساتھ ساتھ وہ ڈرامئیت کے ذریعے کسی عام واقعے میں بھی دلکشی کا مادہ پیدا کر دیتے ہیں۔ امجد اسلام امجد عام فہم مگر رواں رواں اسلوب میں اپنا مدعا قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ انھی خوبیوں میں مملوان کے کالم ''گلزار، غالب نامہ اور گوپی چند نارنگ'' کا یہ اقتباس دیکھیے:

''گلزار اپنے منفرد سٹائل اور موضوعات کے انتخاب، تنوع اور پیشکش کے حوالے
سے فی الوقت فلم اور اس سے متعلقہ فنون ایک ایسی انفرادیت کے حامل ہیں
جو انہی سے مخصوص ہے''۔(۱۰۲)

امجد اسلام امجد کے لیے تہذیب وثقافت کی ترقی کا استعارہ ہے اور جب کبھی وہ محسوس کرتے ہیں کہ ادبی سرگرمیاں، تنقیدی نشستیں روبہ زوال جارہی ہیں تو ان کے نزدیک یہ زوالِ ادب زول نہیں، تہذیبی اقدار کا زوال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ادب نوازی کی اقدار ختم ہورہی ہیں تو انھیں دکھ ہوتا ہے۔ تب وہ ماضی کے سمندر میں ڈوب کر یادوں کے وہ موتی ڈھونڈ لاتے ہیں جن میں ادب نوازی کی چمک ہوتی ہے۔ ذیل میں ان

کے کالم کا ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

''آج سے پندرہ بیس برس پہلے تک لاہور کی ادبی زندگی کا تذکرہ ٹی۔ ہاؤس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا کہ برسوں تک یہ جگہ لاہور کے ادیبوں، شاعروں اور دیگر فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا ''اڈہ'' تھی جہاں نوجوان لوگ ان ہستیوں کو دیکھنے اور سننے کے لیے آتے تھے اور ملک بھر سے آنے والے ادیب اور ادب نواز لوگ یہاں آنا اتنا لازمی سمجھتے تھے جیسے سیاح لاہور آ کر شاہی قلعہ اور شالامار باغ دیکھنا اپنی اولین ترجیحات میں رکھتے ہیں''۔(۱۰۳)

امجد کے کالموں میں ذوق شعری کا ایک تسلسل بھی ملتا ہے خاص طور پر موقع محل کے مطابق وہ کسی مشہور شعر کے ذریعے کالم میں شعریت کا آہنگ بھی لے آتے ہیں اور قاری کی ادب دوستی کو بھی بڑھاوا دیتے ہیں۔امجد کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے۔کہ وہ اہل ادب کے متضاد رویوں پر بھی خوب کھل کر چوٹ کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے کسی چٹکلے، شگفتہ فقرے یا لطیفے کو بڑی چابک دستی سے استعمال کرتے ہیں۔مثال کے طور پر ان کے کالم ''تحقیق'' کا یہ اقتباس پڑھیے جس میں اپنوں نے ادبی تحقیق کے زوال کو کسی طرح طنز کی رد میں رکھا ہے۔

''ہماری ادبی تحقیق کا حال بھی کچھ اس سے مختلف نہیں اور دو چار مستثنیات کو چھوڑ کر ہمارے محقق بھی ماشاءاللہ چھپانے کے قابل ہی ہیں اور ان کی تحقیق زیادہ تر ان سردار جی کے تجربے سے ملتی ہے۔جنھوں نے بہت دیر تک ایک چائے کی پیالی میں چمچ ہلانے کے بعد کہا تھا۔''لو بھئی سجنو! ایک بات طے ہوگئی ہے کہ اگر چائے میں چینی نہ ڈالو تو چاہے جتنا مرضی ہلا لو میٹھی نہیں ہوتی''۔(۱۰۴)

امجد اسلام امجد کے کالم کتاب کلچر کے فروغ کا بھی اہم ذریعہ ہیں۔ وہ گاہے بہ گاہے اپنے کالموں میں نئی ادبی کتب پر تبصرہ کرتے ہیں خاص طور پر اپنے باذوق قارئین کے لیے مجموعوں سے شعروں کا انتخاب بھی پیش کرتے ہیں۔علاوہ ازیں ادبی شخصیات خاص طور پر وفات پا جانے والے ادیبوں کے لیے تعزیتی کالم وہ برائے اہتمام سے لکھتے ہیں تادمِ تحریر ان کے کالموں کے آخری مجموعے ''تیسرے پہر کی دھوپ'' میں جن معروف ادیبوں کی یاد میں کالم لکھے گئے ۔ان ادیبوں میں اشفاق احمد، این میری شیمل ، جیلانی کامران، افتخار جالب،
حفیظ تائب، جگن ناتھ آزاد، انجم رومانی، تابش دہلوی، قتیل شفائی، حسن رضوی، احمد راہی، محمد خالد اختر اور دیگر مرحومین شامل ہیں۔

رفتگاں کے لیے لکھے گئے یہ کالم صحیح معنوں میں ان کی کوئی یادوں کو محفوظ کرنے کی کوشش ہے۔بعض کالم میں شخصیت نگاری اتنے کمال سے کی گئی ہے کہ وہ قریب قریب خاکے محسوس ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر معروف نعت گو حفیظ تائب کی وفات پر اُنھوں نے جو کالم لکھا اس کا ایک حصہ پیش خدمت ہے:

> ''وہ ایک بہت پڑھے لکھے اور صاحب الرائے آدمی تھے۔طبعی شرارت کی وجہ سے اختلاف رائے بھی اس طرح کرتے جیسے معذرت کررہے ہوں مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے موقف پر علمی استدال کے قائم اور محکم بھی رہتے ۔اُردو اور پنجابی نعتیہ اور کلاسیکی ادب پر ان کی نظر بہت گہری تھی''۔(۱۰۵)

اس ایک ٹکڑے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امجد اسلام امجد کے کالموں میں شخصیت کی دلکش تصویر کشی مہارت کے ساتھ کھینچی جاتی ہے۔ادبی موضوعات وشخصیات کے ساتھ ساتھ انھوں نے سنجیدہ کالم بھی لکھے ہیں۔عبدالغفار کوکب لکھتے ہیں:

''فکاہیہ کالم، کالم کی مشکل ترین صورت ہے۔ اسے لکھنے کے لیے فطری طور پر حسِ ظرافت کا تیز ہونا ضروری ہے۔ امجد اسلام امجد جب فکاہیہ کالم لکھنے پر آتے ہیں تو اس کے تقاضے بڑی خوب صورتی سے طے کرتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر کو شگفتہ بنانے کے لیے ماضی کے حوالے، لطافت اور چٹکلوں کے ساتھ ساتھ موقع محل کی مناسبت سے کلاسیکی شعراء کے اشعار بھی اپنے کالم کا حصہ بناتے ہیں''۔(۱۰۶)

امجد اسلام امجد کی ظرافت نگاری کی ایک مثال دیکھیے:

''تاریخ میں عام طور پر دو طرح کے ہاتھیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ (۱) پورس کے ہاتھی (۲) سفید ہاتھی۔ اور ان دونوں کا کردار ہی خاصا مشکوک ہے۔ یہ وہ ہاتھی ہیں جو ملک سے رج کر کھاتے ہیں اور وقت پڑنے پر اسی کو روندتے ہوئے میدان سے بھاگ جاتے ہیں وطن عزیز میں جب بھی کوئی حکومت ٹوٹتی ہے ان ہاتھیوں کی ایک فوج ظفر موج ایک دم چاروں طرف دندنانے لگتی ہے''۔(۱۰۷)

کالم نویسی امجد اسلام امجد کے لیے تخلیق ہی کا ایک عمل ہے۔ اسی لیے ان کے کالموں میں تخلیقی آہنگ کا وہ حسن ملتا ہے۔ جو ادبی تحریر کا وصف ہوتا ہے۔ اسی لیے اب تک ان کے کالموں کے چھ مجموعے منظر عام پر آ کر قارئین سے داد تحسین وصول کر چکے ہیں کالموں کے ان مجموعوں میں ''چشم تماشا''، ''کھٹے میٹھے''، ''دیکھتے چلے گئے''، ''نئی آنکھیں پرانے خواب''، ''چھاؤں'' اور ''تیسرے پہر کی دھوپ'' شامل ہے۔

امجد اسلام امجد کے ادبی کالم صحافت کی خاردار زمین میں تروتازہ اور خوشبودار پھولوں کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد یونس بٹ (۱۹۶۲ء)

مختصر تعارف:

نامور ڈارمانگار، کالم نگار، مزاح نگار

کالم نگاری: روزنامہ ''جنگ''، ''پاکستان''، ''مشرق''، اور ملک کے کئی دیگر اخبارات میں '' عکس در عکس'' کے عنوان سے ان کے کالم چھپتے رہتے ہیں۔

کتب: ☆ بٹ تمیزیاں ☆ بٹ پارے ☆ شناخت پریڈ

☆ لاف زنیاں ☆ غل دستہ ☆ نوک جوک ☆ مزاح پرستی

☆ جوک در جوک ☆ خندہ پیشانیاں ☆ خندہ زن

ڈاکٹر محمد یونس بٹ بہت کم وقت میں اُردو کے مقبول کالم نگاروں کی صف میں شامل ہونے والے کالم نگار ہیں۔ اپنے شگفتہ اُسلوب اور واقعاتی مزاح کی وجہ سے وہ قارئین کے ایک بڑے حلقے میں پسند کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر یونس بٹ کے کام نویسی کا آغاز جون ۱۹۹۱ء میں روزنامہ ''پاکستان'' سے کیا اور بہت جلد اخباری دنیا میں قبولیت عام کے درجے پر فائز ہوئے۔ اپنی بے باک کالم نگاری کی وجہ سے بہت جلد ''پاکستان'' اخبار کی انتظامیہ سے ان کے اختلاف پیدا ہوئے۔ جس کی بنا پر انھوں نے روزنامہ ''جنگ'' میں کالم نویسی شروع کی۔

ڈاکٹر یونس بٹ نے طنز و مزاح کے روایتی حربوں کے ساتھ ساتھ مزاح کے جدید اسالیب بھی بخوبی استعمال کیے ان کے ہاں اُردو مزاح کے ساتھ ساتھ انگریزی طنز و مزاح کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اپنے قاری کو تفریح پہنچانا ان کا سب سے بڑا مقصد ہے اور اس کے لیے وہ ہلکے پھلکے انداز تحریر میں لطافت اور چٹکلوں سے اپنے کالم کو سجاتے ہیں۔ وہ لفظوں سے ذو معنویت پیدا کرنے کے ماہر ہیں۔ ان کا مزاح سیدھے سادے عام

لفظوں سے تخلیق ہوتا ہے۔ اس لیے بہت جلد قارئین کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ ان کے کالم کا پہلا جملہ ہی اتنا شاندار اور جاندار ہوتا ہے کہ قاری اس کی گرفت میں آنے کے بعد مزے لیتا ہوا کالم کو آخر تک پڑھتا چلا جاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی ان کی کالم نگاری کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''محمد یونس بٹ کو قدرت کی طرف سے کچھ ایسی طلسم کاری ودیعت ہوئی ہے کہ وہ جس موضوع کو چھوتا ہے اسے جگمگا دیتا ہے۔ وہ فقرے پر فقرے مارتا چلا جاتا ہے۔ مجال ہے جو قاری کو کسی مقام پر رک کر اپنی مسکراہٹ سمیٹنے کا موقع دے۔ مسکراہٹ تو یونس بٹ کی تحریر پڑھنے والے کی شخصیت کا ناگزیر جزو بن جاتی ہے''۔(۱۰۸)

ڈاکٹر یونس بٹ کو مزاح کی تخلیقی صلاحتیں قدرت کی طرف سے ملی ہیں جن کا انھوں نے بڑی فنکارانہ مہارت سے استعمال کیا ہے۔ مزاح لکھنا ایک مشکل کام ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ مزاح نگار کو سنجیدہ موضوع سے بھی مزاح پیدا کرنے کا ہنر آتا ہو۔ یونس بٹ فن کی اسی کسوٹی پر پورا پورا اترتے ہیں مثال کے طور پر اُردو ادب کے زوال کے اسباب کو وہ طنز کی زد پر یوں رکھتے ہیں:

> ''ہمارے ہاں ادبی کتابیں بہت کم پڑھی جاتی ہیں۔ اس لیے ہمارے ہاں ادیبوں کو باعزت مقام حاصل ہے۔ ہمارے نقاد بھی مصنف کی کتاب تب تک غور سے نہیں پڑھتے جب تک مصنف سے ان کے تعلقات خراب نہ ہو جائیں۔ کیونکہ کسی کتاب کی تعریف کرنا آسان ہے مگر اس پر تنقید کرنا مشکل ہوتا ہے''۔(۱۰۹)

ڈاکٹر یونس ادبی موضوعات پر بھی لکھتے ہوئے عوام کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور ادبی آنکھ سے ان کے مسائل زیر بحث لاتے ہیں۔ ان کے ایک کالم ''ادب کا ریڈ لائٹ ایریا'' کا یہ ٹکڑا اس کی عمدہ مثال ہے۔

''ہمارے ہاں کئی شاعر ایسے ہیں۔ جو اپنے گھر کے خرچ کا حساب بھی شعروں میں کرتے ہیں۔ ان کے دروازے پر کوئی بھکاری مانگنے آئے تو اسے بھی بھیک میں شعر ہی دینا چاہیں گے۔ اعتبار ساجد کہتے ہیں اچھی شاعری بدترین حالات میں پیدا ہوتی ہے۔ اس حساب سے تو ہماری حکومت اچھی شاعری کے فروغ کے لیے دن رات کوشاں ہے۔ بلکہ آئی۔ ایم۔ ایف بھی پٹرول اور بجلی مہنگی کر کے کوئی مالی مفاد نہیں بلکہ اچھی شاعری ہی چاہ رہا ہے''۔ (۱۱۰)

یونس بٹ ہمارے معاشرے پر تنقیدی نظر اس گہرائی سے ڈالتے ہیں کہ معاشرے کے کسی بھی شعبے کے تضادات ان کے نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے۔ ان کی قوت مشاہدہ تیز ہے۔ وہ طنز و مزاح کے پردے میں ہمارے معاشرے کے حکمران طبقے کا احتساب کرتے ہیں۔ انھوں نے مزاح کے جس حربے کو زیادہ چابکدستی کے ساتھ استعمال کیا ہے وہ لفظی بازیگری ہے وہ صوتی اور مصنوعی زاویوں سے کسی بھی لفظ میں ذرا بھی تبدیلی کر کے پر تبسم کیفیات پیدا کرتے ہیں۔ ان کے کالموں کے عنوان بھی ان کی اسی مہارت کے عکاس ہیں ان میں ''مولانا سلز بورڈ''، ''بازاری ناول'' اور ''بے رازی ناول''، ''پی۔ ٹی وی (پاکستان بڑا ٹریجڈی وژن)''، ''ہیر فورس''، ''مسلح شاعری''، ''ماہر امراض طوطا چشم''، ''ادبی حکومت''، ''جنون ایلیا''، ''قلم دار زبان''، ''ادبی سونگھ بوجھ''، ''مریض الملت''، ''مہاجر حسین'' وغیرہ ایسے عنوانات ہیں۔ جن میں لفظی بازیگری انتہا درجے پر ہے۔ وہ اُردو اور انگریزی لفظوں کے یکساں ذو معنویت پیدا کرتے ہیں۔ وہ لفظی بازیگری کے حوالے سے کہتے ہیں:

''لفظ کی اپنی ہسٹری اور خوبصورتی ہوتی ہے۔ جسے عیاں بلکہ عریاں کریں تو

قارئین کو مزا آتا ہے۔ خاص کر انگریزی لفظوں میں اس توڑ پھوڑ کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ دراصل لفظوں کی اپنی دنیا ہے۔ جس طرح جمناسٹک کا کھلاڑی مختلف کرتب دکھا کر ناظرین کو محظوظ کرتا ہے۔ اسی طرح لفظ ہیں جنھیں جیسے چاہیں آپ استعمال کر سکتے ہیں''۔(۱۱۱)

لفظوں کے استعمال کا یہ فن یونس بٹ کی انفرادیت کی پہچان ہے۔ رعایت لفظی مزاح پیدا کرنے کا ایک مشکل حربہ ہے۔ یونس بٹ اس حربے کو مثالی روانی اور آسانی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اس فنی مہارت کا اظہار ان کی کتابوں کے عنوانات سے بھی ہوتا ہے۔ یونس بٹ نے اُردو مزاح کی روایت سے ہٹ کر اپنی کتابوں کے عنوانات میں بھی ظریفانہ کیفیات پیدا کی ہیں۔ ''بٹ پارے''، ''بٹ تمیزیاں''، ''مزاح پرستی''، ''نوک جوک''، ''غل دستہ''، لاف زنیاں، ''جوک در جوک''، ''خندہ پیشانیاں''، ''شناخت پریڈ''، اور ''خندہ زن'' ان کی کتابوں کے دلچسپ عنوانات ہیں۔ جن میں رعایت لفظی کے ذریعے قاری کو چونکانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

یونس بٹ کے کئی کالموں میں انشائیے کی صفات بھی موجود ہیں۔ انشائیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں بات سے بات پیدا کی جاتی ہے اور معمولی موضوع میں بھی غیر معمولی اور دلچسپ پہلو اجاگر کیے جاتے ہیں۔ یونس بٹ نے اُردو کوئی یادگار انشائیے بھی دیے ہیں۔

انشائیے کے علاوہ کبھی کبھار وہ خاکہ نما کالم بھی لکھتے ہیں۔ ''شناخت پیریڈ'' میں شامل کئی کالم قریب قریب خاکے کی ذیل میں آتے ہیں۔ یونس بٹ نے سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیات پر جو کالم لکھے ہیں۔ ان کالموں میں ان شخصیات کی ہلکے پھلکے انداز میں خامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور ان کے حلیئے اور ڈیل ڈول کو بھی اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں لکھا ہے۔ مثال کے طور پر معروف شاعر امجد اسلام امجد کے بارے میں انھوں نے جو کالم لکھا اس کا

عنوان ''گنجِ گرانمایہ'' ہے۔ یہ عنوان امجد اسلام امجد کے بارے میں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ ادب کے گنجِ گرانمایہ ہے اس کا سراوپر سے خالی ہے۔ سنوارنے کو بال نہیں تو کیا ہوا، دھونے کو منہ تو بہت ہے۔ امجد اسلام امجد بات کر رہا ہو تو کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ جب لحاظ کر رہا ہو تو بات نہیں کرتا۔۔۔ عورتوں کو ملنے سے پہلے جہاں دوسرے بال، تائیاں اور چشمے ٹھیک کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ نیت ٹھیک کر رہا ہوتا ہے''۔(۱۱۲)

ادبی شخصیات کے علاوہ انھوں نے سیاست دانوں پر بھی کالم لکھے۔ بالعموم سیاست دانوں پر لکھتے ہوئے ہمارے کالم نگار جانتے بوجھتے مدح سرائی پر اُتر آتے ہیں اور بسا اوقات سیاست دانوں میں وہ خوبیاں بھی ڈھونڈ لاتے ہیں جو ان میں سے سرے سے موجود ہی نہیں ہوتیں۔ یونس بٹ اس عیب سے پاک ہیں انھوں نے بے باکی کے ساتھ لکھنے کا حق ادا کیا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کے متنازعہ اور خود ساختہ جلاوطن سیاست دان الطاف حسین کے بارے میں کالم بعنوان ''مریض الملت مہاجر حسین'' میں لکھتے ہیں:

''بچپن میں پسندیدہ کھیل لڑائی تھا۔ ان کی والدہ جب انھیں خوش کرنا چاہتیں تو کوئی لطیفہ نہ سناتیں ۔بس یہ بتاتیں کہ ساتھ والی گلی میں لڑائی ہو رہی ہے۔ اور وہ خوش ہو جائے۔۔ جامعہ کراچی میں بی فارمیسی میں تھے۔ تو اس کا ریکارڈ توڑنے کی کئی کوششیں کیں۔ مگر پولیس نے ریکارڈ ٹوٹنے سے بچا لیا۔۔۔ جذبات اور جزئیات کے سمندر ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہ جاننے کے لیے کہ کراچی کا موسم گرم ہے۔ یا سرد، لوگ محکمہ موسمیات کی بجائے مہاجر حسین کے

بیان دیکھتے۔ کیونکہ وہاں سردی اور گرمی کا موسم ایسا ہوتا ہے کہ منٹ میں سردی گرمی ہو جاتی ہے''۔(۱۱۳)

اخبار میں چھپنے والے کالم ایک دن کے مہمان ہوتے ہیں۔ دوسرے دن ان کالموں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ تاہم یونس بٹ کے ادبی کالم سدا بہار تازگی کی خوبی سے مملو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالموں کے تا حال درجنوں مجموعے چھپ چکے ہیں۔ لوگ ان مجموعوں کو شوق سے خریدتے ہیں۔ یونس بٹ اُردو مزاح کی روایت کا باشعور فن کار ہے انھوں نے مغربی مزاحیہ ادب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان کی کالم نگاری کو سراہتے ہوئے ممتاز مزاحیہ شاعر سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں:

''ظرافت ان کی تحریروں میں ایک مسلسل دریا کی طرح ٹھاٹھیں مارتی بہتی ہے۔ مدت کے بعد اس کتاب میں مزاح کی ایسی تحریر نظر سے گزری جو راوی کے پہلے کی گھاس کی طرح اُگتی ہے اور گلستان فاطمہ کے گلاب کی طرح مہکتی ہے۔ مجھے ان کے اُسلوب مزاح میں مشتاق احمد یوسفی اور شفیق الرحمٰن کی آمیزش کا احساس ہوتا ہے''۔(۱۱۴)

ڈاکٹر یونس بٹ کی کالم نگاری کا سفر بھی جاری ہے۔ کم مدت میں انھوں نے ادبی کالم نگاری میں اپنا منفرد مقام جس طرح بنایا ہے۔ وہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا بین ثبوت ہیں۔ اگر کامیابی کا یہ تسلسل اسی طرح برقرار رہا۔ تو ادبی کالم نگاری کی جدید روایت میں ان کا حصہ سب سے زیادہ نمایاں ہوگا۔

☆☆☆☆

بحیثیت مجموعی اُردو کالم نگاری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سب سے زیادہ کالم سیاسی موضوعات پر لکھے جاتے ہیں۔ اب اکثر بیشتر کالم نگاروں کا اوڑھنا بچھونا ہی یہی رہ گیا ہے کہ کاروبار سیاست کو یہی کالم نگاری کا سب سے بڑا موضوع سمجھتے ہیں۔ اخبارات کے مالکان و مدیران کا بھی یہی کہنا ہے کہ لوگ اخبارات خریدتے ہی سیاسی خبروں اور کالموں کے لئے ہیں۔ لامحالہ طور پر اس کا اثر ادبی کالم نگاری کی روایت پر بھی پڑا ہے۔ ادبی کالم جس شاندار ماضی کے حامل ہیں۔ وہ اب ماضی کا قصہ پارینہ بنتا جارہا ہے۔ اس باب میں ان ادبی کالم نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے ادبی کالم نگاری کو بھرپور توجہ دی اور درجنوں کالم ادب یا ادبی اسلوب میں تحریر کیے اور اپنے کالموں میں ادبیت کے اوصاف پیدا کیے۔ پاکستان میں ادب کالم نگاری کا مستقبل اس امر سے وابستہ ہے کہ عوام میں ادب شناسی اور ذوقِ شعری کتنا پایا جاتا ہے اور انھیں ادب سے کتنی دلچسپی ہے۔ جب تک ادب کے باذوق قارئین موجود رہیں گے۔ اخبارات کے صفحات پر ادبی کالم چھپتے رہیں گے۔ اخبارات میں وہی تحریر چھپتی ہے جس کے پڑھنے والے موجود ہوں۔ ماضی میں صحافت کا مقصد معاشرے کی اصلاح، سچائی کا فروغ اور تہذیب وثقافت کی مثبت اقدار کی ترقی تھا۔ کئی صحافتی بذات خود شاعر وادیب بھی تھے اور انھیں ادب کی قدر و قیمت کا احساس تھا۔ اخبارات میں ادبی کالم بڑی آن بان سے چھپتے تھے۔ اس دور میں عوام میں بھی ذوق ادب موجود تھا۔ ہماری لائبریریاں آباد تھیں۔ لہٰذا ادبی کالم کو پھلنے پھولنے کے لیے خوب سازگار ماحول میسر آیا۔

وقت کی نئی کروٹ سے ادب عوام کی ترجیحات میں بہت پیچھے چلا گیا ہے۔ اخباری دنیا میں اب وہ پہلے جیسے شاعر وادیب اور ادب دوست صحافی نہیں رہے ہیں۔ اس لیے ادبی کالم کو پنپنے کے لیے کئی مشکلات درپیش ہیں۔ ادبی کالم کی ترقی ادب کی اشاعت وترویج سے وابستہ ہے۔ ادبی کالم تب ہی ارتقاء کے تسلسل کو قائم رکھ سکتا ہے جب صحافت ادب کے فروغ میں اپنا کردار ایک مشنری جذبے سے ادا کرے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ احتشام حسین، ''تنقیدی نظریات''، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، طبع اوّل جون ۱۹۶۵ء ص۔ ۳۵

۲۔ حفیظ صدیقی ابوالاعجاز، ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۵ء ص ۸

۳۔ اسحاق وردگ ''ادب کیا ہے''؟ غیر مطبوعہ مضمون۔

۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ''اشاراتِ تنقید''، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، باراوّل۔ ۱۹۶۶ء، ص۔ ۳۴۴

۵۔ اسحاق وردگ ''ادب کیا ہے؟'' (غیر مطبوعہ مضمون)

۶۔ شفیق جالندھری، ''اُردو کالم نویسی''، علمی کتب خانہ لاہور۔ س۔ ن، ص۔ نمبر ۷۹

۷۔ ایضاً، ص۔ ۷۹

۸۔ انٹرویو: ڈاکٹر ظہور احمد اعوان بتاریخ، یکم دسمبر، ۲۰۰۸ء۔ بوقت ۱۱:۵۰، بمقام سرحد پبلک کمیشن پشاور۔

۹۔ انٹرویو: انتظار حسین، از راقم بتاریخ: ۶ نومبر ۲۰۰۸ء بوقت، ۱۰:۲۳ صبح۔ بمقام رہائشگاہ انتظار حسین، لاہور۔

۱۰۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ''اُردو ناول میں طنز و مزاح'' اُردو اکادمی، دہلی۔ ۱۹۸۷ء ص۔ ۵۸

۱۱۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، ''اُردو صحافت میں طنز و مزاح''۔ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور۔ ۱۹۹۶ء ص۔ ۲۱۔

۱۲۔ خواجہ عبدالغفور، ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ''۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۱۹۸۳ء، ص۔ ۷۹

۱۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ''اُردو صحافت میں طنز و مزاح'' مکتبہ عالیہ۔ لاہور۔ ۱۹۷۷ء، ص۔ ۴۰، ۴۱۔

۱۴۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، ''اُردو صحافت طنز و مزاح'' ص۔ ۱۹

۱۵۔ خواجہ عبدالغفور۔ ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ'' ص۔ ۲۷

۱۶۔ ڈاکٹر ایم، سلطانہ بخش، ''داستانیں اور مزاح'' مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور۔ ۱۹۹۳ء ص۔ ۵۴۔ ۵۵

۱۷۔ ڈاکٹر شفیق جالندھری، ''کالم نویسی''، ص۔ ۴۱۔ ۴۳

۱۸۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، ''عبدالماجد دریا آبادی احوال و آثار''، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور طبع دوم ۲۰۰۶ء ص۔۵۰۱

۱۹۔ ایضاً، ص۔۵۲۵

۲۰۔ ظفر عالم ظفری ڈاکٹر، ''اردو صحافت میں طنز و مزاح'' ص۔۱۲۹

۲۱۔ ہفت روزہ ''سچ'' بابت ۲۳ دسمبر ۱۹۳۲ء

۲۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، ''عبدالماجد دریا بادی احوال و آثار''، ص۔۵۴۲

۲۳۔ ڈاکٹر ظفر سعید سیفی، حرف آغاز مشمولہ "افکار و حوادث" جلد سوم، مرتبہ: محمد حمزہ فاروقی، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی ستمبر ۲۰۰۲ء، ص۔۲

۲۴۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ''اُردو ادب میں طنز و مزاح'' ص۔۳۳۵

۲۵۔ ایضاً، ص۔ ۳۳۵

۲۶۔ روزنامہ ''زمیندار'' ۸ جنوری ۱۹۲۳ء، ص۔۲

۲۷۔ روزنامہ ''انقلاب'' ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء ص۔۳

۲۸۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، ''اُردو صحافت میں طنز و مزاح'' ص۔۱۴۲۔۱۴۳

۲۹ پندرہ روزہ ''چنگاری'' دہلی۔ جولائی ۱۹۸۴ء۔ ص۔ ۶۱

۳۰۔ حاجی لق لق ''فکاہات'' روزنامہ ''زمیندار''، لاہور۔۱۲ اپریل ۱۹۵۲ء، ص۔۳

۳۱۔ ڈاکٹر شفیق احمد، ''مولانا غلام رسول مہر حیات اور کارنامے''، مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء ص۔۱۹۱۔۱۹۲

۳۲۔ ایضاً ص۔۱۹۷

۳۳۔ روزنامہ ''انقلاب''، ۱۸ مئی ۱۹۴۱ء ص۔۴

۳۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ''مولانا مہر بحیثیت مصنف'' مشمولہ: فنون، لاہور، ۱۹۶۶ء ص۔۲۴

۳۵۔ محمد اسلم ڈوگر، ''فیچر، کالم اور تبصرہ''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص۔۱۸۳۔۱۸۴

۳۶۔ ایضاً ص۔۱۸۵

۳۷۔ ایضاً، ص۔۱۸۵

۳۸۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری ''اُردو صحافت میں طنز و مزاح'' ص۔ ۱۵۷

۳۹۔ ''سرپنچ''، لکھنو ۲۲ فروری ۱۹۳۳ء، ص۔۴

۴۰۔ رشید احمد صدیقی (مقدمہ) ''دفیائے تبسم'' مولفہ: شوکت تھانوی۔ص۔ ۱۱

۴۱۔ عبدالمجید سالک، ''کیا قافلہ جاتا ہے''، مکتبہ تہذیب و فن کراچی ۱۹۸۴ء ص۔۵۴

۴۲۔ چراغ حسن حسرت، ''حرف و حکایت'' مکتبہ کارواں س۔ن، ص۔۳

۴۳۔ عبدالمجید سالک، خاکہ بعنوان: مولانا چراغ حسن حسرت ''یاران کہن'' مطبوعات چٹان، لاہور، س۔ن، ص۔۲۷۱

۴۵۔ ضمیر جعفری، سرآغاز ''حرف و حکایت'' ،ص۔ ۱

۴۶۔ روزنامہ "امروز "لاہور ۱۲ اپریل ۱۹۴۸ء، ص۔۳

۴۷۔ عبدالمجید سالک مقدمہ مشمولہ ''حرف و حکایت'' ،ص۔۵

۴۸۔ محمد اسلم ڈوگر، ''فیچر، کالم اور تبصرہ''، ص۔ ۱۸۸۔۱۸۹

۴۹۔ ایضاً، ص۔۱۸۹

۵۰۔ ایضاً، ص۔۱۹۰

۵۱۔ سرورق، ''تلخ، ترش، شیریں''

۵۲۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، ''منٹو اور مزاح'' بیت الحکمت لاہور ۲۰۰۷ء، ص۔ ۱۱

۵۳۔ ایضاً، ص۔۱۶۴

۵۴۔ ''یوم اقبال پر مشمولہ ''منٹو اور مزاح'' ص۔ ۴۸

۵۵۔ جگدیش چندر ودھاون، ''منٹو نامہ''، مکتبہ شعر و ادب س۔ن ،ص۔ ۳۵۹۔۳۶۰

۵۶۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، ''منٹو اور مزاح'' ص۔ ۱۳۰۔۱۳۱

۵۷۔ ڈاکٹر شفیق جالندھری، ''کالم نویسی'' ص۔۲۹

۵۸۔ روزنامہ ''جنگ'' کراچی۔ ۲۵ فروری ۱۹۵۶ء، ص۔۳

۵۹۔ کالم ''موسم کی برسات'' روزنامہ ''جنگ'' کراچی۔۱۸ جنوری ۱۹۵۶ء۔ص۔۴

۶۰۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، ''اُردو صحافت میں طنز و مزاح''، ص۔۳۱

۶۱۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب، ''اُردو صحافت اور فکاہیہ کالم کی روایت'' ،ص۔۲۷۴

۶۲۔ ضمیر جعفری سید کالم ''نظر غبارے'' روزنامہ ''مشرق'' لاہور۔۲۶ جولائی ۱۹۸۷ء،ص۔۱۰

۶۳۔ مرزا ادیب ''ادبی کالم''، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز ۱۹۹۷ء،ص۔ ۷۸

۶۴۔ ایضاً،ص۔ ۲

۶۵۔ ایضاً،ص۔ ۹۵

۶۶۔ ایضاً،ص۔۴۱

۶۷۔ ایضاً،ص۔۱۴

۶۸۔ عبدالغفار کوکب، ڈاکٹر ''اُردو صحافت اور فکاہیہ کالم کی روایت''،ص۔۲۲۰

۶۹۔ محمد عالم خان، ''چند ادبی مسائل'' پاکستان اینڈ لٹریری ساونڈ لاہور ۱۹۹۱ء،ص۔۹۴

۷۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''تہذیب وفن''، پاکستان فاونڈیشن ۱۹۷۵ء،ص۔۹۶

۷۱۔ احمد ندیم قاسمی ''تہذیب وفن'' ص۔ ۱۶

۷۲۔ ایضاً،ص۔۲۴

۷۳۔ ایضاً،ص۔۵۶

۷۴۔ ایضاً،ص۔۲۴

۷۵۔ ایضاً،ص۔ ۷۷

۷۶۔ ضیاء الحسن موسوی، مضمون ''کیوڑے کا پھول مرجھا گیا'' روزنامہ جنگ کراچی ۵ نومبر ۱۹۷۷ء،ص۔۳

۷۷۔ سووینیر بہ تقریب اجراء تصانیف ابراہیم جلیس ،مکتبہ جلیس کراچی ص۔۴۲

۷۸۔ روزنامہ ''جنگ''، کرچی، ۲۵ مارچ ۱۹۵۹ء

۷۹۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، حرف آغاز ''رشتے رویئے'' از: تاج سعید، کلاسیک پبلشر، لاہور ۲۰۰۶ء، ص۔۲۱

۸۰۔ ایضاً، ص۔۴۴

۸۱۔ ایضاً، ص۔۲۹

۸۲۔ فلیپ ''رشتے رویئے'' از: تاج سعید

۸۳۔ تاج سعید، ''رشتے رویئے''، ص۔۱۲۶

۸۴۔ تاج سعید، ''پشاور کا تازہ ادبی منظر نامہ''، غیر مطبوعہ کالم

۸۵۔ تاج سعید، ''رشتے رویئے''، ص۔۲۵

۸۶۔ انتظار حسین، فلیپ ''ذرے''، پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور ۱۹۸۶ء

۸۷۔ ایضاً۔ص۔۳۰

۸۸۔ ایضاً، ص۔۴۷

۸۹۔ ایضاً، ص۔۳۸

۹۰۔ انتظار حسین ''بوند بوند''، میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۴ء، ص۔۴۶

۹۱۔ ایضاً، ص۔۳۸۷، ۳۸۸

۹۲۔ اسحاق وردگ، ''ادبی کالم نگاری کی روایت'' غیر مطبوعہ مضمون

۹۳۔ انتظار حسین ''بوند بوند''، ص۔۱۳۔۱۴

۹۴۔ سہیل احمد خان، ''ایک شہر کے سراغ میں''، دیباچہ: بوند بوند، ص۔۱۸

۹۵۔ جمیل الدین عالی ''دعا کر چلے'' ص۔۴۱۴

۹۶۔ مستنصر حسین تارڑ ''کارواں سرائے'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔۱۹۹۹ء، ص۔۳۱۔

۹۷۔ مستنصر حسین تارڑ ''کارواں سرائے'' ص۔۶۸

۹۸۔ مستنصر حسین تارڑ ''چک چک'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔۱۹۸۹ء صفحہ نمبر ۱۰۹

۹۹۔ مستنصر حسین تارڑ، کالم بعنوان ''کارواں سرائے'' روزنامہ مشرق لاہور ۱۵ اپریل ۱۹۸۵ء ص۔۳

۱۰۰۔ امجد اسلام امجد ''چشم تماشا'' سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔۱۹۹۳ء، ص۔۱۰

۱۰۱۔ امجد اسلام امجد ''تیسرے دہر کی دھوپ'' سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔۲۰۰۳ء، ص۔۱۵

۱۰۲۔ ایضاً۔ص۔۵۷

۱۰۳۔ ایضاً۔ص۔۱۰۶

۱۰۴۔ ایضاً۔ص۔۱۲۵

۱۰۵۔ ایضاً۔ص۔۳۷۴

۱۰۶۔ عبدالغفار کوکب، ڈاکٹر، ''اُردو صحافت اور فکاہیہ کالم کی روایت'' ص۔۳۱۳

۱۰۷۔ امجد اسلام امجد کالم بعنوان ''چشم تماشا'' روزنامہ ''جنگ'' لاہور ۶ مئی ۱۹۹۳ء، ص۔۲

۱۰۸۔ احمد ندیم قاسمی فلیپ ''شناخت پریڈ'' پاکستان بکس اینڈ لٹریز ساؤنڈ، لاہور۔۱۹۹۱ء

۱۰۹۔ ڈاکٹر محمد یونس بٹ، ''بٹ پارے'' سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔۲۰۰۸ء، ص۔۱۷

۱۱۰۔ ''مجموعہ'' ڈاکٹر محمد یونس بٹ ص۔۳۵۸

۱۱۱۔ بحوالہ ''اُردو صحافت اور فکاہیہ کالم کی روایت'' ص۔۱۹۸

۱۱۲۔ ڈاکٹر یونس بٹ، ''مجموعہ''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ص۔۵۸۳

۱۱۳۔ ''مجموعہ'' ڈاکٹر محمد یونس بٹ۔ص۔۳۳۱

۱۱۴۔ سید ضمیر جعفری فلیپ ''شناخت پریڈ''

☆☆☆☆

بابِ سوّم

مشفق خواجہ ایک صاحبِ اُسلوب کالم نگار

باب سوم

مشفق خواجہ ایک صاحبِ اُسلوب کالم نگار

ادبی موضوعات پر مشفق خواجہ کی کالم نگاری فکاہی ادب کا ایک منفرد اور شگفتہ باب ہے۔ یہ کالم محض طنز ومزاح اور ظرافت کی خوبیوں سے مملو تحریریں نہیں بلکہ ان میں تنقید و تحقیق کے بلند پایہ نمونے بھی ملتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کالم اُردو ادب کے ایک باخبر محقق اور نقاد کے قلم سے نکلے ہیں۔جس کی اُردو ادب کے کلاسیکل سرمایے اور جدید تصورات پر گہری نظر ہے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے۔اردو کے اس بڑے کالم نگار کے کام تفصیلی جائزہ الگ سے ایک باب میں لیا جائے۔

خامہ بگوش اردو ادبی کالم نگاری کا ایک مشہور ترین نام ہے۔ جو مقبولیت خامہ بگوش کے حصے میں آئی اور دنیائے ادب میں جس طرح انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ مرتبہ تا حال کسی ادبی کالم نگار کو حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ خامہ بگوش کے پردے میں نام ور محقق مشفق خواجہ کے قلم کے جوہر سامنے آتے ہیں۔خامہ بگوش کے جائزے سے قبل مشفق خواجہ کے فن وزندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

مشفق خواجہ کا اصلی نام خواجہ عبد الحئی ہے۔ مشفق خواجہ ادبی نام، اور خامہ بگوش قلمی نام ہے۔ وہ ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ء سے وفات تک (م، ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء) انھوں نے کراچی میں رہائش اختیار کیے رکھی۔کراچی ہی میں ۱۹۵۷ء میں بی اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ ماسٹر (اُردو) ۱۹۵۸ء میں کراچی یونی ورسٹی سے کیا۔

مصروف علمی وادبی مرکز انجمن ترقی اُردو پاکستان سے ۱۹۵۷ء تا ۱۹۷۳ء تک وابستہ رہے اس دوران ۱۹۶۱ء تک بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ساتھ علمی وادبی کام کرنے کا اعزاز رہا۔مشفق خواجہ نے کئی ادبی مجلّات کی ادارت بھی کی۔ جن میں سہ ماہی ''اُردو'' ماہنامہ ''قومی زبان'' اور ''قاموس الکتب'' سے بحیثیت مدیر وابستگی شامل ہے۔آپ کی تالیفات مرتبات وتصانیف آپ کی تحقیقی وعلمی کارناموں کا بین ثبوت

ہیں۔ تفصیل درجہ ذیل ہے۔

تصانیف:

۱۔ ''گوش معرکہ زیبا'' تذکرہ شعراء۔ مصنفہ سعادت خان ناصر، ۱۹۴۸ء۔ اس ضخیم تذکرہ کو مقدمے کے ساتھ مرتب کیا۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے دو جلدوں میں ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔

۲۔ ''پرانے شاعر نیا کام'' بعض ایسے شعراء پر تحقیقی کام جن پر پہلے کبھی نہیں لکھا گیا۔

۳۔ ''حالات اور انتخاب کلام'' یہ کتاب قسط وار سہ ماہی ''غالب'' کراچی میں ۷۶۔۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔

۴۔ ''زیبات'' مجموعہ کلام ۱۹۷۸ء کراچی سے چھپا۔

۵۔ ''اقبال'' علامہ اقبال پر لکھی گئی اُردو میں پہلی کتاب جو پہلی بار علامہ اقبال کی زندگی میں شائع ہوئی مگر کچھ وجوہات کی وجہ سے جلا دی گئی۔ مشفق خواجہ نے اسے مفصّل مقدمے، تعلیقات وحواشی کے ساتھ مرتب کیا۔ ۱۹۷۹ء میں یہ کتاب کراچی میں انجمن ترقی اُردو پاکستان سے شائع ہوئی۔

۶۔ غالب اور ان کے شاگرد صغیر کے تعلقات اور خط وکتابت کے بارے میں کتاب 'غالب اور صغیر بلگرامی' ۱۹۸۱ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔

۷۔ ادبی کتابی سلسلہ ''تخلیقی ادب'' پانچ جلدوں میں ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء کے دوران کراچی سے شائع ہوا۔

۸۔ ''جائزہ مخطوطات اُردو'' پہلی جلد (۱۲۴۸ صفحات پر مشتمل) مرکزی اُردو بورڈ لاہور سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔

۹۔ ''تحقیق نامہ'' تحقیقی مقالات کا مجموعہ، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۱ء میں شائع کی۔

۱۰۔ اُردو کے مختلف علمی وادبی جریدوں میں لگ بھگ دو درجن مقالات شائع ہوئے۔

۱۱۔ ۱۹۶۵ء ۱۹۷۶ء تک مختلف موضوعات پر ریڈیو پاکستان کے لیے مختلف موضوعات پر تقریباً چار سو موضوعات پر فیچر لکھے۔

۱۲۔ مشفق خواجہ نے خامہ بگوش کے قلمی نام سے ۱۹۷۱ء تا ۱۹۹۷ء مختلف اخبارات ورسائل (صداقت جسارت زندگی، تکبیر) کے لیے دو ہزار سے زائد (سیاسی وادبی) کالم لکھے۔ ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو بحر تحقیق وادب کا شناور اللہ کو پیارا ہو گیا۔

مشفق خواجہ انسان تھا اعجاز نہاد
شاعر، نثر نگار، محقق اور نقاد
محسن علم وادب تھی اس کی طبع جواد
مشفق خواجہ زندہ باد، مشفق خواجہ زندہ باد (۱)

مشفق خواجہ کی کالم نگاری:

ادبی موضوعات پر مشفق خواجہ کی کالم نگاری فکاہی ادب کا ایک منفرد اور شگفتہ باب ہے۔ یہ کالم محض طنز ومزاح اور ظرافت کی خوبیوں سے مملو تحریریں نہیں بلکہ ان ان میں تنقید وتحقیق کے بلند پایہ نمونے بھی ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کالم اُردو ادب کے ایک باخبر محقق اور نقاد کے قلم سے نکلے ہیں۔ جس کی اُردو ادب کے کلاسیکل سرمایے اور جدید تصورات پر گہری نظر ہے۔ مشفق خواجہ نے خامہ بگوش کے نام سے یہ کالم لکھے ہیں۔ ان کا یہ قلمی نام اس قدر مقبول ہوا کہ خود ان کا اصل دب گیا اور ان کے قارئین ان کو ان کے ادبی نام سے جاننے لگے۔ گویا خامہ بگوش ان کا شناخت بن گیا۔

ان کالموں میں موضوعات کا ایک تنوع اور تنقیدی نظریات کی رنگا رنگی موجود ہے۔ خامہ بگوش نے دلیل اور منطق کے ذریعے طنز ومزاح کے حربوں سے کام لیا ہے۔ اسی خوبی کی وجہ سے ان کالموں میں حد سے زیادہ مبالغہ نہیں پایا جاتا۔ خامہ بگوش نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا وہ خیالی نہیں ہیں، تاہم تخیل آفرینی کے حسن سے ان تحریروں میں خیال آرائی کا ایک جہانِ معنی آباد ہے۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری خامہ بگوش کی کالم نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''بیسویں صدی کے آخری ربع میں طنز ومزاح کی روایت میں ایک اور اہم باب کا اضافہ ہوا اور یہ باب ہے ادبی فکاہی کالم نگاری کا۔۔۔۔۔خاص طور

پر "سخن در سخن" "ایک ایسا کالم ہے جس میں تجزیہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی۔ اس میں تخلیقی جوہر بھی ہے اور بہترین تنقید بھی۔ اس میں حقائق بھی ہیں اور انفرادی نکتہ نظر بھی، اس میں تلخ نوائی بھی ہے اور سچائیوں کا اظہار بھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ طنز وظرافت اس کالم کی روح ہے''۔ (۲)

مشفق خواجہ کی کالم نگاری طنز برائے طنز کے جذبے کی وجہ سے وجود میں نہیں آتی بلکہ اس کا مقصد ادب اور ادیب میں رائج ہونے والی غلطیوں کی درستی اور اصلاح ہے تا کہ شاعر و ادیب اپنی فکری و ادبی لغزشوں سے باخبر ہو جائیں اور آئندہ کے لیے کارِ ادب کو سہل کام نہ سمجھیں۔ وحید الرحمٰن خان رقمطراز ہیں:

''خامہ بگوش کی نظر سے جب کوئی سطحی اور غیر معیاری تصنیف گزرتی ہے تو وہ ظریفانہ مگر جارحانہ انداز میں اس کتاب کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ جارحیت ان کتابوں کے مصنفین کو ناگوار گزرتی ہے۔ اور وہ اسے ذاتی رنجش اور پرخال پر محمول کرتے ہیں۔ (۳)

خامہ بگوش اس رائے کو قطعاً رد کرتے ہیں۔ کہ یہ کالم ذاتیات کی وجہ سے لکھے ہیں۔

''جن ادیبوں کے متعلق میں نے کالم لکھے۔ ان میں بعض بے حد حساس تھے۔ ان کا یہی خیال ہے کہ میں نے کسی خاص وجہ سے ان کے خلاف کالم لکھے ہیں۔ حالانکہ میں نہ کسی کے خلاف لکھتا ہوں اور نہ ہی اس میں کوئی وجہ کارفرما ہوتی ہے۔ اگر کسی کتاب میں مجھے کوئی مضحکہ بات نظر آتی ہے تو میں اس طرف اشارہ کر دیتا ہوں''۔ (۴)

مشفق خواجہ کی جرات اظہار کے سامنے کوئی مصلحت آڑے نہیں آتی۔ انھوں نے جو محسوس کیا اسے طنزیہ اور مزاحیہ پیرائے میں بیان کیا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری ان کے اس وصف کا اعتراف ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''وہ ادب میں ہر چیز کو برداشت کر سکتے ہیں۔ لیکن خودنمائی خود فراموشی اور اتھلے پن کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح محض ''زبان'' کے نام پر برتری جتانے والے بھی ان سے داد و تحسین پانے کی توقع نہیں کر سکتے۔ جھوٹے نقلی

ادیبوں، سرقے کے مرتکب سفر نامہ نگاروں اور اس قبیل کے Petty تنقید نگاروں کو معاف کرنا ان کے مسلک میں جائز نہیں وہ یہ سب کچھ ایسے انداز میں کرتے ہیں۔ جو اُنھی سے مخصوص نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ وہ ادب کے سنجیدہ نقاد کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ محض طنز و مزاح لکھنے والے ادیب کی حیثیت سے نہیں''۔ (۵)

طنز و مزاح کے بارے میں پرکشش ادبی اُسلوب کے ذریعے ادبی کتابوں اور شخصیات کی خامیوں کی طرف نشان دہی اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ جھٹلائی نہیں جاسکتی کہ ان کے نزدیک ان کالموں کا مقصد ہرگز کسی کی ذاتی توہین یا پھکڑ پن نہیں ہے وہ اپنے شگفتہ انداز تحریر کے ذریعے یہ پیغام دیتے ہیں کہ ادب ایک کارِ عبارت کی طرح سنجیدہ عمل ہے۔ جس کی تخلیق میں ریاضت اور یکسوئی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تن آسانی اور سہل کاری کو کار ادب سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

مشفق خواجہ کے ہر کالم میں ان کا یہی نقطہ نظر زیریں سطح پر موجود رہتا ہے۔ اپنے خاص ظریفانہ اُسلوب بیان میں اس کی وضاحت اپنی کتاب کے دیباچے بعنوان ''غلط نامہ'' میں ایک نئے انداز میں کیا ہے۔

''بہر حال اب جب کہ کالموں کا انتخاب کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ ہم یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جن ادیبوں پر ہم نے لکھا ہے اب سب کے لئے ہمارے دل میں احترام بھی ہے اور محبت بھی۔ محبت میں چونکہ سبھی کچھ ناجائز ہوتا ہے۔ اس لئے کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جنھیں غالب کے لفظوں میں ''سخن گسترانہ'' کہا جاسکتا ہے۔ امید ہے ہماری یہ ''سخن گستری'' آئندہ کے خوشگوار تعلقات کی راہ میں رکاوٹ ثابت نہیں ہوگی۔ خوشگوار تعلقات سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہمارے ممدوحین وہی کچھ لکھے پر بساط بھر اظہار خیال کرتے رہیں۔ جب ہم ان کے لکھے کا برا نھیں مانتے تو انھیں بھی ہمارے لکھے پر ناخوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ ممکن ہے ہماری مذکورہ معذرت خواہانہ باتوں پر بعض لوگوں کو یقین نہ آئے۔ لہٰذا ہم ان کی تالیفِ قلب کے لیے اعلان کرتے ہیں، کہ اس کتاب میں جتنے بھی نام آئے ہیں۔ سوائے لاغر مراد

آبادی کے نام سے وہ سب فرضی ہیں۔ ناموں کے جزوی یا کلی مماثلت اتفاقی ہوسکتی ہے، ارادی نہیں''۔ (۶)

مشفق خواجہ کی شگفتہ نگاری کی جڑیں تخیّلاتی یا مبالغے سے زیادہ حقائق کی دنیا سے جڑی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اُردو کے ایک بے باک محقق اور صاحب نظر ادب شناس تھے جن کی نظر اُردو کے کلاسیکی سرمائے پر بھی تھی اور جدید اُردو ادب کے منظرنامے پر بھی۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

''خامہ بگوش کا مقصد معاشرے کی بالعموم اور ادبی معاشرے کی ناہمواریوں کو بالخصوص نشان زد کر کے عوام اور ادبا کو اپنی بگڑی ہوئی صورت دیکھنے پر آمادہ کرنا ہے۔ اس کالم میں وہ اپنے بسطِ مطالعے سے بھی استفادہ کرتے اور قاری کو علمی، ادبی اور تہذیبی معلومات، فکر ونظر کے زاویوں اور اہل دانش کے خیالات سے بھی آگاہ کرتے جاتے تھے اور یہ سب کچھ اس سادگی، معصومیت اور پرکاری سے کرتے کہ پڑھنے والوں کے لبوں پر مسکراہٹ رقص کناں ہوجاتی، لکھنے والے گردن ڈال دیتے''۔ (۷)

ان کے کالموں میں موضوعاتِ ادب کا ایک جہان حیرت نظر آتا ہے۔ یہ کالم خامہ بگوش کی بے انتہا ادب شناسی کا ثبوت دیتے ہیں۔ نظم ونثر کے سبھی اصناف پر مبنی کتب کا ظریفانہ تذکرہ ان کے کالموں میں ملتا ہے۔

مشفق خواجہ ایک جہاندیدہ اور پختہ کار شاعر بھی رہے۔ اس طرح وہ شاعرانہ اور مزاج، شعری نزاکتوں اور اُردو شاعری کی روایت سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔ وہ اکابر ادب کی حیثیت سے علوم ادب کے کئی شعبوں میں مہارت وادراک رکھتے تھے۔

ان کے کالموں میں کمزور شعری مجموعوں کو طنز ومزاح کی کسوٹی پر جس ہنرمندی سے پرکھا گیا ہے، اور ظرافت کے پردے میں ان کی خامیوں اور کمزوریوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ اس سے خامہ بگوش کی شعری کی صلاحیت سے پردہ اٹھتا ہے۔ مثال کے طور ان کے کالم ''شاعری یا گناہِ بےلذت'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''ہم بڑے ادب سے عرض کریں گے۔ کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ شاعری کے نام سے جو چیز لکھی جائے وہ لازماً شاعری ہو اور نثر کے نام جو کچھ لکھا جائے وہ لازماً

نثر ہو۔ ترقی پسندوں کی شاعری کہیں سے اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اس پر نثر کا گماں
گزرتا ہے عبد العزیز خالد کی نثر دیکھ لیجیے تو وہ شاعری نظر آتی ہے اس میں
ردیف وقافیہ ہی کی نہیں، عروض کی پابندی بھی ملتی ہے ایسی نثر کو شاعری نہیں کہا
جائے گا تو اور کیا کہا جائے گا''۔ (۸)

اس اقتباس کی شگفتہ بیانی سے چہرے پر مسکراہٹیں کھل اٹھتی ہیں اور یہی اعلیٰ مزاح کی خوبی ہے۔ ان ہلکے پھلکے جملوں میں درون خانہ کئی سنجیدگی پائی جاتی ہے اور یہی خامہ بگوش کا امتیازی وصف ہے۔ ان کالموں میں ایک باخبر، بیدار مغز اور حاضر دماغ تخلیق کار کا کردار سامنے آتا ہے۔ جو اپنے عہد کے بدلتے ہوئے نظریات کا ادراک رکھتا ہے جسے شاعر و ادیب کی منافقت اور عمل کے تضاد کا علم ہے اور جسے مہارت سے بے نقاب کرنے کا ہنر آتا ہے۔ یہ ایسی تخلیقی اور شخصی صلاحتیں ہیں جو خامہ بگوش تک محدود ہیں۔

''ادبی منشیات'' کے عنوان سے لکھے گئے کالم میں یہ خوبیاں یکجا ملتی ہیں۔ لسانی تشکیلات کے حوالے سے معروف شاعر ظفر اقبال کے شعری نظریات کو جس باریک بینی سے انھوں نے اپنے کالم ''ادبی منشیات'' میں کنگالا ہے۔ وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ خامہ بگوش لکھتے ہیں۔

''کچھ عرصے سے ظفر اقبال کی شخصیت کا ایک نیا پہلو سامنے آیا ہے اور وہ یہ ہے
کہ موصوف نقاد بھی بہت اعلیٰ درجے کے ہیں۔ اس وقت ان کا جو مقالہ ہمارے
سامنے ہے۔ اس کا عنوان ہے۔ ''جدید اردو غزل اور نئی شعریات'' پہلا
مقالہ فکر انگیز تھا۔ مگر یہ خاصا تشویش انگیز ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ
موجودہ شاعری ناقابل برداشت حد تک یکسانیت کا شکار ہو چکی ہے۔ اسے
مسترد کر کے اس کی شکل وصورت کے ساتھ اس کے معیارات کو بھی تبدیل
کرنے کی اشد ضرورت ہے''۔ (۹)

اس کے بعد کالم میں ظفر اقبال کی رائے اقتباس کی صورت میں ان ہی کے لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ قاری اصل متن کو سمجھ سکے بعد ازاں خامہ بگوش اس کی رائے کا پوسٹ مارٹم یوں کرتے ہیں۔

''آج کل ہمارے ادیبوں میں اپنی تحریروں کو دوسری زبانوں میں ترجمہ

کرانے کا جو شوق ہوا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کسی تحریر کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کے ترجمے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تو آج کل نوے فیصد طبع زاد تحریروں پر ترجمے کا گمان گزرتا ہے۔ شاعروں کی اسی ترجمہ کا لحاظ کرتے ہوئے ظفر اقبال نے مذکورہ بالا تجویز پیش کی ہے۔ ہم نہایت ادب سے عرض کریں گے کہ آپ کی تجویز کردہ شعریات کے مطابق جو غزل وجود میں آئے گی اسے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیوں کہ یہ غزل جتنی کسی اور جاننے والے کی سمجھ میں آئے گی۔ اتنی ہی کسی اور نہ جاننے والے کی سمجھ میں بھی نہیں آئے گی''۔ (۱۰)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے شاعروں میں ایک اور نوع کی تن آسانی آگئی ہے اب وہ پی۔ آر یعنی تعلقات عامہ کے ذریعے کمزور شاعری کے باوجود اپنا ایک نام اور مقام بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس قبیح عمل سے باصلاحیت شاعرون کی حق تلفی ہوتی ہے۔ سرکاری مشاعرے ہوں، ریڈیو اور ٹی وی کے مشاعرے ہوں یا سرکاری اعزازات اور شہرت کے مزے۔ اب ان سارے وسیلوں پر کمزور شاعر خوشامد، سفارش اور دوسرے ہتھکنڈوں سے قابض ہو جاتے ہیں۔ ادب کے لیے اس قسم کے مفاد پرستانہ رویے ضرررساں ثابت ہوتے ہیں۔ خامہ بگوش کے کالم میں کمزور شاعری، مضبوط پی آر، میں ایسے ہی دوغلے کردار کے نام نہاد شاعروں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ کالم کے پہلے پیراگراف کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''قریشی پچھلے پچاس سالوں سے کلام موزوں یعنی شاعری کے انبار لگا رہے ہیں۔ اس کہنہ مشقی کے باوجود ٹی۔ وی کے کسی مشاعرے میں ان کی صورت اور کسی ادبی رسالے کے تنقیدی جائزے میں ان کا نام نظر نہیں آتا۔ سبب یہ ہے کہ ان کی پی۔ آر بہت کمزور ہے۔ اگر شاعری کمزور ہوتی تو شاید صورت حال اتنی خراب نہ ہوتی کہ کمزور شاعری والوں کی پی۔ آر بہت مضبوط ہوتی ہے مضبوط پی آر کی وجہ سے ٹی۔ ذی والوں کی سخن فہمی اور نقادوں کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں''۔ (۱۱)

ایک خوب صورت کالم کی سب سے اہم خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں بڑی لطافت کے ساتھ بات سے بات نکالی جاتی ہے کم الفاظ میں زیادہ مفاہم کا بیان ، اُسلوب بیان کا حسن ہے ۔ یہاں صرف ان جملوں کی وضاحت دیکھیے ۔

> ''کمزور شاعری والوں کی پی آر بہت مضبوط ہوتی ہے۔ مضبوط پی آر کی وجہ سے ٹی وی والوں کی سخن فہمی اور نقادوں کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں''۔ (۱۲)

ان فقروں میں ہمارے نئے ادبی کلچر کی قباحتوں سے پردہ اٹھتا ہے۔ ان کے ایک اور کالم ''آمد اور آورد'' میں بھی یہی بیبا کی اور جرأتِ اظہار کا وصف ملتا ہے۔ اس کالم میں انھوں نے معروف شاعر بشیر بدر کی خود پرستی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ خود پرستی شخصیت کا ایسا عیب ہے جس کے ہونے سے خود پرست دوسرے انسانوں کو حقیر سمجھتا ہے۔ خامہ بگوش کے قلم سے خود پرستی کے شکار کو پڑھیے۔

> ''بشیر بدر اپنے آپ کو موجودہ زمانے ہی کا نہیں آنے والے زمانوں کا بھی بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے بعض لوگ انھیں خود پرستی کا مریض قرار دیتے ہیں۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے ہمارے نزدیک بشیر بدر خود پرستی کے مرض میں مبتلا نہیں ہیں۔ بلکہ خود شناسی کے درجے پر فائز ہیں۔ بلا شبہ موجودہ زمانے میں (بقول خود) ان سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر بقید حیات نہیں ہے (واضح رہے) بقید حیات ہونا بقید ہوش وحواس ہونے سے بالکل مختلف چیز ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے''۔ (۱۳)

اس سلسلے میں مزید مثالیں دیکھیے۔

> (۱) ''وہ (بشیر بدر) مشاعرے کے کامیاب شاعر ہیں۔ اور ان کی اسی حیثیت کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ نیز یہ کہ بشیر بدر ایک کالج میں اُستاد ہیں۔ ادب کے استاد کو ادب کا طالب علم بنا دینا بے ادبی ہی نہیں ناواقفیت کی انتہا بھی ہے۔۔۔۔ انا اور خود پرستی انسانی دماغ کے دشمن ہیں تو ہوں، یہاں معاملہ ایک شاعر کا ہے اور شاعر کے دماغ میں یہی کچھ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ کسی

دوسری چیز کی گنجائش یہی نہیں رہتی''۔(۱۴)

(۲) ''ایک سوال کے جواب میں بشیر بدر نے بتایا کہ انھوں نے شاعری پہلے سے شروع کی اور پڑھنا لکھنا بعد میں سیکھا۔ ہمارے خیال میں بہتر یہی تھا۔ کہ وہ شاعری شروع کرنے کے بعد کوئی اور شغل نہ فرماتے کیوں کہ کسی دوسرے شغل کا کوئی مثبت نتیجہ اب تک برآمد نہیں ہوا''۔(۱۵)

(۳) ''یہ بھی درست ہے کہ بشیر بدر لفظوں کو چھوڑ کر غزل بنا دیتے ہیں۔ لفظوں کے اندر جو معنی ہوتے ہیں۔ انھیں وہ اس لیے نہیں چھوتے کہ بعض نازک چیزیں صرف چھونے سے بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔ موصوف کی اسی احتیاط پسندی نے انھیں صاحب اسلوب غزل گو بنا دیا ہے''۔(۱۶)

(۴) ''بشیر بدر نے جس انکساری سے کام لیا ہے۔ اس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو ''ناچیز'' کہا ہے۔ حالانکہ وہ بہت بڑی چیز ہیں۔ انھوں نے ''میں دعویٰ کرتا ہوں'' کی جگہ ''میں اعتراف کرتا ہوں'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جہاں ''میرا کارنامہ یہ ہے'' کہنے کا محل تھا۔ وہاں ''میرا جرم یہ ہے'' لکھا ہے۔ اسی لیے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ''چیز'' کو ''ناچیز'' ''دعوے'' کو ''اعتراف'' اور کارنامے کو ''جرم'' بنا دینے والے نے اُردو غزل کو کیا سے کیا بنا دیا ہوگا''۔(۱۷)

مشفق خواجہ کے کالموں طنز و مزاح:

مشفق خواجہ کے طنز میں تیز کاٹ ہے۔ لیکن ہر مقام پر ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ ذاتیات سے گریز کیا جائے اور شاعروں ادیبوں کی کج روی ہی کو موضوع بنایا جائے۔ ان کے طنز کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ غیر ضروری جذباتیت سے دور رہتے ہیں۔ منطق اور دلیل کے ساتھ اپنے موضوع سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ اس تناظر میں وہ موضوع کے پس منظر کو سمجھانے کے لیے زیر طنز شاعر، ادیب یا کتاب کے حوالے بھی دیتے ہیں اور اسی کا نام ادبی دیانت داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم کی کاٹ کے شکار اکثر شاعر و ادیب اسے اپنی ہتک

سمجھنے کی بجائے اسے ایک ادب پارہ سمجھ کر خود بھی محظوظ ہوتے ہیں۔طنز کے اس عمل میں وہ خود کو بھی اپنے نشانے پر رکھتے ہیں۔مثال کے طور پر فیض کے اسلوب کی نقالی کرنے والے شعرا پر ان کے گہرے طنز کا یہ نمونہ دیکھیے، جس میں انھوں نے اپنی ذات پر بھی طنز کا بھرپور وار کیا ہے۔

> ''فیض کی مقبولیت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی ان کے شعروں، مصرعوں اور شعری ترکیبوں کو اس طرح استعمال میں لاتے ہیں۔جیسے یہ مال غنیمت ہو۔فیض کے کلام کو مال غنیمت سمجھنے والوں میں ہم بھی شامل ہیں۔ بلکہ ہم نے تو ہمیشہ خود فیض صاحب کو بھی مال غنیمت سمجھا اور ان کے بارے میں بیسوں ''سخن گسترانہ'' کالم لکھے''۔(۱۸)

ہمارے شاعروں کی ایک بڑی تعداد ذاتی اثر ورسوخ، پی آر، میڈیا تک رسائی اور سفارشی رقعوں کو سیڑھی بنا کر ایک نمائشی مقام بنا لیتی ہے۔حالانکہ ان کی شاعرانہ حیثیت اور تخلیقی صلاحیت ناقص اور غیر موزوں ہوتی ہے۔ایسے نام نہاد شاعر اپنی اہمیت جتانے کے لیے ترجموں کا سہارا بھی لیتے ہیں۔یعنی وہ اپنی شاعری کے تراجم ہتھکنڈوں کے ذریعے عالمی زبانوں میں کرا دیتے ہیں اور یوں تاثر دیتے ہیں۔جیسے وہ عالمی سطح کے ایسے شاعر ہیں جن کے فکری تحسین اور شاعری کی توصیف ترقی یافتہ ممالک کی زبانوں میں بھی ہوتی ہے۔

مشفق خواجہ ایسے نالائق اور کائیاں شاعروں کے جھوٹے وقار کو قلم کے نوک پر رکھتے ہیں۔جس کی خوب صورت مثال ''ارژرنامۂ ساقی فاروقی'' کے عنوان سے لکھے گئے اس کالم میں دیکھیے۔

> ''جسے دیکھے وہ اپنے کلام کو انگریزی میں منتقل کرانے یا کلیات چھپوانے کی فکر میں ہے۔غالب اور اقبال کے کلام کا ترجمہ ہوتا ہے،تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ کہ یہ بڑے شاعر ہیں اور ان کی شاعری اس لائق ہے کہ انگریزی خواں دُنیا اس سے استفادہ کرے۔مگر ان شاعروں کو اپنے کلام کا ترجمہ کرانے کی کیا ضرورت ہے جن کا کلام اُردو میں بھی ایسا نظر آتا ہے۔جیسے کسی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہو اور ترجمہ بھی کسی ایسے شخص نے کیا ہو جیسے اصل زبان پر دسترس ہو،نا اُردو پر''۔(۱۹)

مشفق خواجہ اُن نام نہاد ادبی گروہوں پر بھی خوب تنقید کرتے ہیں، جو سستی شہرت کے لیے ادب کا علم اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اُردو ادب کی مثبت رُوایات اور اقدار کو انا پرستی کے جذبے میں آکر رد کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل پیراگراف دیکھئے۔

''نئی نسل کو اپنے بزرگوں سے یہ شکایت نہیں کرنی چاہیے کہ انھوں نے اپنے بعد کے شاعروں کو نہیں پڑھا۔ کیوں کہ خود نئی نسل نے اپنے سے پہلے کے شاعروں کو پڑھنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی۔ سچی بات یہ ہے۔ کہ نئی نسل کو سوائے مشاعرے پڑھنے کے کچھ اور پڑھنے کا شوق ہی نہیں ہے۔ ندا فاضلی کا شکوہ سن کر انٹرویو لینے والے نے ان سے پوچھا'' آپ نے اپنے بعد آنے والی نسل کے لیے کیا کیا ہے''؟ موصوف نے جواب دیا'' میں نے ہر نئی آواز کو متعارف کرانے میں حصہ لیا ہے۔ حیدر آباد دکن کے شاعر علی کی نظمیں میں نے اپنے نوٹ کے ساتھ ''شاعر'' ممبئی میں شائع کرائی تھیں۔ شاید اسی نوٹ کا اثر یہ ہے کہ اس شاعر کا نام اور کلام پھر بھی کسی رسالے میں نظر نہیں آیا۔ اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک نئے شاعر نے ایک پرانے شاعر کے سفارشی خط کے ساتھ اپنی غزل شاہد احمد دہلوی مرحوم کو رسالہ ''ساقی'' میں اشاعت کے لیے بھیجی۔ شاہد صاحب نے اس کے جواب میں شاعر کو لکھا۔ آپ کی غزل تو اچھی ہے لیکن جس صاحب سے آپ نے سفارشی خط لکھوایا ہے ان کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں ہے۔ لہٰذا غزل واپس بھیج رہا ہوں''۔ (۲۰)

مشفق خواجہ کے کالم بظاہر تو طنز و مزاحیہ تحریریں ہوتی ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ ہمارے عہد کے ادب اور ادبی کلچر کے زوال کے دستاویز ہیں اور اس میں شامل تحریریں ہمیں اپنے ادبی معاشرے کے موسم، مزاج اور درجہ حرارت میں اتار چڑھاؤ کی خبر بھی دیتی ہیں۔

مشفق خواجہ کے فقروں میں ہمیشہ وہ ارتکاز، بلاغت اور اایجاز پایا جاتا ہے۔ جس کا تصور زبان و بیان

کے اسالیب پر گرفت کیے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ میرا خیال ہے کہ ان تحریروں سے کسی بھی پڑھنے والے کی شخصیت اگر اپنی انا کی قتیل اور اپنی صحبت میں بہت زیادہ خراب نہیں ہوئی تو وہ اپنے بارے میں بھی خامہ بگوش کے فقروں کی داد ضرور دے گا۔ چاہے تو وار کتنا ہی کاری کیوں نہ ہو۔ ان تحریروں کے مزاح میں برہمی سے زیادہ جلال کا، مزاح سے زیادہ سنجیدگی اور تضحیک سے زیادہ تربیت اور تنبیہ کا پہلو نمایاں ہے۔ ایک اور پہلو جو اس کتاب کے مطالعے کے بعد ایک مجموعی تاثر کے طور پر رونما ہوتا ہے۔ وہ خامہ بگوش کی مشرقیت کا ہے اپنی روایات سے شغف ہی نہیں ان کی آگہی اور رمز شناسی کی جو کیفیت ان کالموں میں ملتی ہے۔ وہ معاصر تنقید کی مغرب زدگی کا ایک جواب بھی فراہم کرتی ہے۔ خامہ بگوش اپنی روایات کے علاوہ اپنی ادبی اور تہذیبی تاریخ سے اس حد تک باخبر ہیں کہ اپنے ہر بیان کی دلیل اِدھر اُدھر بھٹکے بغیر مہیا کر سکتے ہیں۔ یہ تحریریں طنز و مزاح کے طوفانی لمحوں میں بھی متین اور سنجیدہ دکھائی دیتی ہیں۔ یہی پہلو بظاہر وقتی موضوعات پر لکھی جانے والی ان تحریروں کی ایک مستقل حیثیت دیتا ہے (۲۱)

ان کالموں میں جابجا خامہ بگوش کا ادبی نظریہ بھی ملتا ہے۔ خامہ بگوش کے نزدیک ادب ایک اعلیٰ وارفع اقدار میں شامل ہے۔ اس کے تمام تر مقاصد شعور ادراک سے پھوٹتے ہیں۔ ادب کا اولین تقاضا و مطالبہ یہی ہے کہ جذبے و فکر کی سچائی اور ندرت چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسا فن لطیف ہے جس کے لیے مسلسل غور و فکر اور ریاضت سائنس کی طرح ضروری ہے۔ خامہ بگوش ادبی دیانت داری کا طلبگار اور متمنی ہے۔ جہاں اسے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر ادیب نے محنت کی بجائے ڈنڈی ماری ہے، وہ فوراً اپنے شگفتہ طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب میں اس کوتاہی پر گرفت کر لیتے ہیں۔ ''طبع آزمائی یا طالع آزمائی'' بھی ایسا ہی کالم ہے، جس کے آغاز میں انھوں نے بڑے ہلکے پھلکے اندازِ تحریر میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں ادب میں بے جا مبالغہ آرائی پر تنقید کی ہے۔ یہاں انھوں نے عمومی تبصرے کی صورت میں ایسے ادبی نظریے اور مثالی تحریروں پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

''لوگ آپ بیتی کیوں لکھتے ہیں؟ اس سلسلے میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ آپ بیتی ایک ایسا ذریعہ اظہار ہے جس میں جھوٹ

بولنے کی زیادہ سے زیادہ گنجائش پائی جاتی ہے اور یہ خوف بھی نہیں ہوتا کہ کوئی اس جھوٹ کو پکڑے گا۔ اس لیے وہ لوگ آپ بیتی ضرور لکھتے ہیں جنھیں عملی زندگی میں سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنے کے موقع ذرا کم ملتے ہیں۔ ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ کیوں کہ آپ بیتی ہی واحد ذریعہ اظہار نہیں ہے جس میں جھوٹ بولنے کی خواہشیں پوری کی جاسکے۔ یہ کام اور بھی کئی طریقوں سے انجام دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً تنقید لکھی جاسکتی ہے کہ اس میں جھوٹ تو کیا، اپنے ضمیر کے خلاف لکھنے میں بھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ شاعری کی جاسکتی ہے جس میں خیالی محبوب سے ایسے فرضی اسلوب کیے جاتے ہیں۔ جو اگر کسی اصلی فرد سے منسوب کیے جائیں تو وہ مارے شرم کے خودکشی کرے اور شاعر اہانت جرم کے الزام میں قانون کی زد میں آجائے''۔(۲۲)

اسی کالم میں آگے جاکر انھوں نے دکھاوے کے انکسار میں اپنی ذات کی نمائش کرنے والے خود پسند شاعروں ادیبوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ خامہ بگوش ایسے اہل قلم کو اپنے قلم کی زد پر رکھتے ہیں جنھوں نے ادب اور کتاب کو سیڑھی بنا کر مالی منفعت اور شہرت حاصل کی۔ خاص طور پر وہ لوگ جو آپ بیتیوں میں اپنے منہ میاں مٹھو بن جاتے ہیں اور خود کو ایک صاحبِ کلام اور عظیم ادیب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ بطور مثال یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

''ہمیں آپ بیتیوں سے بے حد دلچسپی ہے۔ جونہی اس نوعیت کی کوئی کتاب چھپتی ہے ہم اسے پڑھ ڈالتے ہیں۔ اس طرح جہاں ہمیں ایک طرف یہ معلوم ہوتا رہتا ہے۔ کہ آپ بیتیاں لکھنے والوں نے اپنی زندگیاں کس طرح اعلیٰ مقاصد کی خاطر صرف کیں۔ وہیں دوسری طرف ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کی آپ بیتیاں پڑھ پڑھ کر اپنی زندگی کس طرح ضائع کر رہے ہیں۔ یہ احساس پچھلے کچھ دنوں سے زیادہ ہی ہوگیا ہے۔ کیونکہ اس دوران میں پے

درپے کئی آپ بیتیاں ہماری نظر سے گزری ہیں''۔(۲۳)

اس سلسلے میں ایک اور مثال دیکھیے۔

''پچھلے دنوں کرکٹ کے نامور کھلاڑی جاوید میاں داد نے غصے میں آکر کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا تو اس پر ایک ادب دوست نے ہم سے پوچھا، اس قسم کا غصہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں میں کیوں نہیں آتا۔ ہم نے عرض کیا، ہمارے ادیب اور شاعر اپنا سارا غصہ ادب پر ہی نکال لیتے ہیں۔ اور خود اس سے محفوظ رہتے ہیں۔ وہ کہنے لگے۔ صورت حال نہایت تشویش ناک ہے، ادیبوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن معیاری ادبی تخلیقات کا قحط ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ جو ادیب غیر معیاری تحریروں کے انبار لگا رہے ہیں۔ وہ ادب سے تائب ہو کر کوئی آبرومندانہ پیشہ اختیار کریں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جس طرح سرکاری ملازموں کو ناکارکردگی کی بنا پر جبری طور پر ریٹائر کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ادب میں بھی جبری ریٹائرمنٹ کا سلسلہ شروع کر دیا جائے''۔(۲۴)

''محاسبہ'' خامہ بگوش کے کالموں کا قابل تعریف وصف ہے ہندوستان ایک اہم نقاد اور ادیب محمود ہاشمی کے ان کالموں کو سراہتے ہوئے لکھا ہے۔

''خامہ بگوش نے اپنے ادبی کالموں کے ذریعے اصناف ادب میں محاسباتی تبصروں کی ایک نئی صنف کو فروغ دیا ہے۔۔۔۔ خامہ بگوش کے کالم برصغیر میں بے حد مقبول ہیں''۔(۲۵)

مشفق خواجہ کے کالموں کا اُسلوبیاتی مطالعہ:

مشفق خواجہ کے اُسلوب پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس سوال کی وضاحت کی جائے کہ اسلوب کیا ہے؟ اسلوب کی سیدھی سادی تعریف تو یہی کی جا سکتی ہے کہ یہ خیالات واحسات کے اظہار کا دل نشین

اور منفرد طرز بیان ہوتا ہے۔ ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' کے مطابق:

''اُسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ، ادائے مطلب یا خیالات وجذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے۔ جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت (انفرادی خصوصیات) کے شمول سے وجود میں آتا ہے اور چونکہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتادِطبع، فلسفۂ حیات اور طرزِ فکر واحساس جیسے عوامل مل جل کر حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے''۔(۲۶)

مشفق خواجہ کا اُسلوب درج بالا تعریف پر پورا پورا اُترتا ہے۔ ان کی کالم نگاری کا اُسلوب اُردو کالم کی اُسلوبیاتی روایت میں ایک منفرد آواز ہے۔ جس کی تشکیل میں مصنف کی علمیت، مزاج، تجربے، مشاہدے اور فلسفۂ حیات کی جھلک ملتی ہے۔ طنز ومزاح کا یہ اُسلوب اُردو میں پہلی بار سامنے آیا۔

مشفق خواجہ کا اُسلوب طنز ومزاح کی شگفتہ کیفیات سے تشکیل پاتا ہے۔ خامہ بگوش کے ادبی موضوعات پر ایک نظر ڈالی جائے تو ان کے اُسلوب کی اس ادا کا اعتراف کرنا ہوگا کہ انھوں نے لفظوں کے معاملہ فہمی، ذو معنویت، مزاحیہ کردار، صورت واقعہ، افسانویت، تحریف نگاری، موازنہ، لفظی بازیگری اور ظرافت کے حربے بڑی روانی سے استعمال کیے ہیں۔ اِن کے اُسلوب کے بارے میں مظفر علی سیّد رقم طراز ہیں:

''طنز ومزاح کے مخصوص اسلوب میں لکھے گئے یہ ادبی کالم اپنی گہری علمی بصیرت اور نکتہ سنجی کے باعث قریب ودور کی پوری اُردو دنیا میں موضوع گفتگو رہے ہیں''۔(۲۷)

خامہ بگوش کے خالق مشفق خواجہ ایک صاحب مطالعہ، قلم کار تھے۔ وہ ایک نامور محقق رہے اور انھوں نے تحقیق کے آئینے میں قدیم کلاسیکی ادب کا بغور مطالعہ کیا۔ اس کے ساتھ جدید ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

ایک بالغ نظر شاعر و ادیب کی حیثیت سے وہ کارِ ادب کے سچے شناور تھے۔ ان کو ادب کے اسلوبیاتی صفات کا علم وشعور تھا۔ ایک خوب صورت لہجے کے شاعر کی حیثیت سے بھی ان کے اسلوب اور تحریروں میں ایک خاص نوع کی شعریت اور لفظیات کی وضاحت ملتی ہے۔ ان کے اسلوب کی تشکیل میں ان کے ذوقِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق اور شاعرانہ تخیل کا بہت اثر ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

''مشفق خواجہ اُردو کے وہ واحد مزاح نگار ہیں۔ جنھوں نے ادب، ادیب اور ادبی معاشرے کی ناہمواریوں کو طنز ومزاح کے ایک مشکل موضوع کی حیثیت دی ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں وہ طنزِ لطیف پیدا ہوئی جو کبھی نوک خار بن جاتی ہے۔ کبھی پھولوں کی چھڑی بن کر ہلکی سرسراہٹ پیدا کر دیتی ہے''۔ (۲۸)

ادب میں مزاح کی کیفیت کو اجاگر کرنے کے لیے ایک مزاح نگار مزاحیہ کردار کا سہارا بھی لیتا ہے۔ یہ مزاح کا ایک تخلیقی حربہ ہے۔ اور مزاح کی روایت میں قریب قریب ہر مزاح نگار نے مزاحیہ کردار کے ذریعے مضحک صورت حال پیدا کر کے اپنے قارئین کے لیے شگفتگی اور تبسم پیدا کی ہے۔ رتن ناتھ سرشار کا کردار ''خوجی''، پطرس بخاری کا ''مرزا''، امتیاز علی تاج کا ''چچا چھکن''، خالد اختر کا ''چچا عبدالباقی'' اور مشتاق یوسفی کا ''مرزا عبدالودود بیگ'' اس حربے کی مقبول مثالیں ہیں۔

خامہ بگوش بھی تخلیقی ادراک کے ذریعے لاغر مرادآبادی کا سہارا لیتے ہیں۔ بقول شمیم حنفی:

''(یہ کردار) خامہ بگوش کو درپیش بعض کٹھن گھڑیوں میں اچانک ایک غیبی سائے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور وہ جو کچھ کہہ جاتا ہے۔ ایک ناقابل تردید سادہ لوحی کے ساتھ، جسے کہنے کے لیے خامہ بگوش کو ہزار بہانے درکار ہوتے ہیں''۔ (۲۹)

مشفق خواجہ کے کالموں میں مزاح کے حربوں کا استعمال:

ادبی کالم میں واقعاتی مزاح کی گنجائش کم رہتی ہے اس لیے لاغر مرادآبادی کے مکالمے اتنے شگفتہ ہوتے

ہیں کہ اس کمی کو بطریق احسن پورا کردیتے ہیں۔ یہ کردار اُردو مزاح کے کرداروں سے اس لیے بھی انفرادیت کا حامل ہے کہ یہ اپنی ذاتی خصوصیات اور ادبی کردار کی وجہ سے شاعروں اور ادیبوں میں بہت مقبول ہے۔ دیگر کردار تو حماقت کی تصویر ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ایک خاص نوع کے مزاح کو جنم دیتے ہیں۔ جبکہ یہ کردار ماحول کو دلچسپ اور خوشگوار بنانے کے ساتھ ساتھ ذہانت کا مظہر بھی ہے۔ یہ زندگی سے بھرپور کردار ہے اور یہ واقعے میں مرکزی کردار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وہ ایک طنز کے ماہر کی طرح ادبی معاشرے کے تضادات، ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں پر ایک سخت نکتہ چین کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

لاغر مراد آبادی کا کردار بعض مقامات پر پورے کالم پر یوں چھا جاتا ہے کہ کالم نگار کی اپنی شخصیت پس پردہ رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے قارئین کو ہنساتا بھی ہے، اور سوچنے پر مجبور بھی کرتا ہے۔ یہ ایسا حاضر جواب کردار ہے۔ جس میں ایک طرح کی دلفریبی، بے ساختگی اور شگفتگی کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ انھی خصوصیات کی بنا پر قاری اس سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اس کردار میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اسی لیے وہ برجستہ جملوں سے قاری کو ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ذیل میں اس کی مثالیں ملاحظہ کیجیے:

(۱) ''افتخار عارف نے اپنے فضائل ومناقب بیان کرتے ہوئے بہت سی دلچسپ باتیں بتائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ جب وہ ۲۸ برس کے تھے تو ٹی وی میں وہ آٹھویں گریڈ میں ملازم تھے۔ جب مینیجنگ ڈائریکٹر ان سے صرف دو گریڈ آگے تھے۔ یہ پڑھ کر استاد لاغر مراد آبادی نے فرمایا۔ یہ کون سی کمال کی بات ہے۔ ٹی وی کی موجود مینیجنگ ڈائریکٹر تو صرف اٹھارہ برس کی عمر میں سب سے بڑے عہدے پر پہنچ چکی ہے۔ ہم نے استاد سے پوچھا، آپ کو ان محترمہ کی عمر کیسے معلوم ہوئی؟ فرمایا اُنھوں نے ٹی وی کو جس طرح بازیچہ اطفال بنا رکھا ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان کا گریڈ عہدے کے اعتبار سے تو بڑا ہے مگر عمر کے اعتبار سے بہت چھوٹا ہے۔ اُستاد گرامی نے یہ بھی فرمایا، افتخار عارف

کو کم عمر ہی میں اپنی کامیابیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کیٹس نے صرف ۲۶ برس کی عمر پائی لیکن ادب میں عمر جاوداں حاصل کر گیا۔ افتخار عارف جس عمر میں ٹی وی میں آٹھویں گریڈ میں تھے۔ اس عمر میں سکندر اعظم آدھی دنیا فتح کر چکا تھا''۔(۳۰)

(۲) ''اُستاد لاغر مراد آبادی پھڑک اُٹھے کہنے لگے۔ ''سہل ممتنع کی ایسی مثال نظر سے کم گزری ہے'' ہم نے پوچھا " سہل ممتنع کسے کہتے ہیں''؟ تو فرمایا ''وہ ویسے تو اس شعر کو کہتے ہیں جس کی نثر نہ ہو سکے۔ لیکن آپ نے جو شعر سنایا ہے اس کے پیش نظر اب سہل ممتنع کی تعریف یہ ہوگی۔ ایسی نثر جسے شعر کے سانچے میں نہ ڈھالا جاسکے''۔(۳۱)

(۳) ''انیس ناگی کا خیال ہے کہ غالب کے اپنی بیوی سے تعلقات ناخوشگوار تھے۔ دلیل یہ دی کہ دن بھر تو غالب قلعۂ معلّٰی میں رہتے تھے اور شام کو شراب پیتے اور دوستوں سے گپ بازی کرتے تھے۔ اُستاد لاغر دمراد آبادی نے یہ سن کر فرمایا۔ یہ عجیب وغریب منطق ہے۔ آج کل کے اکثر ادیب صبح سے شام تک دفتروں میں رہتے ہیں اور پھر رات کے ایک بجے تک پاک ٹی ہاؤس قسم کے ہوٹلوں میں بیٹھتے ہیں۔ کیا ان سب کے بارے میں بھی یہ کہا جائے گا کہ ان کی ازدواجی زندگی ناخوشگوار ہے؟ استاد گرامی کے اس سوال کا جواب انیس ناگی ہی دے سکتے ہیں۔ دو بڑوں کے درمیان بحث میں دخل دینے کی ہم جسارت نہیں کر سکتے''۔(۳۲)

(۴) ''(سحر انصاری) نوجوانوں ہی میں نہیں، بزرگوں میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ استاد لاغر مراد آبادی نے وصیت کر رکھی ہے

کہ ان کی نماز جنازہ سحر انصاری سے پڑھوائی جائے۔ ہم نے اس کا سبب پوچھا تو اُستاد نے فرمایا، میں اپنی کسی کتاب کی رونمائی کا اور اپنے ساتھ شام منانے کا قائل نہیں ہوں۔ شام غریباں کو تو آنا ہی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ شام سحر انصاری کی امامت میں منائی جائے۔ ہم نے عرض کیا، انصاری صاحب صرف زندہ ادیبوں کی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔ فرمایا، پھر تو انھیں میری تقریب میں ضرور آنا چاہیے کیوں کہ مرنے کے بعد میرا شمار بھی زندہ جاوید ادیبوں میں ہوگا''۔ (۴۳)

(۵) ''اس کتاب (گفتگو) کے سرورق پر جلی حروف میں یہ عبارت درج ہے ''ترقی پسند تحریک کے نظری مسائل، اثرات اور مخالفین کے اعتراضات پر مشاہرِین ادب سے بات چیت'' لفظ ''مشاہرین'' کا استعمال قابل غور ہے۔ ہم سے یہ معما حل نہ ہوا تو اُستاد لاغر مراد آبادی کو زحمت فکر دی گئی۔ انھوں نے فرمایا ''مشاہرین سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جو مشاہرہ لے کر۔۔۔۔۔ ہم نے اُستاد کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا کہ ''مشاہرین'' کا ''مشاہرے'' سے رشتہ جوڑنا دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ ہم نے عرض کیا اور اس میں کچھ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ اُستاد نے فرمایا، ہاں اس کا بھی امکان ہے آخر خود ترقی پسند تحریک بھی تو ہماری تاریخ ادب میں کتابت کی ایک غلطی ہی تو ہے''۔ (۴۴)

خامہ بگوش، اُستاد لاغر مراد آبادی کا ذکر ہر کالم میں نہیں کرتے۔ ان کا یہ مزاحیہ کردار کبھی کبھی کالموں میں اپنی جھلک دکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے کالم کو یکسانیت کے عیب سے بچانا چاہتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اُستاد کا کردار کالم میں فطری بہاؤ کے ساتھ آئے تاکہ کسی طرح کی مصنوعیت اور شعوری کوشش محسوس نہ ہو۔ اسی لیے اُستاد کا کردار اُردو کے مقبول ترین مزاحیہ کرداروں کی صف میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور یہی

خامہ بگوش کے دستِ ہنر کی کامرانی و کامیابی ہے۔

مشفق خواجہ کے اسلوب میں ایک فطری سادگی نمایاں ہے۔ وہ مزاح کے جتنے بھی حربے استعمال کرتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کی بناوٹ اور تصنع کا احساس نہیں ملتا۔ جس کی اہم مثال ان کے ہاں لفظی بازیگری کی صورت میں ملتی ہے۔ ظرافت کے نمایاں حربوں میں لفظی بازیگری اہمیت کا حامل حربہ ہے۔ اس کی مقبول قسم رعایت لفظی اور ذو معنویت ہے۔ خامہ بگوش کے کالموں میں مزاح کے ان حربوں کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ان کے قلم کی خوب صورتی ہے کہ وہ لفظوں کو اس مہارت اور شگفتگی سے استعمال کرتے ہیں کہ اس میں ذو معنویت اور ایہام پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ لفظوں کے معنوی اور صوری ہر دو حوالوں سے استعمال کر کے قاری کے لیے سامان تفریح پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ پر ان کی گرفت مثالی ہے۔ وہ لفظوں کے استعمال میں کسی فضول خرچی کا مظاہر نہیں کرتے۔ کفایت لفظی تحریر کا حسن ہے۔ خامہ بگوش کے کالم میں حسن کی یہ فراوانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس سلسلے میں خامہ بگوش کی چند مثالیں:

(۱) ''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کتاب کا نام ''دامن یوسف'' کی بجائے ''دامن تار تار'' ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے ہر صفحے پر ''دستِ زلیخا'' کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اس کتاب میں پاکئ داماں کی حکایت بیان کی گئی ہے۔ اس لیے وہی نام درست ہے جس نام سے یہ کتاب چھپی ہے۔ ویسے بھی نام میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز تو فریقین کا طریقۂ واردات ہے اور پڑھنے والوں کو اسی سے سروکار رکھنا چاہیے''۔ (۳۵)

(۲) ''ڈاکٹر نارنگ ''لَسانیات'' کے نہیں ''لِسانیات'' کے بھی ماہر ہیں''۔ (۳۶)

(۳) ''ایک زمانہ تھا۔ کہ اُردو کے شاعروں کو اپنا کلام جلد از جلد چھپوانے کا شوق ہوتا تھا۔ تا کہ آپ بھی شرمسار ہو سکیں اور پڑھنے والے کو بھی''۔ (۳۷)

(۴) ''ان (عبارت بریلوی) کی جوانی کی تحریریں تو ایسی ہیں کہ ان میں نہ صرف وہ خود بوڑھے نظر آتے ہیں۔ بلکہ ان کے پڑھنے والے بھی کولت

وکسالت کا شکار ہو جاتے ہیں''۔(۳۸)

(۵) ''لاہور کے ادیبوں میں لاکھ برائیاں سہی، لیکن ہمیں تو ان کی یہ بات پسند آئی ہے کہ وہ اپنے کسی دوست کی برائی اس کی موجودگی میں نہیں کرتے۔آدمی میں اتنا اخلاق تو ہونا چاہیے کہ کسی کے مُنہ پر اس کی برائی نہ کرے''۔(۳۹)

خامہ بگوش کے مضامین میں لفظ ایک رواں دواں کیفیات میں آتے ہیں۔ان میں کوئی الجھاؤ نہیں ہوتا۔لفظ شناسی کا یہی قرینہ ہے کہ ان کے لفظ لفظ میں شگفتگی اور خیال آفرینی کا دست ہنر محسوس ہوتا ہے۔وہ لفظوں سے ایہام اور ذومعنویت پیدا کرنے کے ایک قادر الکلام ظرافت نگار ہیں۔لفظوں کے شگفتہ استعمال کا یہ تخلیقی عمل شعوری کوشش، تصنع اور ہر طرح کی بناوٹ سے پاک ہوتا ہے۔

دراصل لفظ کی اپنی نفسیات اور کیفیات ہوتی ہیں۔تخلیقی جوہر اور لفظ شناسی کی صلاحیت سے جملے میں لفظ کو کما حقہ برتنے کا سلیقہ ہی دست ہنر کا امتحان ہے۔خامہ بگوش اس امتحان میں پورے پُورے اترتے ہیں۔وہ نثر میں لکھتے ہیں لیکن لفظ کے صوتی ومعنوی آہنگ سے اس میں غنائیت وموسیقیت کی شان پیدا کر دیتے ہیں۔جس میں شگفتگی کی ایک لہر رواں دواں ہوتی ہے۔انھیں لفظوں کی املاء سے بھی مزاح تخلیق کرنے کا ہنر آتا ہے۔

کفایتِ لفظی کے حسن نے بھی ان کے اُسلوبِ تحریر کو قاری کے لیے جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔ان کی تحریروں میں اختصار کے وصف میں بھی جامعیت وفصاحت کی دلکشی جھلکتی ہے۔کفایت لفظی ذکاوت کی روح ہے اور ذکاوت کی یہی روح خامہ بگوش کی تحریروں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔بقول محبوب الرحمٰن فاروقی:

''(خامہ بگوش) ایک ایک لفظ بہت سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔اور جن کے جملوں سے کبھی کوئی ایک لفظ حذف کر دینا یا بدل دینا ممکن نہیں''۔(۴۰)

خامہ بگوش لفظ کے صوتی ومعنوی اہمیت اور اسلوبیاتی کردار کے قائل ہیں۔انھیں لفظوں کی قوت، حرکت اور اس کے داخلی وخارجی اسرار کا ادراک ہے۔ایک کالم میں لکھتے ہیں۔

''لفظ بھی انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ جیتے ہیں اور مرجاتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح انھیں بھی عزت ملتی ہے اور ذلت بھی۔ کبھی معمولی حیثیت سے ترقی کر کے بلند مدارج تک پہنچ جاتے ہیں اور کبھی بلند مدارج سے گر کر معمولی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں''۔ (۴۱)

وحید الرحمٰن لکھتے ہیں:

''خامہ بگوش لفظ سے لفظ جوڑ کر ایسے جملے تخلیق کرتے ہیں۔ جن میں لفظوں کا انفرادی رنگ بھی برقرار رہتا ہے اور اجتماعی بھی لفظوں کو تخلیقی آہنگ میں ایسے استعمال کرنا کہ اس سے ایک شگفتہ اُسلوب وصورتحال تخلیق ہو۔ کہنہ مشق، صاحب اُسلوب مزاح نگار ہی اسلوب نقطائی اس کرشمہ سازی سے واقف ہوتے ہیں، اور ان میں ایک اہم مثال خامہ بگوش کی ہے''۔ (۴۲)

دو اشیاء کے مابین تقابلی مطالعہ کا ہنر مشفق خواجہ کے عرفانِ فن کی ایک صورت ہے۔ وہ ہنسی کے تحریک کے لیے اس حربے کے توسط سے وتقابلی صورت سے تضاد اور مشابہت کی مضحکہ خیز کیفیات پیدا کرتے ہیں۔ اس ہلکی پھلکی استدالائی کیفیت سے قاری سوچ سوچ کر ہنستا ہے۔ اور ہنس ہنس کر سوچتا ہے۔ اُسلوب کا یہ ہنر قاری کو دعوتِ تبسم بھی دیتا ہے اور دعوتِ فکر بھی۔ ان کے ہاں ہنر کی وضاحت اس مثال سے بھی ہوتی ہے:

''ایک زمانہ تھا کہ جب کسی شاعر کے اوصاف بیان کیے جاتے تھے۔ تو سب سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ اس کا مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اب معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر کسی شاعر کا مجموعہ شائع نہ ہوا ہو تو اسے شاعر کی خوبی سمجھا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پہلے زمانے میں شاعر کے مجموعے سے اس کے کلام کی خوبیوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ اب خامیاں سامنے آجاتی ہیں''۔ (۴۳)

اس پیرائے سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ماضی کی مثبت اقدار کی شکست وریخت اور نئے دور کی کھوکھلی ادبی سرگرمیوں کے موازنے سے ایک دلچسپ صورتحال پیدا کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں مزید مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

''بے حد حیرت ہے کہ وہ کم عمری ہی میں ساٹھ برس کے ہو گئے ہیں۔ ان کی تحریروں کی بنا پر ہمارا خیال تھا۔ کہ وہ نوجوان ہوں گے افسوس کہ ہمارے ذہن میں انور سدید نام کا جو، جوان رعنا تھا وہ چشم زدن میں پیر فرتوت بن گیا''۔(۴۴)

ڈاکٹر ظفر عالم ظفری نے موازے کی چابک دستیوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ تجزیہ پیش کیا ہے۔

''یہ موازنہ کبھی نہاں اور عیاں کا ہوتا ہے۔ کبھی حاضر اور غائب کا موازنہ طنز کا باعث بنتا ہے۔ اور کہیں داخلی اور خارجی کیفیت ۔۔۔ غرض ٹکراؤ اور تصادم کے ذریعے وہ طنزیہ و مزاحیہ کیفیت پیدا کرتے ہیں''۔(۴۵)

فن مزاح نگاری باریک بینی اور تکنیک پر استوار ہوتا ہے۔ خامہ بگوش کماحقہ فن کی باریکیوں کا شعور رکھتے ہیں اور جا بجا اس کا استعمال کرتے ہیں۔ ان ہی حربوں میں ایک اہم حربہ صورت واقعہ (Humorous Situation) بھی ہے۔ اس حربے کے استعمال کے لیے لازم ہے کہ مضحک حالات و واقعات ایک روانی کے ساتھ یوں بیان کیے جائیں کہ وہ غیر متوقع صورتحال یا ناہمواری کو پیدا کریں۔ یہ مضحک واقعہ کسی کردار کی ظریفانہ حرکتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''صورت واقعہ کی تعمیر میں ایک اچھا مزاح نگار غلطی، غلط فہمی اور اتفاق وقت (Coincidence) کو عام طور سے بروئے کار لاتا ہے''۔(۴۶)

مشفق خواجہ صورت واقعہ کے ان فنی لوازمات سے خوب خوب کام لیتے ہیں۔ ان کے فن کا یہی کرشمہ ہے کہ تحریر میں شوخی و ظرافت کی شگفتہ کیفیات تخلیق ہو جاتی ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے پر تبسم واقعات سے ہنسی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ وہ تحریر میں محل وقوع کے اعتبار سے طبع زاد واقعات بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنا خامہ بگوش کا غالب رجحان ہے یہ واقعات حال سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور ماضی سے بھی۔ مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

''صغیر بلگرامی کا قصہ یہ ہے کہ جب خواجہ سخن دہلوی (صاحب سروش سخن) ان کی شاگردی سے منحرف ہو گئے تھے تو صغیر بلگرامی اِن کا ذکر اس طرح کیا کرتے

تھے۔ ''جب تک خواجہ سخن مجھ سے اصلاح لیتے رہے۔ اچھا شعر کہتے تھے۔ اب تو وہ شعر نہیں کہتے، گھاس کاٹتے ہیں''۔ (۴۷)

☆ ''جس زمانے میں وہ (نظم طبا طبائی) کلکتے میں تھے۔ وہاں کے ایک انگریز صاحب بہادر نے کچھ شاعروں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ آپ لوگ اُردو کی ایک ایسی گرامر لکھ دیں۔ جو عام لوگوں کے کام آسکے۔ ان شاعروں نے آپس میں مشورہ کر کے صاحب بہادر کو جواب دیا۔ ہم یہ کام نہایت خوش دلی سے کر دیں گے۔ بشرطیکہ گرامر کی کتاب منظوم ہو۔ صاحب بہادر کو اس جواب پر بڑی حیرت ہوئی۔ اُنھوں نے پوچھا، کتاب نثر میں کیوں نہ ہو؟ جواب ملا نظم لکھنا ہمارے لیے آسان ہے زندگی بھر اس کی مشق کی ہے۔ نثر لکھنا ایک بالکل مختلف کام ہے جو ہم لوگوں کے بس کا نہیں''۔ (۴۸)

بالعموم مضحک واقعات وہ اپنے مزاحیہ کردار لاغر مراد آبادی کی حرکات وسکنات سے پیدا کرتے ہیں۔ لاغر مراد کو آبادی کے شوخی سے بھرپور مکالمے سونے پر سہاگہ کا کام دیتے ہیں۔ یہ شگفتہ واقعات کالم کی ضرورت اور تقاضے کی تکمیل میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور کالم کے بعد کے منظر نامے کی فضا کو دلچسپ بناتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ طبع زاد اور خود ساختہ مضحک واقعات سے بھی کالم کو سنوارتے ہیں۔ ان کالموں میں لطیفہ گوئی سے بھی طنز و مزاح سنوارتے ہیں۔ لیکن یہ اہتمام اتنا خاص ہوتا ہے کہ اس میں کوئی گھسے پٹے لطیفے استعمال نہیں ہوتے۔ بلکہ نئے تازہ اور ادبی لطائف سے وہ شگفتگی کا عنصر پیدا کرتے ہیں۔ وہ لطیفہ گو سے زیادہ لطیفہ ساز ہیں۔ لطیفے واقعت کی لطیف ترین صورت ہوتی ہے۔ خامہ بگوش ان کو بروقت اور برعمل استعمال کرنے پر قادر ہیں۔

مشفق خواجہ کو اُردو ادبی لطائف از بر ہیں اور وہ عین کالم کے مزاح اور تقاضے کے مطابق لطائف کا جوڑ لگاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک انٹرویو میں جب پروین شاکر، عطاء الحق قاسمی کے سوال کے جواب میں یہ کہتی ہیں کہ انھوں نے اپنے شعری مجموعے، ''خوشبو'' میں سارا کلام شامل نہیں کیا، بلکہ بہت سی تخلیقات مسترد بھی کی ہیں۔ خامہ بگوش نے یہاں پر شوخی سے کام لیتے ہوئے یہ لطیفہ درج ہے:

''ایک شاعر نے اپنا مجموعۂ کلام ایک نقاد کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا

میں نے اپنا آدھا کلام رَدّ کر دیا ہے اور آدھا اس مجموعے میں شامل کیا ہے۔ نقاد نے مجموعے کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ یہ آپ نے اچھا کیا۔ پڑھنے والوں کو اس سے بڑی سہولت ہوگی کہ انھیں بھی آپ کا آدھا کلام ہی رَدّ کرنا پڑے گا''۔(۴۹)

مشفق خواجہ کے کالموں میں ایک نوع کی افسانویت کی فضا چھائی رہتی ہے۔ اس پس منظر میں وہ موضوع کے خدوخال کو نمایاں کرتے ہیں۔ لیکن یہ افسانویت، شگفتگی کے تاثر میں یوں لپٹی ہوتی ہے۔ کہ قاری کے ذوق سلیم کو تسکین ملتی ہے۔ تجسس اور کرداروں کے سہارے وہ ایک دلچسپ مکالمے کا اہتمام کرتے ہیں اور یوں طنز ومزاح مکالموں کے ذریعے قاری کے ذہن تک پہنچ جاتا ہے۔ بطور مثال یہ ٹکڑا دیکھیے:

''ریڈیو پاکستان میں کیسے کیسے لوگ ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک اسٹیشن ڈائریکٹر کھانے پینے کے اتنے شوقین تھے کہ وہ بیشتر وقت کھانے میں، اور موقع مل جائے تو پینے میں صرف کرتے تھے۔ عملے کے میٹنگ کے دوران سکھوں کے لطیفے سنایا کرتے تھے اور جو وقت بچ جاتا تھا۔ اس میں دوسروں کی برائیاں کرتے تھے۔ ایک افسر نے بڑی مزاحیہ طبیعت پائی تھی لیکن ان کے مزاح کا معیار بقول مصنف یہ تھا۔ ایک مرتبہ ایک ڈراما آرٹسٹ ان کے کمرے میں بیٹھی تھی، میں بھی اتفاق سے وہاں کسی کام سے گیا۔ میرے سامنے ہی انھوں نے اپنے موزے اتارے اور اس کی ناک کے سامنے لے جا کر زور زور سے ہنسے، اور کہنے لگے۔ ''لو سونگھو''۔(۵۰)

چھوٹے چھوٹے فقروں کے ذریعے وہ واقعات کو افسانوی ترتیب سے آگے بڑھاتے ہیں اور آخر میں قاری بے پناہ خط کے ساتھ پرتبسّم کیفیات سے نہال ہو جاتا ہے۔

ناقدین نے خامہ بگوش کی بعض تحریروں میں انشائیے کے خدوخال بھی تلاش کیے ہیں۔ انشائیہ ذہن کی ایک آزادانہ رو یا لہر کے تخلیقی اظہار کا نام ہے۔ اس میں دلچسپ اور شگفتہ پیرائے میں بات سے بات نکالی جاتی ہے۔ خامہ بگوش کے ہاں انشائیہ کی خصوصیات کے حوالے سے وحید الرحمٰن خان اپنی کتاب ''خامہ بگوش ایک

مطالعہ‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’خامہ بگوش کی شگفتہ مزاجی بعض مقامات پر’’انشائیے‘‘ کی تخلیق کا موجب بنتی ہے۔انشائیے کی تعریف کے بارے میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔تاہم ایک بات طے ہے، کہ انشائیہ دراصل چراغ سے چراغ جلانے کا نام ہے۔یہ چراغ بھی لفظ کی صورت میں اور کبھی خیال کی شکل میں روشن ہوتے ہیں۔خامہ بگوش کے ہاں ٹکڑوں کی صورت میں متعدد انشائیے تلاش کیے جاسکتے ہیں‘‘۔(۵۱)

وحید الرحمٰن خان کی اس رائے میں اس لیے بھی وزن ہے کہ انشائیہ نگاری کی صنف اپنے لکھنے والے سے ایک خاص فلسفیانہ ذہن اور سوچ کا تقاضا کرتی ہے اور درحقیقت یہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے انشائیہ وجود میں آتا ہے۔انشائیے کے مزاج میں جو لطافت اور نزاکت ہے اس کو برقرار رکھنا ہر تخلیق کے لیے مشکل ہے۔چونکہ مزاح اور انشائیے کی سرحدیں کہیں کہیں آپس میں ملتی اور جدا ہوتی ہیں۔اور بعض ناقدین کے نزدیک انشائیے اور مزاحیہ مضمون میں باریک اور غیر محسوس فرق موجود ہوتا ہے۔جہاں پر طنز کی کاٹ در آتی ہے وہیں پر مضمون انشائیے کی کیفیت اور حدود سے نکل جاتا ہے۔

مشفق خواجہ چونکہ ایک صاحب اُسلوب اور کہنہ مشق مزاح نگار ہیں اس لیے یہ امر باعث حیرت نہیں ہے کہ اگر ان کے ہاں انشائیہ کے خدوخال سامنے ہوں۔اس رائے کو سمجھنے کے لیے بطور مثال خامہ بگوش کے قلم سے نکلے ہوئے انشائیے کا ٹکڑا ملاحظہ کیجیے۔

’’سمندر کو، کوزے میں بند کرنا اور کوزے کے پانی کو سمندر میں تبدیل کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔دائیں ہاتھ کا کھیل یہ ہے کہ وہ خالد کے خیالاتِ عالیہ کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے اور صفحہ قرطاس کا کمال یہ ہے کہ وہ اس سارے بوجھ کو بخوبی سہار لیتا ہے۔اس لیے تو خالد کی کتابوں میں مضبوط کاغذ استعمال کیا جاتا ہے۔یہ کاغذ وہی ہے جس سے پرانے زمانے میں کاغذی پیرہن تیار کیے جاتے تھے۔فریادی انھیں پہن کر فریاد کرتے تھے۔اب کاغذی پیرہن کا رواج نہیں رہا۔اس لیے کاغذ پر جو کچھ

لکھا جاتا ہے۔اسی کو پڑھ کر فریادی کی فریاد تیز ہو جاتی ہے''۔(۵۲)

فنِ مزاح کا ایک اہم تخلیقی وصف یہ بھی ہے کہ قاری کو زیادہ سے زیادہ حظ اور لطف پہنچانے کے لیے ضروری ہے، کہ چھوٹے چھوٹے لطائف چٹکلے تحریروں میں استعمال کیے جائیں۔ یہ لطائف اس کے ذہن کی پیداوار بھی ہو سکتے ہیں اور کسی دوسری زبان سے بھی اخذ شدہ ہو سکتے ہیں۔ یہاں یہ احتیاط ضروری ہے کہ یہ لطائف اور چٹکلے گھسے پٹے نہ ہوں کہ پڑھنے والوں کو پہلے ہی سے از بر ہوں۔ ورنہ مزاح عامیانہ پن کا شکار ہو کر اپنے مقاصد سے دور نکل جائے گا۔ اُردو مزاح میں فنکارانہ مہارت کی ایسی خوب صورت مثال شفیق الرحمٰن کے ہاں ملتی ہے۔ جنھوں نے انگریزی زبان کے پر تبسم لطائف کو کمال خوبی سے اُردو کا جامہ پہنایا۔فن کا یہ وصف خامہ بگوش کے ہاں بھی چابکدستی سے نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے تازہ اور طبع زاد لطائف کو برمحل استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ (ہندوستان کے دو اہم نقاد) کے مکالمے سے جو شگفتگی پیدا کی گئی ہے اس میں لطیفوں اور چٹکلوں کے استعمال کی چابکدستی کا اظہار ہوتا ہے۔

> ''جب آپ کی کوئی اچھی تحریر دیکھتا ہوں تو رشک آتا ہے کہ کاش یہ میں نے لکھی ہوتی۔ کبھی میری بھی کسی ٹوٹی پھوٹی تحریر کو دیکھ کر آپ کا بھی جی للچاتا ہوگا''۔(۵۳)

اس موقع پر خامہ بگوش نے جو لطیفہ تحریر کا حصہ بنایا ہے وہ ملاحظہ کیجیے:

> ''ایک مرتبہ حبیب جالب نے مرحوم ناصر کاظمی سے کہا۔''جب کبھی آپ کی کوئی غزل کسی رسالے میں دیکھتا ہوں دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ غزل میرے نام سے چھپتی'' ناصر کاظمی نے شکریہ ادا کیا۔ کچھ دیر بعد حبیب جالب نے پوچھا'' میرے غزل دیکھ کر آپ کا ردعمل کیا ہوتا ہے''؟ ناصر کاظمی نے کہا'' خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ غزل آپ ہی کے نام سے چھپی''۔(۵۴)

یہ لطیفہ کالم میں اتنی برجستگی اور روانی سے آیا ہے کہ اگر اسے کالم سے حذف کر دیا جائے تو کالم میں تشنگی کا احساس موجود رہتا ہے۔

مشفق خواجہ کی تخلیقی قوت میں لطیفہ سازی کا فطری وصف قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ ہے۔ یہی وہ

صلاحیت ہے جو ایک مزاح نگار کو عمومی سطح سے اوپر اٹھاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

''ان کا مزاحی عمل لطیفے کی تعمیر وتخلیق کے عمل سے زیادہ مشابہ ہے۔ وہ بات کو آہستہ آہستہ ایک مخصوص بلندی کی طرف لاتے اور جذباتی فضا پیدا کرتے ہیں اور بلندی سے جب اچانک گیند کو لڑھکا دیتے ہیں تو ان کی مطلوبہ مزاجی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے''۔(۵۵)

مشفق خواجہ اپنی تحریروں میں ایک مرقع نگار یا شخصیت نگار کے روپ میں بھی سامنے آتے ہیں۔ ان کے کئی کالموں میں شعرا و ادبا کی قلمی تصویریں بنانے کا تخلیقی عمل پایا جاتا ہے۔ وہ حلیہ نگاری اور جسم کے ڈیل ڈول سے لے کر باطن کے نہاں خانوں میں بھی جھانک لیتے ہیں۔ یوں خاکہ فہمی کی صلاحیت کو بروئے کار لا کر وہ اپنے کرداروں کی ایسی عکاسی کرتے ہیں کہ وہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے ایک کالم میں وہ مرزا ادیب کی شخصیت کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں۔

''ہم نے مرزا ادیب کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس لیے ہمارے ذہن میں ان کی بزرگی کی وجہ سے ان کا تصور کچھ اس قسم کا تھا کہ لوگ انھیں سہارا دے کر اٹھاتے اور بٹھاتے ہوں گے۔ اور ڈاکٹر تحسین فراقی جیسے نوجوان ان کے لیے ---پیری کا کام دیتے ہوں گے۔ لیکن جب انھیں دیکھا تو معاملہ برعکس تھا۔ وہ ماشاء اللہ جوانوں سے بڑھ کر جوان ہیں۔ چہرہ روشن، جسم پھرتیلا، چال کڑی کمان کا تیر، وہ ستر سے اُوپر کے بالکل نہیں لگتے اور اگر ہوں گے بھی تو بھی ان کا سال تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دنوں کا نہیں ہو سکتا اس سے کہیں کم ہوگا''۔(۵۶)

بعض مقامات پر وہ ایک ہی جملے میں اپنے کرداروں کے مجموعی تاثر کو بیان کر دیتے ہیں۔ ان میں کئی ایک جملے ایسے ہیں جو کئی پیراگرافوں پر بھاری ہیں۔ اسے اختصار میں جامعیت کا اعجاز کہتے ہیں۔ مثال کے لیے چند جملے ملاحظہ کیجیے:

''اشفاق احمد کا کمال یہ ہے کہ ان کی ایک ہتھیلی پر تصوف ہے اور دوسری پر دنیا۔

وہ یاد نہیں رکھتے کہ کس ہتھیلی پر کیا ہے؟ لہٰذا تصوف سے کاروبار دنیا کو، اور دنیاوی سوجھ بوجھ سے مسائل تصوف کو بڑی خوش اُسلوبی سے سلجھا لیتے ہیں''۔(۵۷)

''(سلطان جمیل نسیم) دیکھنے میں لڑکے ہی نظر آتے ہیں۔ اور لڑکے بھی ایسے جیسے ابھی ابھی میر تقی میر کی کلیات سے برآمد ہوئے ہوں''(۵۸)

''ہم کم از کم تین ایسے آدمیوں کو جانتے ہیں۔ جنھیں باقر مہدی نے ہمیشہ خوش رکھا ہے۔ ان میں سرفہرست تو باقر مہدی خود ہیں۔ حسن اتفاق سے باقی دو افراد کا نام بھی باقر مہدی ہی ہے''۔(۵۹)

- ان کالموں میں ادیبوں کے تذکرہ میں وہ ان کے کردار کو اس باریک بینی سے نمایاں کرتے ہیں کہ لگتا ہے کہ وہ نفسیات شناس ہیں۔ وہ مصنف کی شخصیت کے داخلی زاویوں تک اس کی تصنیف کے حوالے سے رسائی حاصل کرتے ہیں۔ بالالفاظ دیگر کتاب وہ آئینہ ہے جو مصنف کے خدوخال کا انعکاس مشفق خواجہ پر گرتا ہے۔ (۶۰)

مشفق خواجہ نے تحریف (Parody) کے حربے کو بھی بڑی ہنروری سے استعمال کیا ہے۔ یہ فنِ مزاح کا ایک نازک حربہ ہے اور اس کے ذریعے بڑی چابکدستی کے ساتھ تحریر میں لطف و تبسم کی کیفیات پیدا کی جاتی ہیں۔ تحریف کی اہمیت اور فنی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اُردو مزاح کی روایت کے جانے پہچانے اور بڑے مزاح نگاروں نے اس حربے کو برتا ہے۔ پطرس بخاری کے ''لاہور کا جغرافیہ، اور اِبنِ اِنشاء کی ''اُردو آخری کتاب'' اس سلسلے کی کامیاب مثالیں ہیں۔ تحریف کے اپنے قاعدے اور اُصول ہیں۔ اس میں بنیادی شرط یہ ہے کہ جس تحریر کی تحریف مقصود ہو، وہ قارئین کے حلقوں میں مقبول ہو، تاکہ پڑھنے والے اس اصل تحریر کی سنجیدگی اور مزاح کو ذہن میں رکھ کر تحریف کا لطف اٹھائیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پیروڈی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایک ایسی نقالی کا نام ہے جس سے اس تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے''۔(۶۱)

- خامہ بگوش کے ہاں تحریف نگاری کے کئی خوب صورت نمونے ملتے ہیں۔ ذیل میں اُنھوں نے مرزا غالب

کے ایک خط کی تحریف کی کو بڑی مہارت سے نبھایا ہے:

''سعادت و اقبال نشان، اختر فلک معنی و بیان، محمد خالد المخلص بہ اختر کو غالب خستہ کا سلام پہنچے۔ تمھاری کتاب ''مکاتیب خضر'' بر سبیل ڈاک آئی۔ تمھارا نام نامی پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ اس لیے تعجب ہوا کہ مجھ غریب الدیار کو تم نے کیوں شایان لطف گردانا۔ بہت سوں سے تمھارے بارے میں پوچھا۔ لیکن کوئی آشنائی و آگاہی کا مدعی نہ ہوا۔ تقریظ سے کھلا کہ تم بہت بڑے ادیب ہو۔ ظرافت میں ید طولی رکھتے ہو۔ یعنی عجیب و غریب ہو''۔ (۶۲)

غالب کے انداز میں خط لکھنا مشکل امر ہے۔ کیونکہ نثر میں غالب نے جو جدت طرازیاں اور روایت شکنی کی ہے اس کی نقل یا تحریف آسان نہیں ہے۔ لیکن مشفق خواجہ کا فن اس آزمائش میں بھی پورا پورا اُترتا ہے۔

حاصل کلام یہ کا مشفق خواجہ اپنے ادبی کالم نگاری کے اپنے موجد ہے۔ ان کا انداز انھی پہ ختم ہوا۔ نہ تو انھوں نے کسی کی پیروی کی اور نہ کسی سے ان کی پیروی ہوئی۔ ان کے کالم اول تا آخر ادبی ہیں۔ ان کا کالم کالم کے فن پر پورے اُترتے ہیں۔ انھیں ہم بجا طور پر اردو زبان کا بڑا ادبی کالم نگار کہنے میں حق بجانب ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ جعفر بلوچ، ''مشفق من خواجہ من'' مکتبہ کارواں لاہور، ۱۹۹۸ء ص۔ ۱۹۹

۲۔ ظفر عالم ظفری، ''اُردو صحافت میں طنز و مزاح'' فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۶ء ص۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰

۳۔ وحیدالرحمٰن خان، ''خامہ بگوش ایک مطالعہ'' اکادمی بازیافت کراچی جولائی ۲۰۰۴ء۔ ص۔ ۱۹

۴۔ طاہر مسعود، مشفق خواجہ (ایک انٹرویو) ''مشفق خواجہ ایک مطالعہ'' ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر، دہلی۔ دسمبر ۱۹۸۵ء ص ۳۴۔

۵۔ ڈاکٹر اسلم انصاری، ''مشفق خواجہ'' مشمولہ ماہنامہ ''ادب دوست'' لاہور۔ جون ۲۰۰۵ء ص۔ ۱۹

۶۔ خامہ بگوش، دیباچہ بعنوان ''غلط نامہ'' صفحہ نمبر، ۶۔

۷۔ ڈاکٹر انور سدید، ''سخن ہائے گسترانہ'' فضلی سنز، (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی ۲۰۰۷ء ص۔ ۱۶

۸۔ ''شاعری یا گناہ بے لذت'' مشمولہ: سخن ہائے گسترانہ، مرتب: ڈاکٹر انور سدید، فضلی سنز لمیٹڈ کراچی ۲۰۰۷ء، ص۔ ۵

۹۔ مظفر علی سید، ''ادبی منشیات'' مشمولہ: ''سخن در سخن''، اکادمی بازیافت کراچی اپریل ۲۰۰۴ء، ص۔ ۲۹

۱۰۔ ایضاً، ص۔ ۳۲

۱۱۔ مظفر علی سید ''کمزور شاعری مضبوط پی آر'' مشمولہ: سخن در سخن، ص۔ ۳۳

۱۲۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۳۔

۱۳۔ مظفر علی سید، ''آمد اور آورد'' مشمولہ: خامہ بگوش کے قلم سے، ص۔ ۱۵

۱۴۔ ''آمد اور آورد'' مشمولہ، خامہ بگوش کے قلم سے۔ صفحہ نمبر، ۱۵۔

۱۵۔ ایضاً۔ ص۔ ۱۹

۱۶۔ ایضاً۔ ص۔ ۱۹

۱۷۔ مظفر علی سید، ''آمد اور آورد'' مشمولہ: خامہ بگوش کے قلم سے، ص۔ ۲۱۔ ۲۲

۱۸۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۷

۱۹۔ ایضاً۔ ص۔ ۵۹

۲۰۔ ایضاً۔ص۔۱۸۲،۱۸۳

۲۱۔ ڈاکٹر شمیم حنفی، ''خامہ بگوش کے قلم سے'' ،ص۔۶۴

۲۲۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے''ص۔۲۵

۲۳۔ ایضاً ص۔ ۲۵۔

۲۴۔ مظفر علی سید "سخن ہائے ناگفتنی" ص۔ ۹۸۔

۲۵۔ محمود ہاشمی "خامہ بگوش" کتاب نما دہلی۔ جولائی ۱۹۹۵ء ص۔ ۷۳۔

۲۶۔ ابولاعجاز حفیظ صدیقی، ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء ص۔۱۳

۲۷۔ مظفر علی سید ''فلیپ سخن ہائے گفتنی''

۲۸۔ ڈاکٹر انور سدید، ''مشفق خواجہ ایک کتاب'' یورب اکیڈمی ۲۰۰۸ء، ص۔۸۷

۲۹۔ شمیم حنفی۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے'' کتاب نما، دہلی۔ جولائی ۱۹۹۵ء۔ص۔۵۹

۳۰۔ ''دستار فضیلت یا فضیلت مستعار'' مشمولہ سخن در سخن، ص۔۵۳۔

۳۱۔ ڈاکٹر انور سدید ''ترقی پسند مصنفین کون ہیں'' مشمولہ ''سن تو سہی''، خواجہ عبد طارق یورب اکادمی اسلام آباد مارچ ۲۰۰۸ء، ص۔۱۰۵

۳۲۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے''، ص۔۲۱

۳۳۔ خامہ بگوش، ''سخن در سخن''، تکبیر، کراچی، ۴ جولائی ۱۹۹۵ء ،ص۔۱۹۳

۳۴۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے''، ص۔۲۷

۳۵۔ ایضاً، ص۔۴۸۔

۳۶۔ ایضاً، ص۔۵۵۔

۳۷۔ ایضاً، ص۔۵۹۔

۳۸۔ سخن ہائے ناگفتنی''، ص۔۶۴۔

۳۹۔ ''سن تو سہی'' صفحہ نمبر، ۸۴۔

۴۰۔ فاروقی، محبوب الرحمٰن۔ ''سخن در سخن'' کتاب نما دہلی۔ جولائی ۱۹۹۵ء، ص۔۸۸

۴۱۔ خامہ بگوش۔ ''سخن در سخن''، تکبیر، کراچی۔ ۵ ستمبر ۱۹۹۶ء ص۔۴۹

۴۲۔ وحید الرحمٰن خان، ''خامہ بگوش ایک مطالعہ'' اکادمی بازیافت کراچی جولائی ۲۰۰۰ء ص۔۱۵۴
۴۳۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے'' ص۔۲۵۶
۴۴۔ ایضاً،ص۔۱۱۴
۴۵۔ ڈاکٹر ظفری، ظفر عالم، ''اُردو صحافت میں طنز و مزاح'' ص۔ ۲۸۳
۴۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ''اُردو ادب میں طنز و مزاح'' ص۔۴۷
۴۷۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے''،ص۔۱۶۳،۱۶۴
۴۸۔ ایضاً،ص۔۱۸۳۔
۴۹۔ ایضاً،ص۔۲۲۱۔
۵۰۔ مظفر علی سید: سخن ہائے ناگفتنی "،ص۔۱۰۲
۵۱۔ وحید الرحمٰن خان ''خامہ بگوش ایک مطالعہ''،ص۔۱۶۸
۵۲۔ ایضاً،ص۔۱۶۴،۱۶۵
۵۳۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے''،ص۔۵۵
۵۴۔ ایضاً،ص۔۵۷۔۵۸
۵۵۔ ڈاکٹر انور سدید، ''اُردو نثر کے آفاق'' ۱۹۹۵ء مقبول اکیڈمی لاہور۔ص۔ ۹
۵۶۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے'' ،ص۔۲۶۰
۵۷۔ ایضاً،ص۔۱۰۵
۵۸۔ ایضاً،ص۔ ۳۲۱
۵۹۔ ایضاً،ص۔۱۷۳
۶۰۔ ڈاکٹر انور سدید، ''اُردو نثر کے آفاق''،ص۔۸۷
۶۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ''اُردو ادب میں طنز و مزاح''،ص۔۴۸
۶۲۔ خامہ بگوش کے قلم سے''،ص۔۲۴

☆☆☆☆

بابِ چہارم

عصرِ حاضر کے منتخب ادیبوں کے کالموں کا جائزہ

بابِ چہارم

عصرِ حاضر کے منتخب ادیبوں کے کالموں کا جائزہ

یہ اُردو زبان کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ابتدا ہی میں ایسے کالم نگار اور ادیب ملے کہ اسے اردو کالم نگاری میں بھی ایک اعلیٰ مقام عطا کیا۔ موجودہ دور میں بھی اچھے خاصے تعداد میں ادیب کالم لکھ رہے ہیں اور اس صنف اور فن کی آبیاری کر رہے ہیں۔ دورِ حاضر میں تو ہر قسم کے اور ہر موضوع پر کالم لکھے جا رہے ہیں۔ ان میں سیاست، معشیت، مذہب، سماجی اور معاشرتی مسائل، تعلیم، صحت، کھیل، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ادبی کالم نگاری بھی اسی طرح جاری وساری ہے، جیسے کہ ابتدا میں تھی۔ آج کالم تقریباً زندگی کے ہر شعبہ سے وابستہ قلم کار لکھ رہے ہیں۔ اگر ماہر اقتصادیات ہے تو اس کے کالم کا موضوع ملکی اور بین الاقوامی معشیت ہے اور اگر ماہر سیاسیات ہے تو اس کے کالم کا موضوع سیاست ہے۔

آج کا ادیب بھی مختلف موضوعات ہر خامہ فرسائی کر رہا ہے۔ ادیب زندگی کے ہر طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ ادبی موضوعات کے علاوہ وہ سیاست، معشیت، مذہب اور سماجی و معاشرتی مسائل اور ان کے حل کے لیے تجاویز دے رہا ہے۔ لیکن بڑی بات ان ادیب کالم نگاروں کے ہاں یہ ہے کہ ان کے کالموں میں ادبی چاشنی موضوع کو اور دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ ادیب اپنے کالم میں کبھی استعاراتی انداز اپناتا ہے تو کبھی علامتی۔ انداز بیاں سلیس اور رواں دواں کے ہونے کے ناطے قارئین کے پسندیدہ کالم نگار ٹھہرتے ہیں۔ ایسے کالم نگاروں کی فہرست تو خاصی طویل ہیں جو اپنے اسلوبِ بیان کی وجہ سے اپنے قارئین کا ایک بڑا حلقہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہاں پر صرف چند ادیب کالم نگاروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس بات کا پتہ چلے کہ ادیب کالم نگاروں کا موضوع کیا ہوتا ہے اور کالم میں ان کا انداز نگارش کیسا ہوتا ہے۔

آج کالم صحافت کی انتہائی معتبر، مقبول اور پسندیدہ صنف کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ اردو ادب اور صحافت کے بہترین نام اس سے وابستہ ہیں اور کسی نہ کسی اخبار میں خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ جہاں صحافت کی دوسری اصناف میں یہ شکایت کی جاتی ہے کہ زبان و بیان کا معیار متاثر ہوا ہے، وہاں کالم میں زبان و بیان کے نئے تجربات ہوئے ہیں۔ جنھیں عوام وخواص نے پسند کیا ہے۔ سیاسی عمل کے تسلسل نے صحافت کو نئے رجحانات سے روشناس کروایا ہے۔

کالم نویس کسی خوف یا خدشے کے بغیر اپنی بات کر سکتے ہیں۔ اب اگلے صفحات میں بیسویں صدی کے آخری دو عشروں کے جدید کالم نگاروں ذکر کیا جاتا ہے۔

اے۔حمید (۱۹۲۸ء۔۲۰۱۱ء)

اے۔حمید ادبی کالم نگاری میں رومانیت کا حوالہ ہیں۔ وہ فکشن کے ایک بہت اہم اور صاحبِ اسلوب قلمکار ہیں۔ انھوں نے اپنی اس خوبی کو کالم نگاری کے میدان میں بھی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ اے۔حمید نے ادبی لحاظ سے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ ہجرت کے بعد وہ لاہور میں آئے۔ تو اس وقت لاہور کو اردو ادب کے سب سے بڑے علمی و ادبی مرکز کا درجہ حاصل تھا۔ اور سیاسی حالات اور تقسیم کی وجہ سے اپنے عہد کی بے شمار نابغۂ روزگار شخصیات لاہور میں جمع ہوئیں۔ اِسی عہد میں اردو ادب کے کینوس پر کئی ادبی تحریکیں رجحانات، مباحث اور تجربات کی تصویریں بن رہی تھیں۔ ایک طرف ترّقی پسند تحریک نے ادبی ذہن میں انقلاب کی خواہش پیدا کرتھی اور ادب برائے زندگی کا سوال اٹھا دیا تھا۔ دوسری طرف حلقہ اربابِ ذوق کی صورت میں ادب میں جدیدیت کی تحریک منظّم ہورہی تھی۔ یہ سارے عوامل ایسے ہیں کہ جس نے پاک و ہند کے ادیبوں کے درمیان فلسفیانہ سطح پر مکالمے اور بحث و مباحثے کا نیا محاذ کھول دیا تھا۔ اے۔حمید نہ صرف اِس سنہرے عہد کے چشم دید گواہ ہیں بلکہ وہ ان تحریکوں اور رجحانات کا حصہ بھی ہیں۔ اِس حوالے سے اے۔حمید اِس زریں دور کی ایک چلتی پھرتی تاریخ بھی ہیں اور نئے ادب کی ایک معتبر گواہی بھی۔

اِسے اُردو ادب کی خوش نصیبی سمجھا جائے کہ اے۔حمید نے ماضی کی اِن تمام روشن حکایتوں اور روایتوں کو ادبی کالم کی صورت میں محفوظ کرلیا ہے۔ اے۔حمید ایک طویل عرصے تک اردو کے مقبول ترین اخبار روزنامہ ''نوائے وقت'' کے ہفتہ وار میگزین میں ادبی کالم لکھتے رہے۔ ''بارش ساوار، خوشبو'' کے نام سے شائع ہونے والے یہ کالم ''نوائے وقت'' کے تمام ایڈیشنوں میں اہتمام سے چھپتے اور ادبی حلقوں میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے۔

اے۔حمید کے ادبی کالموں کا حسن ان کے افسانوی ماحول سے اٹھتا ہے۔ وہ ایک اہم اور کہنہ مشق افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ انسانی نفسیات کے پوشیدہ گوشوں کو سمجھنے اور پرکھنے اور بیان کرنے کا ملکہ ان کی خداداد صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کے ادبی کالموں میں ادبی تاریخ کے مآخذ بھی بکھرے ہیں اور تذکرہ نگاری کے جوہر پارے بھی۔ ادبی شخصیات کے خاکے بھی ملتے ہیں اور اپنے عہد کی گم شدہ آوازوں کی گونج بھی۔ انھوں نے محبت اور عقیدت کے ساتھ ادبی کالم نگاری کرتے ہوئے کالم کی روایت میں ادبی خدوخال تراشے۔ ممتاز شاعر،

افسانہ نگار اور نقاد جناب احمد ندیم قاسمی اے۔حمید کے اسلوب بیان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اے۔حمید صرف ایک بڑا ناول نویس اور افسانہ نگار ہی نہیں ہے۔ وہ ایک ہشت پہلو ادیب ہے۔نثر کی جس صنف کو اس کے قلم کی نوک نوازتی ہے۔ وہ مزید روشن اور امکانات سے پُر دکھائی دینے لگتی ہے۔اے۔حمید کی ہر تحریر میں ایک عجیب طلسماتی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ کچھ بھی لکھے اس کے مکمل مطالعے کے بغیر قاری اپنے آپ کو نامکمل محسوس کرتا ہے۔ اور جب مکمل کر لیتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے کہ یہ تحریر اتنی جلد ختم کیوں ہوگئی''۔(۱)

احمد ندیم قاسی کی اِس رائے کی روشنی میں جب ہم اے۔حمید کے ادبی کالموں کے مجموعوں ''لاہور کی باتیں''، ''چاند چہرے'' اور ''بارش، سماوار، خوشبو'' کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ ہمیں سنجیدہ کالم نگار دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی کتاب ''بارش، سماوار، اور خوشبو'' یادنگاری کا ایک ایسا سلسلہ ہے۔ جس میں ہمیں ادب کے گم شدہ جزیروں کے آثار ملتے ہیں۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے یہ کتاب ادب، ادبی محفلوں اور ادبی شخصیات کی تذکرہ نگاری کا ایک دلآویز مرقع نظر آتی ہے۔ اِس کتاب کے مطالعے سے ادب کے طالب علم اپنی نظروں کے سامنے فنون لطیفہ کے اس عہد آفریں زمانے کو چلتے پھرتے محسوس کرتے ہیں۔ جب لکھنا پڑھنا اور ادب سازی اور ادب نوازی ہماری تہذیب کی روح تھی۔ کتاب کے ابواب کے ناموں پر ایک نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ کیسے کیسے ادب جزیرے اے۔حمید کی کالم نگاری کے ذریعے سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ ''ریڈیو پاکستان کی سنہری یادیں''، ''بالکونی کے گلاب''، ''گم شدہ محبت کی تلاش''، ''خزاں کے زرد پتے''، ''ٹی ہاوس کے گمشدہ چہرے''، ''خاموش پیانوں کی اداس آواز''، ''جانے کہاں گئے وہ دن، ''بارش میں بھیگتی رات''، ''الوداع سری لنکا''، ''دلی کی مسلم ثقافت کے گم شدہ اوراق''، ''چائے کے اداس رومانس''، ''برف باری میں سنہری چائے کی خوشبو''، ''محبت کی باتیں'' وش مالو، ایک گم شدہ روایت گاہے گاہے، بازخواں، لاہور کے ادبی وثقافتی ادارے''، ''لاہور کے بھولے بسرے ادبی وثقافتی ٹھکانے''، ''لاہور کے گم شدہ منظر''، ''گلستان ادب کے گمشدہ منظر''، ''لاہور کے بھولے بسرے ثقافتی ٹھکانے''، ''کہاں گئے وہ لوگ''، ایسے ابواب ہیں۔ جن میں ادبیت کا حُسن بولتا نظر آتا ہے۔

اے۔حمید یادنگاری کے فن میں ایک مثالی ادیب کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ کالم کے آغاز میں ایک رومانوی فضا بناتے ہیں۔ اور بتدریج اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے قاری کی توجہ اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

اے۔حمید کا اسلوب ان کی تخلیقی شخصیت کی خوداعتمادی کا پرتو ہے۔ وہ نہ تو مصنوعی اور شعوری کوشش سے اپنے انداز تحریر کی تخلیق کرتے ہیں اور نہ ہی کسی تقلید یا نقالی کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ عام فہم، رواں دواں الفاظ سے ایک منظر نامہ تشکیل دے کر ادبی زندگی کے چہرے سے نقاب ہٹاتے ہیں۔ یہ عمل اتنا لطیف اور پر لطف ہوتا ہے کہ قاری تادیر

ان کے اسلوب کے حصار میں خود کو محسوس کرتا ہے۔ ان کے ایک کالم ''گم شدہ محبت کی تلاش'' کا یہ پہلا ٹکڑا اس بات کی گواہی دیتا ہے۔

''وہ خوب صورت چہرے جنھوں نے مجھ سے غیرفانی محبتوں کی کہانیاں لکھوائیں۔ مجھ سے بچھڑ کر خیال وخواب کی وادیوں میں گم ہو رہے ہیں۔ یہ وہ پاکیزہ چہرے تھے۔ جن کے جسموں کے لباس کی خوشبو ان کے آگے پیچھے چلتی تھی۔ ان خوبصورت چہروں کی خوشبو پہلے آتی تھی اور وہ بعد میں آتے تھے۔ اور جب وہ چلے جاتے تھے تو اپنے پیچھے اپنی جگہ خوشبو کی نشانیاں چھوڑ جاتے تھے''۔(۲)

اے۔حمید عام سے واقعے کو بھی اپنے اسلوب سے خاص بنا کر قاری کے ذہن میں اتارتے ہیں۔ چاہے وہ منظر نگاری ہو یا یادنگاری، کسی شاعر ادیب کی شخصی تصویر ہو یا مکالماتی فضا۔ وہ اپنے اسلوب کی رنگا رنگی سے نت نئی ادبی تصویریں تخلیق کرتے ہیں۔ دراصل انھیں ادب کے جمالیاتی آہنگ کے شعور کے ساتھ ساتھ یہ ادراک بھی حاصل ہے کہ قاری کے ذوقِ جمال کی تسکین کے تقاضے کیا ہیں۔ وہ نہ صرف قاری کے ذوق کی تسکین کرتے ہیں بلکہ اس کی ذہنی سطح پر آکر اس کے اعلیٰ ادبی ذوق کی تہذیب بھی کرتے ہیں۔ فطری طور پر انسان اپنے ماضی کے حسین منظروں کو یاد کرتا ہے۔ وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں ماضی کو حال کے دائرے میں لا کر اس میں سانس لیتا ہوا حال کی گھٹن سے فرار چاہتا ہے۔ یہ ایک رومانوی ونفسیاتی کیفیت ہے۔ اے۔حمید کے کالم رومان پسند قاری کی اِسی نفسیاتی کیفیت کی طلب کو پورا کرتے ہیں۔ ''ٹی ہاؤس کے گم شدہ چہرے'' ایسا ہی کالم ہے۔ جس میں ادبی اندازِ تحریر کی سادگی و پرکاری کو کام میں لاتے ہوئے وہ ماضی کے چہرے سے پردہ ہٹاتے ہیں۔ ٹی ہاوس قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں شاعروں ادیبوں کی معروف ادبی نشست گاہ رہی ہے۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے عہد ساز شاعر و ادیب ایک میز کے گرد اکٹھے ہوتے، تب ایک دوسرے کے شعر و افسانے سنے جاتے۔ ادبی نظریات پر گفتگو ہوتی اور اِس طرح نئے لکھنے والوں کو تخلیقی توانائی میسر آتی۔ اے حمید اِس کالم میں لکھتے ہیں۔

''پاک ٹی ہاؤس کی گہما گہمی اور اس کی ساکھ زیادہ تر ان شاعروں ادیبوں اور نقاد حضرات کی وجہ سے قائم تھی۔ جو ٹی ہاوس میں آکر محفلیں لگایا کرتے تھے شعر و ادب کی باتیں ہوتی تھیں۔ جن شعرا کا کلام لوگ ادبی رسالوں میں شوق سے پڑھتے تھے۔ ٹی ہاوس میں بیٹھ کر انھیں ان شاعروں کو دیکھنے اور کبھی کبھی ان کی زبان سے شعر سننے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ چنانچہ ادب دوست اور پاکستان کے نامور ادیبوں اور شاعروں کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کی خاطر لوگ بھاری تعداد میں صرف لاہور ہی

سے نہیں بلکہ پاکستان کے دوسرے شہروں سے بھی آتے تھے''۔(۳)

اے حمید نہ تو بھاری بھرکم الفاظ کا سہارا لے کر قاری کو مرعوب کرتے ہیں اور نہ ہی غیر ضروری تفصیلات ومباحث کا ذکر کر کے قاری کے لیے بیزاری کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ دراصل ان کے ادبی کالموں میں ان کے اندر کا افسانہ نگار سامنے آتا ہے۔ وہ واقعہ نگاری کے ذریعے سے اپنے کالم کو سنوارتے اور سجاتے ہیں۔ ان کے کالموں کا مجموعہ ''لاہور کی باتیں کچھ نئی کچھ پرانی'' میں بھی افسانویت جلوہ گر نظر آتی ہے، بجا طور پر اسے لاہور کی تاریخی اور تہذیبی دستاویز کہا جاسکتا ہے۔ کتاب میں قائم عنوانات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہاں لاہور کے وہ آثار محفوظ ہیں۔ جو نئی نسل کے لیے پرانے لاہور کے منظر کو دیکھنے کا دریچہ ہیں کتاب کے عنوانات میں ''نومبر کی ایک رات''، ''وادیاں، ہوٹلوں کا لاہور''، راوی بپھرتا ہے،'' سڑکیں اور کتبے''، ''میں بھی حاضر تھا وہاں،'' راوی کا میلہ تہواروں کا شہر''، بہار کی وادی،'' رت آئے، رت جائے''،'' میرا لاہور''، ''ڈرامہ لیلیٰ مجنوں اصلی''، '' چہار درویش''، '' دیکھو شہر لاہور'' شامل ہیں۔

'' چاند چہرے'' اے۔ حمید کے کالموں کا ایک خوب صورت مجموعہ ہے۔ یہ دراصل ان کے وہ کالم ہیں جن میں انھوں نے معروف شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں اپنے تاثرات کو تخلیقی انداز میں لکھا ہے۔ ان کالموں میں اے۔ حمید ایک کامیاب خاکہ نگار کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ کتاب ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اے۔ حمید نے بھرپور ادبی زندگی گزاری ہے اپنے وقت کے بڑے بڑے ادیبوں کے ساتھ ان کی برسوں پر محیط دوستیاں اور تعلقات رہے ہیں۔ ان کے یہ کالم اس حوالے سے ایک سند کا درجہ رکھتے ہیں کہ وہ واقعی ایک کامیاب خاکہ نگار ہیں۔'' چاند چہرے'' میں شامل جن ادبی شخصیات کے خاکے اے۔ حمید نے لکھے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، ناصر کاظمی، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، عبدالحمید عدم، مولانا چراغ حسن حسرت، ابن انشاء، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، سیف الدین سیف، اخلاق احمد دہلوی، قتیل شفائی، ساغر صدیقی، ساحر لدھیانوی، شمس آغا، سید ضمیر جعفری، باری علیگ، ڈاکٹر عبادت بریلوی ،سید وقار عظیم ابراہیم جلیس، احمد راہی، انور جلال شمزا، راجہ مہدی علی خان، شبنم شکیل، مرزا سلطان بیگ، شفیع عقیل نواز، شرقی بن شائق، کلیم اختر اور صلاح الدین محمود۔

خاکہ نگاری بلاشبہ ایک مشکل صنف ہے۔ کہ اس میں قدم قدم پر سوچ سمجھ سے کام لینا ہوتا ہے۔ خاکہ نگاری لفظوں سے تصویر بنانے کا ہنر ہے۔ اور بہت کم خاکہ نگار اِس ہنر کے تقاضوں پر پورا اترتے ہیں۔ اے۔ حمید اس

کتاب میں ایک کامیاب خاکہ نگار کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی ان کی خاکہ نگاری کے اعتراف میں لکھتے ہیں۔

> ''اے۔حمید نے شخصیت نویسی اور خاکہ نگاری کی طرف متوجہ ہو کر بطور خاص اِس صنف پر اور بالعموم اردو ادب پر احسان کیا ہے۔ایسے ہنستے بولتے ہوتے مگر ساتھ ہی سچے اور کھرے خاکے بہت کم لکھے گئے ہیں۔اس اعجاز کاری میں ایک تو اے۔حمید کے طلسمی اسلوب نے اس کی مدد کی ہے اور دوسرے اس کی اپنی شخصیت کی محبوبیت نے اس کا ہاتھ بٹایا ہے''۔(۴)

اگر خاکہ نگاری جیسے مشکل فن کے تقاضے نظر انداز کیے جائیں تو پھر وہ بے کیف تحریر بن جاتی ہے۔اور اس میں ادبی چاشنی کا وہ ذائقہ نہیں ہوتا جو خاکہ نگاری کا خاصہ ہے۔ اے۔حمید نے فنی تقاضوں کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تقاضوں کو بھی نبھایا ہے۔ چونکہ خاکہ نگاری شخصیت کے ظاہر کے ساتھ ساتھ اس کے باطن میں بھی جھانکنے کا عمل ہے۔مثال کے طور پر فیض احمد فیضؔ کے خاکے میں اے۔حمید رات اور فیض کی مناسبتیں ڈھونڈتے ہیں۔فیض کی شعری لفظیات میں رات کی علامت کی اپنی ایک شان ہے۔اِس تناظر میں اے حمید کا یہ تجزیہ گہری معنویت دے جاتا ہے۔

> ''فیض صاحب میں بہت زیادہ حسنِ ظرافت تھی اور وہ اپنے ہم عمر دوستوں کی محفل میں بارہ شبینہ کے ابتدائی لمحوں میں خوب چہکتے تھے لیکن اس کے بعد پھر ان پر خاموشی کا غلبہ طاری ہو جاتا اور جوں جوں رات آگے بڑھتی ان کی خاموشی زیادہ بوجھل، زیادہ روشن ہوتی چلی جاتی''۔(۵)

باطن میں جھانکنے کا یہ عمل قدرت اللہ شہاب کے خاکے میں بھی نظر آتا ہے۔لکھتے ہیں۔

> ''اللہ کی قدرت دیکھنی ہو تو شہاب صاحب کو دیکھیے۔لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ کسی کو نظر نہیں آتے۔انھوں نے کوئی ایسی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہے کہ سوائے اپنے آپ کے ہر دوسرے شخص پر غائب رہتے ہیں۔جس شخص کا یہ عالم ہو اس شخص کا خاکہ لکھنا کس قدر دشوار نہیں ہوگا۔اگر یہ مدعا ہو تو شہاب صاحب کے عالم کا عنقا ہے۔''(۶)

اے۔حمید واقعات اور مکالمے کے خمیر سے خاکے کی تشکیل کرتے ہیں۔صاحب خاکہ شخصیت کے بارے میں سپاٹ تاثرات کی بجائے وہ اس سے ہونے والی ملاقاتوں اور مکالموں کی منظر کشی کرتے ہیں۔ یہاں پر ان کی افسانہ نگاری کی صلاحیت کھل کر سامنے آجاتی ہے اور یوں وہ شخصیت چلتے پھرتے کردار کی طرح قاری کے سامنے یوں

جلوہ گر ہوتی ہے جیسے قاری سے ملاقات ہو رہی ہو۔ اشفاق احمد، ابن انشاء، انور جلال اور ناصر کاظمی کے لکھے گئے خاکوں میں ان کی اِس صلاحیت کا جادو سر چڑھ کر بولتا نظر آتا ہے۔ انھیں حلیہ نگاری اور جذبات نگاری کا سلیقہ بھی ہے اور ان کا یہ دست ہنر لفظوں میں تصویر کشی کے فن کے مترادف ہے۔ منظر نگاری اور حلیہ نگاری کا یہ اندازِ تحریر بالعموم ان کے خاکوں کے آغاز میں زیادہ برتا جاتا ہے۔ ناصر کاظمی کے خاکے کا آغاز بھی اِسی زمرے میں ہوتا ہے۔

> ''وہ ستمبر کی ایک خوب صورت صبح تھی۔ پاک ٹی ہاوس کے شیشوں پر ستمبر کی سنہری دھوپ پڑ رہی تھی۔ اس کے عکس سے ٹی ہاؤس سارے کا سارا روشن تھا۔ ہم سب ادیب اور شاعر چائے کی میزوں کے گرد بیٹھے چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک سانولے رنگ کا دبلا پتلا نوجوان پاک ٹی ہاوس میں داخل ہوا۔ اس کے لہریالے گہرے سیاہ بال چمک رہے تھے۔ ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ وہ ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ قیوم نظر نے بلند آواز سے ٹی ہاوس کے مالک سے کہا۔ ''سراج صاحب بڑی اچھی سی چائے بجوائیں۔ بہت بڑا شاعر آیا ہے'' یہ بہت بڑا شاعر ناصر کاظمی تھا''۔(۷)

اے۔ حمید کے اسلوب کی ایک نمایاں جہت طنز و مزاح بھی ہے، ان کے ہاں طنز اور مزاح زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس تناظر میں وہ ایک شگفتہ نگار ہیں جو موقع محل کے مطابق تحریر میں شگفتگی اور دلکشی پیدا کرنے پر قادر ہیں۔ مزاح اور ظرافت تخلیق کے اہم وسائل ہیں اور بہت کم تخلیق کار ایسے ہوتے ہیں، جن کو قدرت کی طرف سے یہ صلاحیت ودیعت کی گئی ہو۔ اے حمید کے اسلوب میں بھی شگفتگی رچی بسی ہے۔ ان کے ادبی کالم کی پسندیدگی اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سنجیدگی کے باطن سے شگفتگی پیدا کرتے ہیں۔ ان کی ظرافت سطحیت اور پھکڑ بازی کی بدصورتیوں سے پاک ہے۔ اس میں ایک نوع کی نفاست اور تہذیب پائی جاتی ہے۔ جو قاری کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ بکھیرنے میں کامیاب رہتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی ان کے اسلوب کی اِس روشن جہت کی تعریف میں لکھتے ہیں:

> ''افسانہ اور ناول سے ہٹ کر اے۔ حمید نے جتنا بھی نثری ادب تخلیق کیا ہے اس میں مصنف کی شگفتہ طبعی اور بذلہ سنجی انتہا کو پہنچی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جو لوگ اے۔ حمید کو قریب سے جانتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ اے۔ حمید روزمرہ کی گفتگو اور گپ شپ میں نہایت ہی شگفتہ ہے۔ یہ شگفتگی تو اس کا اندازِ زندگی ہے''(۸)

الغرض اے۔حمید ادبی کالم کی روایت کا ایسا تخلیق کار ہے جس نے کالم کے دامن میں ادبیت وشعریت کے پھول کھلانے کے کامیاب تجربات کیے ہیں۔ انھوں نے کالم میں نئے امکانات کو دریافت کرتے ہوئے جہاں ادب پروری اور ادب نوازی کے شعور کو عوام تک پہنچایا وہیں کالم نگاری کے ذریعے معاشرتی اقدار میں ادب کو بھی فروغ دیا اور یقیناً کالم نگاری اِس کے لیے اے حمید کی مرہون منت ہے کہ اے حمید کے قلم نے ادبی کالم کی آبرو کا پاس بھی کیا اور مان بھی رکھا۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان (۱۹۴۲ء۔۲۰۱۱ء):

اگر پورے ملک میں نہیں تو کم از کم پورے صوبہ سرحد میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کالم بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ڈاکٹر ظہور احمد اعوان (کاظم علی جوان) کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی آپ بیتی (بہ طرز ناول) میں ان کی ولادت بہ سعادت اور خاندانی پس منظر کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔

''یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے کہ جب جنگ عظیم دوم اپنے زوروں پر تھی تب شہر پشاور کے ایک غریب محلے کی ایک تنگ وتاریک، غیر روشن مٹی کی ایک کوٹھڑی میں ایک بچہ پیدا ہوا۔باپ کی عمر اُس وقت ۴۲ برس تھی۔کہ ۴۱ برس کی عمر میں اس نے شادی کی تھی۔اس کا دادا اپنے زمانے کا خوشحال آدمی تھا۔گلاب خان، گھوڑوں کا سوداگر۔۔۔والد کا تعلق ایک قریبی گاؤں صابی بڈھنی سے تھا۔یہ خاندان وہاں سے اُٹھ کر پشاور شہر میں بسلسلہ کاروبار قیام پذیر ہوا تھا۔کاظم کی دادی کا تعلق بھی اسی گاؤں سے تھا''۔(۹)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے ابتدائی تعلیم اپنے محلے کی پرائمری سکول میں حاصل کی۔میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۲ پشاور سے کیا۔کالج کی تعلیم اپنے زمانے کے معروف تعلیمی ادارے فارورڈ کالج سے حاصل کی۔ایم اے اُردو باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے شعبۂ اُردو جامعہ پشاور سے کیا۔جبکہ پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے ایم اے انگریزی کی ڈگری بھی جامعہ پشاور سے حاصل کی۔اسی جامعہ پشاور سے ''اقبال اور افغان'' کے موضوع پر انگریزی زبان میں مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

سرحد کے مختلف کالجز میں پڑھانے کے بعد ڈاکٹر ظہور احمد اعوان شعبۂ اُردو جامعہ پشاور سے منسلک ہوئے اور یہاں پر ہردلعزیز اُستاد کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔تاہم بعد میں آپ ایم فل اور پی ایچ۔ڈی کی کلاسز کو

پڑھاتے رہے۔اب تک ان کی نگرانی میں درجنوں ریسرچ اسکالر، ایم فل اور پی ایچ۔ڈی کے مقالے لکھ چکے ہیں۔ڈاکٹر ظہور اعوان کو ان کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان ''صدارتی تمغۂ امتیاز'' سے نواز چکی ہے۔اس کے علاوہ بھی انھیں دیگر ایوارڈ اور اعزازات مل چکے ہیں۔جن میں بنک آف خیبر ایوارڈ، ہمدرد وثیقہ اعتراف، علامہ نیاز فتح پوری ایوارڈ، روٹری کلب آف پاکستان ایوارڈ، گندھارا ہندکو بورڈ ایوارڈ، سٹی گورنمنٹ آف پشاور ایوارڈ، اباسین گولڈ میڈل، پاک ترک دوستی وغیرہ نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر اعوان کی تخلیقی شخصیت کی روشن جہتوں کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اب تک ان کی پچاس سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔جبکہ تدوینی وتالیفی، شریکِ مصنف اور مقدمہ نویس کتابوں کی تعداد دس ہے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی یہ کتابیں ادب کی معروف اصناف سفرنامہ، خاکے، تنقید، کالم، رپورتاژ، اقبالیات، ترجمہ، سوانح، ناول پر مشتمل ہیں۔اس کے علاوہ آپ نے تاریخ اور پاکستانیات کے موضوع پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی تصانیف پر ایک نظر:

سفرنامے: ۱۔ دیکھ کبیرا رویا ۲۔ امریکہ نامہ ۳۔ امریکن ڈائری

۴۔ بلیک پول تا بوسٹن ۵۔ مشرق کا جنیوا ۶۔ گمشدہ سفرنامہ

۷۔ ابن بطوطہ کے خطوط ۸۔ سفر تمام

تنقید: ۹۔ چہار سفرنامہ ۱۰۔نذر نظیر ۱۱۔عسکری میراجی ۱۲۔نذر نیاز۔

۱۳۔ظہور شوکت ۱۴۔سب رس، ایک مطالعہ

خاکے: ۱۵۔سب دوست ہمارے ۱۶۔حساب دوستاں ۱۷۔سیاسی چہرے

۱۸۔چہرہ بہ چہرہ ۱۹۔سرِدلبراں

رپورتاژ: ۲۰۔دھوپ چاندی ہوا ۲۱۔جہاں نما ۲۲۔تاریخ رپورتاژ نگاری

۲۳۔پودے ایک تجزیہ

کالم: ۲۴۔کالم کلامیاں ۲۵۔دل پشوری ۲۶۔بیکار مباحث ۲۷۔فاسٹ فوڈ

۲۸۔انوگیاں فگار ۲۹۔پچیسواں گھنٹہ

اقبالیات: ۳۰۔دو اقبال ۳۱۔اقبال ع علی شریعتی ۳۲۔اقبال و علامہ مشرقی

۳۳۔ اقبال وافغان

پاکستانیات: ۳۴۔دو پاکستان ۳۵۔کشمیر انتقادہ

ادبی مضامین: ۳۶۔نگارشات ۳۷۔مضامین رفتہ وگزشتہ

ترجمہ: ۳۸۔گرفتار ہوا ۳۹۔خواب گر کھلونے ۴۰۔ پطرس نامہ ۴۱۔ سائیں احمد علی پشوری

سوانح: ۴۲۔کتابِ سعید ۴۳۔ خان اعظم

۴۴۔ کاظم علی جوان (آپ بیتی، بہ طرز ناول)

تاریخ: ۴۵۔ترکی نامہ ۴۶۔ خلاصہ تاریخ پشاور (گوپال داس)

انگریزی: ۴۷۔جون جور

ہندکو: ۴۸۔پشور پشورائے

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی ادبی کالم نگاری کا جائزہ:

ادبی کالم کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرنے والے ادباء میں ایک اہم نام ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کا بھی

ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان اُردو کے ممتاز محقق، نقاد، خاکہ نگار سفر نامہ نگار، مترجم، سوانح نگار، مورخ، ماہر اقبالیات اور ماہر تعلیم ہیں۔ اب تک ان کی پچاس سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جو علمی و ادبی موضوعات پر خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نظریاتی طور پر ایک ترقی پسند دانشور اور ادیب ہیں۔ جمہوریت کے علم بردار انقلابی ذہن کے مالک ڈاکٹر اعوان فوجی حکومتوں میں جمہوریت کے حق میں قلمی و عملی جہاد کے باعث بہت صعوبتیں برداشت کر چکے ہیں۔ مارشل لاء حکام آپ کا دور دراز اور مشکل مقامات پر تبادلے کرتے رہے۔ تاکہ آپ مجبور ہو کر ان کے اشاروں پر چلیں۔ لیکن آپ نے ساری مشکلات برداشت کیں۔ اور فوجی آمروں کے آگے نہیں جھکے۔

ادبی وصحافتی دنیا میں ڈاکٹر اعوان کی ایک عظمت اور انفرادیت یہ بھی ہے کہ آپ اُردو کے ممتاز ادبی کالم نگار بھی ہیں۔ ادبی کالم کو عوام کے سبھی طبقوں میں متعارف کرانے میں آپ کا کردار مثالی ہے۔ اُردو ادب میں آپ کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ اب تک سب سے زیادہ ادبی کالموں کے مجموعے آپ ہی کے شائع ہو چکے ہیں۔ ادبی کالم کے خدوخال نکھارنے اسے صحافتی دنیا میں تسلیم شدہ کردار سے نوازنے میں ڈاکٹر اعوان کا نام اور کام ایک سند کا درجہ رکھتا ہے۔

ڈاکٹر ظہور اعوان کے کالموں میں موضوعات کی ایک دنیا آباد ہے۔ ادب کے علاوہ سیاست، معیشت، تعلیم، سماجیات، سائنس ٹیکنالوجی، تاریخ، نفسیات، تہذیب وثقافت، مذہبیات اور دیگر موضوعات کی بازگشت آپ کے کالموں میں سنائی دیتی ہے۔

ادبی کالم نگار کی حیثیت سے آپ کے کالم ترقی پسندی کے احساس میں رچے بسے ہوتے ہیں۔ ادبی اقدار کا فروغ آپ کے کالم کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ آپ کے کالم گزشتہ کئی برسوں سے روزانہ بلاناغہ پاکستان کے مقبول اخبار روزنامہ ''آج'' پشاور میں شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یورپ اور امریکا کے کئی اردو اخبارات

میں بھی چھپتے ہیں۔ آج کے ساتھ ساتھ آپ نے روزنامہ ''مشرق'' پشاور اور ''جدت'' میں بھی کالم لکھے۔

ادبی کالم نویسی ڈاکٹر ظہور اعوان کا شوق بھی ہے اور عشق بھی۔ آپ اسے ادب کی ایک معتبر صنف سمجھتے ہیں اور اس کے مستقل کردار کو اہمیت دیتے ہیں۔ کالم آپ کے لیے عوام سے مکالمے کا ایک فورم ہے آپ صوبہ سرحد کے سب سے معتبر اور معروف کالم نگار ہیں۔ جنھیں ملک اور بیرون عوام کی بڑی تعداد پسند کرتی ہے۔ خطوط، فون اور ای میل کے ذریعے آپ کے مداح اور قارئین آپ سے رابطے میں رہتے ہیں۔ فکری وفنی زاویے سے ڈاکٹر ظہور اعوان کے کالم انفرادیت کی وصف سے نمو پاتے ہیں۔ انھوں نے کالم نگاری کے نت نئے اور کامیاب تجربے کیے ہیں۔ آپ نے پہلی بار کالم کو کئی تخلیقی اصناف کی ترقی وترویج کا ذریعہ بنایا۔ ان کالموں میں سفرنامے کی صنف بھی پروان چڑھی اور خاکہ نگاری کی روایت کو بھی استحکام ملا۔ تنقید وتبصرے کے خدوخال بھی انھی کالموں میں نمایاں ہوئے۔ اور رپورتاژ نگاری کو سمجھنے کے لیے ادب کے طالب علم بھی اسی طرف متوجہ ہوئے۔ ادبی معرکے اور جدید ادبی نظریات کے میدان بھی یہاں پر سجے اور اُردو زبان کے تحفظ کے لیے مورچہ بندی بھی یہی پر ہوئی۔

تادمِ تحریر ڈاکٹر ظہور اعوان کے کالم کے جو مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ ان میں ''اُردو ادبی صحافت'' ''پچسواں گھنٹہ'' (دو جلدیں) ''کالم کلامیاں''، ''بیکار مباش''، ''دل پشوری''، ''فاسٹ فوڈ'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے جو سفرنامے، خاکے، اور رپورتاژ نگاری پر مبنی مجموعے شائع ہوئے ان میں اکثر حصہ ان کے کالموں میں چھپ چکا ہے۔

اُردو ادبی صحافت ان کالموں کا مجموعہ ہے جن میں ایک سو سے زیادہ اُردو انگریزی، پشتو اور ہندکو علمی ادبی کتابوں پر مختصر کالمی تبصرے وتجزیے شامل ہیں۔ کتاب کا انتساب ان لفظوں میں ہے:

''میرے ان نیم خواندہ قارئین کے نام جنھوں نے جتنی بھی کتابیں پڑھی ہیں۔

شاید میرے کالموں میں ہی پڑھی ہیں''۔(۱۰)

کالموں کے اس مجموعے کی وجہ سے اشاعت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ایک دن اپنے کالموں کے ذخیرے میں سے کچھ کالم ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک دل میں خیال آیا۔کہ جب ہزاروں کالموں کے سمندر میں کود ہی پڑے ہو تو ان کی موضوعاتی تقسیم ہی کر ڈالو۔اور یوں ۱۰۳ کالموں پر مشتمل تبصرہ نما ادبی کالم کا یہ مجموعہ سامنے آیا''۔(۱۱)

تبصرۂ کتب باقاعدہ ایک ادبی فن ہے۔جس میں کسی بھی کتاب کے جملہ محاسن و معائب کو اختصار کے جامع میں پیش کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر ظہور اعوان کتاب دوست کالم نویس ہیں اور کتاب کلچر کا فروغ چاہتے ہیں۔اس لیے ان کی یہ کوشش ہے کہ ان کے ہزاروں قارئین میں اعلیٰ معیار کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہو اس لیے وہ مثبت سوچ کے ساتھ بہترین ادبی کتابوں کا انتخاب کر کے تبصرے کے ذریعے اسے قارئین تک پہنچاتے ہیں۔

تبصرہ جہاں قارئین کو کسی فن پارے سے یا کسی دوسری اہم کاوش کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتا ہے وہاں قاری کی رائے متعین کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔تبصرہ نگار نے اختصار سے کام لیتے ہوئے متعلقہ تخلیق کے متعلق تمام ضروری معلومات فراہم کرنا ہوتی ہیں۔اور اس کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے کہ اس کا تبصرہ طوالت کا شکار نہ ہو جائے یا ایسا نہ ہو کہ کسی اہم چیز کا تذکرہ ہی نہ ہوئے پائے۔اس لیے تبصرہ نگار کو اپنا کام انتہائی چابکدستی سے انجام دینا ہوتا ہے۔

تبصرے کے ان فنی لوازم کا اظہار ڈاکٹر اعوان کے ان کالموں میں ہوتا ہے۔جن میں کتابوں پر تبصرے کیے گئے ہیں۔ممتاز ادیب، دانشور اور کالم نگار پروفیسر عنایت اللہ فیضی کے سفرنامے ''چین بہ جبیں'' پر لکھے ہوئے ڈاکٹر ظہور کا کالم بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ڈاکٹر فیضی کی ''چین یاترا'' کے عنوان سے لکھے گئے کالم کے ابتداء میں بڑی

مہارت کے ساتھ سفرنامے کے پس منظر اور اُردو سفرنامے کے ابتدائی تاریخ پر اجمالاً نظر ڈالی ہے۔ اور اس کے بعد ڈاکٹر عنایت اللہ فیض کے سفرنامے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر فیض خوردبینی نگاہ رکھتے ہیں۔ مشاہدہ ان کا بہت تیز ہے۔ جزئیات نگاری کا ہنر جانتے ہیں۔ مثبت سوچ اعلیٰ فکر اور ہمدردرویوں سے مزیّن ہیں۔ صاحب مطالعہ شخص ہیں۔ جہاں اچھائی نظر آئے اسے لے لینے کو اپنی مومنانہ میراث خیال کرتے ہیں۔ چینیوں کا چین انھیں پسند آیا۔ وہاں کی سادگی صفائی، ایمانداری، محنت فرض، شناسی اور قومی خودانحصاری کے مظاہرے اور جلوے سے پہلے آگاہ تھے۔ ڈاکٹر فیض تاریخ جغرافیہ میں ڈگیاں لگانے کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ اس لیے جہاں موقع ملا ہے۔ چین کی عمارتوں کے ناپ تول کو موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا''۔ (۱۲)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے صاحب کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات گہرائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اور قاری کتاب کے ساتھ ساتھ صاحب کتاب کی شخصیت، علمیت، اور نفسیات سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔

''چتراں ولا کٹورہ'' کے مصنف ڈاکٹر سید امجد حسین کے بارے میں لکھے ہوئے کالم میں بھی ان کی شخصی اوصاف کو سراہا گیا ہے۔ پروفیسر شوکت واسطی کی کتاب ''قلم کا قرض'' پر تبصرہ کرنے اور ان کی زندگی پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ آواز دوست کا مصنف کے عنوان سے لکھے گئے کالم میں بھی انھوں نے ممتاز مصنف مختار مسعود کی شخصیت کو بڑی مہارت کے ساتھ چند لفظوں میں بیان کیا۔ اسی طرح پشتو زبان کے نام ور مصنف افسر علی خان افسر کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے صاحب کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آج مجھے ایک ایسے صاحب قلم کا تعارف پیش کرنا ہے۔ جو عرصہ بیس سال سے دنیائے قلم وعلم کی خاموش خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ میری مراد پشتو، انگریزی، اُردو کے شاعر ادیب اور کالم نگار افسر علی خان افسر سے ہے۔ جو ایک خطرناک اور خوفناک سرکاری محکمے کا بڑا افسر ہے مگر دیکھنے میں معصوم مظلوم اور دکھی کا گھڑا ہے۔ ایسا کہ اس پر کسی بھی محکمے کے افسر ہونے کا گماں نہیں ہوتا۔ سیدھا سادا شائستہ، شریف، صحافی، قلم کار، اور دانشور نظر آتا ہے۔ دبلا پتلا، نازک نفیس، غیر مولویانہ حبشہ کا یہ آدمی پہلی ہی نظر میں بھلا لگتا ہے''۔ (۱۳)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے کتاب کے معیار کو پرکھنے کے لیے ایک پیمانہ مقرر کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر ظہور ایک ترقی پسند قلم کار ہیں اور ترقی پسندی وہ معیار ہے جو ڈاکٹر اعوان کے نزدیک کسی کتاب کا ایک ایسا وصف ہے اپنے پڑھنے والوں کو روشن خیالی اور اعتدال پسندی سے آگاہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر ظہور اعوان کی پوری دنیا کی صورت حال پر گہری نظر ہے۔ ایک بے مثال دانشور کی حیثیت سے انھوں نے اپنے کالموں میں بین الاقوامی امور پر لکھی ہوئی جن کتابوں پر کالم لکھے گئے، ان میں بھی یہ وصف ہے کہ وہ سماج کو بدلنے اور اسے ترقی پسند اور روشن خیال اعتدال پسند کی سوچ کو فروغ دیتی ہے۔ سید سبط حسن اُردو کے ایک ایسے دانشور ہیں جن کی فکر و سوچ ترقی پسند پھوٹتی ہے۔ ڈاکٹر اعوان اپنے کالم ''شاہ عنایت ترقی پسندی اور سبط حسن'' میں سبط حسن کی کتابوں نوید فکر ماضی کے، ''موسیٰ سے مارکس تک''، ''انقلاب ایران''، ''پاکستان میں تہذیبوں کا ارتقاء'' اور دوسری متفرق تحریروں پر اجمالی نظر ڈالی ہے اور ان کے نظریات کو سراہا ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان لکھتے ہیں:

''انھوں (سید سبط حسن) نے تاریخ کو خوب کھنگالا ہے اور ڈھونڈ ڈھونڈ اور چن چن کر ترقی پسند روشن خیالی اور انسانی عدل و مساوات قربانی وجدوجہد

کے نکتہ سامنے لاتے رہتے تھے''۔(۱۴)

ترقی پسند نظریۂ ادب کے پرچار کے لیے ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے اپنے ادبی کالموں میں ترقی پسند مصنفین کے ارتقاء پر گاہے بگاہے کالم لکھتے ہیں۔ معروف ترقی پسند شاعر ادیب فارغ بخاری کی ادبی خدمات کے اعتراف میں نوید شبلی کی لکھی ہوئی کتاب ''فارغ بخاری عہد ساز شخصیت'' پر لکھا ہوا کالم بھی ایسا ہی ہے۔ جس میں انھوں نے کتاب کی جملہ جہتوں کو زیر بحث لا کر قاری کو اپنے مطالعے میں خوب صورتی سے شریک کیا ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں بہت سی نئی باتیں ہیں۔ فارغ فارغ کیوں بنا۔ پشاور کی وہ الھڑ دوشیزہ فارغ اس وقت کہاں ہوگی۔ جس کے عشق میں وہ ساری عمر کے لیے فارغ بن گیا تھا۔ لندن کی بیس سالہ نورا کہاں ہوگی جس کے عشق میں فارغ ستر سال کی عمر میں بیس سال کا فارغ بن گیا تھا۔ شبلی نے اتنے بڑے آدمی پر قلم اٹھا کر اہل علم وادب کی توجہ اس طرف دلاتی ہے''۔(۱۵)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان ایک جرأت مند بہادر اور دلیر کالم نگار ہیں۔ وہ صوبہ سرحد کی پختون روایات کے علمبردار اور پاسدار ہیں۔ وہ ایک کھرے کالم نگار ہیں۔ وہ اپنی کالموں میں کتابوں پر فقط تحسین آمیز تبصرے نہیں لکھتے۔ بلکہ کتاب کی خامیوں پر بھی نظر دوڑاتے ہیں۔ شعبۂ اُردو پشاور یونیورسٹی کی پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین ڈاکٹر ظہور اعوان کی کالم نگاری کی اس جرات کو سراہتے ہوئے لکھتی ہیں:

''۔۔ ہماری ساری خود فریبیاں، قول وفعل میں تضاد، قومی معاملات سے بے اعتنائی، معاشرتی بے حسی، سماجی منافقتیں، نمود و نمائش کی خواہش، ابتر انتظامی حالات، سیاسی دھوکے غرض زندگی کے ہر شعبے کی ناہمواریاں ظہور صاحب کے قلم

کی زد میں ہیں اور یہی بوقلمونی ان کے کالموں کی مقبولیت کی اصل وجہ ہے۔۔۔ڈاکٹر
ظہور احمد اعوان معاشرتی ناہمواریوں کا گہرا شعور رکھنے والے دردمند حساس فنکار
ہیں۔ان کی نظر سے چھوٹی بڑی کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں رہتی''۔(۱۶)

ڈاکٹر اعوان کے درج بالا فکری وفنی محاسن کا اظہار ان کے کئی ادبی کالموں میں ہوتا ہے۔خاص طور پر شاعر مشرق علامہ اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال کی آپ بیتی ''اپنا گریباں چاک'' پر لکھا ہوا کالم ہے۔ادبی کالم کی روایت میں یہ ایک یادگار کالم ہے۔ڈاکٹر اعوان نے حقائق کے ترازو میں اس کتاب کو تولا ہے اور خوب باریک بینی سے اس کتاب کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے اپنے شگفتہ اُسلوب میں کتاب کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کیا۔یہ ڈاکٹر اعوان کی کالم نگاری کا اعجاز ہے کہ پانچ سو صفحات کی اس کتاب کو اختصار کے جامع میں اس ہنرمندی سے اپنے کالم میں سمیٹا ہے کہ کتاب کی جملہ جہتیں قاری کی نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔کتاب کا پہلا ہی پیراگراف قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے:

''علامہ ڈاکٹر محمد اقبال شاعر مشرق واسلام کے ایک فرزند لاہور میں پائے جاتے
ہیں۔ڈاکٹر جاوید اقبال اپنے باپ جتنے ہی تعلیم یافتہ ایم اے، پی ایچ۔ڈی،
بارائٹ لاء، برطانیہ ویورپ کے پڑھے ہوئے لاہور کے سابق چیف جسٹس،
ممتاز قانون دان وکیل اور اقبال پر کئی کتابوں کے مصنف، اقبال کی سوانح
''زندہ رود'' کے نام سے تین جلدوں میں لکھ کر ادبی نام کما چکے ہیں۔اب
حضرت ایک عدد ذاتی سوانح عمری ''اپنا گریباں چاک'' کے عنوان سے لے کر
سامنے آئے ہیں۔لاہور سے چھپنے والی اس تازہ کتاب کی قیمت ۶۰۰ ہے۔
صفحات چار پانچ سو ہیں۔جبکہ تصاویر کی تعداد سو سے زیادہ ہے''۔(۱۷)

اسی پیراگراف میں انھوں نے اپنے طنزیہ اُسلوب میں کتاب پر تنقید کی ہے اور لکھا ہے۔

''۔۔۔۔۔زیادہ تر تصاویر انتہائی بد ذوقی کی علامت ہیں۔ تین چار تصویروں میں تو صرف ایک موٹر کے ساتھ اور سامنے کھڑے ہیں اور عنوان لگایا ہے کہ ''ڈاکٹر جاوید اقبال یورپ میں مزے کر رہے ہیں''۔ یورپ و امریکہ میں موٹریں جھک مارتی پھرتی ہیں۔ لوگ سڑکوں پر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ کوئی لے جانے والا نہیں ہوتا کئی تصویروں میں حضرت میموں کے جھرمٹ میں کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی ان کا خیال ہے کہ وہ یورپ میں مزے کر رہے ہیں۔ یورپ و امریکہ میں موٹروں کی طرح عورتیں بھی نیم برہنہ لباس میں سڑکوں پر ماری ماری پھرتی ہیں۔ ان کے ساتھ تصویر نکلوانا کوئی کمال نہ ان کو اہل کتاب میں شامل کر کے مسکرانا کوئی کمال کتاب کے اندر ڈاکٹر صاحب نے جو گل افشانیاں کی ہیں ان کے بارے میں اظہار خیال نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کو افسوس ہے تو اس بات کہ لوگ انھیں ان کے والد علامہ اقبال کے حوالے سے کیوں جانتے اور پہچانتے ہیں''۔(۱۸)

اسی کالم میں انھوں نے جاوید اقبال سے ان کے والد علامہ اقبال کی ان امیدوں اور توقعات کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو انھوں نے بارہا جاوید اقبال کے نام اپنے خطوط اور شاعری میں کیا ہے۔

ڈاکٹر ظہور اعوان ادبی کالم میں اس انفرادی خوبی کے حامل کالم نگار ہیں کہ وہ جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو کتاب، صاحبِ کتاب اور موضوع کا مکمل احاطہ کرتے ہوئے اپنے قاری کی معلومات میں بھرپور اضافہ کرتے ہیں۔ ''ترک قوم اور علامہ اقبال'' کے عنوان سے لکھے گئے کالم میں ترک قوم کی اقبال دوستی پر نظر ڈالی

گئی ہے اور ترک اُردو دان مصنف ڈاکٹر خلیل طوق آر کی کتاب ''اقبال اور ترک'' کے تناظر میں ترکی میں اقبال شناسی کی روایت کا ذکر کیا ہے۔ اُردو کے ان پڑھ شعراء کے کالم میں شاہ عزیز الکلام کی ان پڑھ شعراء کے بارے میں تحقیقی کتاب پر تبصرہ لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر ظہور اعوان نے پوری کتاب اور خلاصے کو اپنے کالم میں بند کیا ہے۔

''چتراں والا کٹورہ'' اور ''ماں کی یاد میں'' ڈاکٹر سید امجد حسین کی قلمی خاکوں کی کتاب کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسی تناظر میں پشاور کے ماضی پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے ڈاکٹر اعوان نے اُردو ادبی، تاریخی اور سیاسی کتابوں کے علاوہ انگریزی اور پشتو کی ادبی، سیاسی اور تاریخی کتابوں پر بھی تبصرے لکھے ہیں۔

''قفل کلید دریچہ'' میں انگریزی زبان کے صاحب کتاب شاعر اعجاز رحیم کی دو شاعری کی کتابوں The dreamin clayear اور The imprisoned Air کے نام میں ہے۔ اعجاز رحیم پاکستان کے انگریزی شعراء میں صف اول کے تخلیق کار ہیں۔ مذکورہ دونوں کتابوں کے اُردو تراجم بالترتیب ''خواب گر کھلونا'' اور ''گرفتار ہوا''۔ ڈاکٹر ظہور اعوان کے قلم ہی سے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ڈاکٹر ظہور اعوان انگریزی ادب کے بھی ایک لائق و فائق طالب علم ہیں۔ انھیں انگریزی ادب کی روایت کا شعور و ادراک حاصل ہے۔ اس کالم میں بھی ان کی اس علمیت و قابلیت کا عکس جھلکتا ہے۔ اپنے اس کالم میں انھوں نے اعجاز رحیم کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

> ''اعجاز کی شاعری میں ذہانت وعلمیت کی چکا چوند کے ساتھ جذبے کی گہرائی وسچائی مشاہدے وتجربے کی تازگی کا تیکھا پن مل کر ایک ایسی دنیا بساتے ہیں۔ جس میں داخل ہونے والا شخص شرابور مسحور ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے لیے شرط یہ ہے کہ آدمی علم وادب سے گہرا حس رکھتا ہو۔ بظاہر وہ باتیں بڑی سادہ کرتے ہیں۔ مگر اس میں پرکاری ایسی ہوتی ہے کہ بے علم وادب آدمی ان کی تہہ تک نہیں

پہنچ پاتا۔ معمولی کو غیر معمولی بنانا ان کا فن ہے۔ ان کی شاعری اندر کی پہنچ کی آئینہ دار ہے وہ اس وقت لکھتے ہیں۔ جب ان کے اندر بیٹھا شاعر اور درد دل رکھنے والا انسان ان کو اُکساتا ہے۔ پھر جذبے احساسات اور نفسیات بن کر لفظوں میں ڈھلتے اور لفظوں میں بندھتے جاتے ہیں۔ وہ منفرد اور انوکھے موضوعات چنتے ہیں''۔(۱۹)

ان ادبی کالموں میں ڈاکٹر اعوان ایک عالم اور بے بدل نقاد کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی کالموں میں ادبی رجحانات کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے تنقیدی نظریات بھی بیان کئے ہیں۔ ان کا تعلق تنقید کے ترقی پسند دبستان سے ہے۔ انھیں فرسودہ روایات اور قدامت پسندی سے نفرت ہے۔ وہ معاشرے کو مساوات کی بنیاد پر ترقی پسند اور روشن خیال دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ جمہوری ذہن کے دانشور ہیں۔ جنھوں نے ہمیشہ آمریت اور فوجی حکومتوں کے خلاف قلمی اور عملی مزاحمت کی ہے۔ ترقی پسندی ان کی رگوں میں لہو بن کر دوڑتی ہے۔ ترقی پسند نظریہ ان کی راہ بھی ہے، سفر بھی اور منزل بھی۔ ڈاکٹر ظہور اعوان کے کالم ترقی پسند تحریک کے ترجمان بھی ہیں، اور محافظ بھی۔ ہر وہ سچا، کھرا اور انقلابی ترقی پسند شاعر و ادیب ان کا ممدوح ہے جنھوں نے جمہوریت اور روشن خیال ترقی پسندی کے لے ہر خطرہ مول لے کر کام کیا ہے۔ ڈاکٹر اعوان مزاحمتی ادیب ہیں اور مزاحمتی ادب کے پرچارک۔ یہی ہم خیالی اور نظریاتی وابستگی ہے کہ انھوں نے اپنے کالموں میں بارہا نامور ترقی پسند شاعر احمد فراز کے فکر و فن کو سراہا ہے اور جمہوریت کی تحریک میں ان کی قربانیوں کا اعتراف کیا ہے۔ احمد فراز کے فکر و فن کو سراہتے ہوئے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

''احمد فراز دور جدید کا ایک بڑا ادبی نام ہے۔ اس نے اپنا مقام محنت و محبت اور خدمت کے ہفت خواں طے کر کے خود نصف صدی کے عرصے میں بنایا ہے۔ اس کی

باتیں دل سے نکلی ہیں اور دلوں میں گھر کر گئی ہیں۔ رومانیت جسے انقلاب تک کا راستہ اس نے دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں کے سامنے طے کیا ہے۔ جب لوگ چھپ کر اور دروازہ بند کر کے اخبار پڑھتے تھے احمد فراز اس وقت کھلے میدان میں سوہنی دھرتی پر آگ برسانے والوں کو للکار کر خود خبر بن رہا تھا۔ عوام، نوجوان، ترقی پسند روشن خیال، احمد فراز کی باتوں کو اپنی باتیں سمجھتے ہیں۔ اس سے محبت کرتے ہیں۔ جب میٹھی، سریلی، مستانی، رومانی باتیں کرنے والا ان کا محبوب فن کار ایک دن سر پر کفن باندھے کرچی کرچی بدن ان کے سامنے آیا اور انسانی وقار و عظمت کا پھریرا سراتا دکھائی دیا تو وہ محبوب تر ہو گیا۔ یہ مقام رفیع، فراز نے خاصی تپسیا کے بعد پایا ہے۔ احمد فراز اب ایک شاعر کا نام نہیں ایک مشن ہے۔ ایک ہاؤس ہولڈ نیم ہے فراز نے اپنے ڈکشن خود تشکیل کی اس میں اس کی ذاتی محنت و ریاضت کے ساتھ پشاور، کوہاٹ اور اس کے پہاڑوں کا زر بھی شامل ہے''۔(۲۰)

ڈاکٹر ظہور اعوان شعر و ادب کے دلدادہ ہیں۔ اُردو، پشتو، فارسی اور انگریزی کے شعری ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ شعر شناسی اور شعر فہمی کی تخلیقی صلاحیت ان کے کالموں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ شاعری کی جو اچھی کتاب ان کے ذوقِ سلیم کی تسکین کر لے اس لطف و سرور کو وہ اپنے کالم کے ذریعے اپنے قارئین تک پہنچاتے ہیں۔

ڈاکٹر اعوان کی کالم نگاری کی سفر کا عشروں پر مشتمل ہے اور اس سفر میں انھوں نے عوام کی ایک بڑی تعداد کو ادبی دنیا کے لطف و سرور سے بہرہ ور کیا۔ اُردو شاعری اور ادب کو عوام تک پہنچانا ان کے ادبی مشن کا ایک حصہ ہے۔ ان کالموں میں مرزا غالبؔ، حبیب جالبؔ، فیضؔ، فرازؔ، مقبول عامرؔ اور دیگر نام ور شعراء کرام پر بارہا لکھا گیا اور ان کے اشعار کے برمحل حوالے بھی ملتے ہیں۔ صوبہ سرحد کے شعراء کو اردو دنیا میں انھی کے کالموں کے

توسط سے شہرت ملی ہے۔

صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے ممتاز شاعر جوان مرگ مقبول عامر کے بارے میں ان کا کالم پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کالم ظہور اعوان کے بہترین ادبی کالموں میں شامل ہے۔ بلاشبہ مقبول عامر اُردو دنیا کا جتنا بڑا شاعر ہے۔ ڈاکٹر ظہور اعوان کے زاوایہ نظر نے ان کی بڑائی اور عظمت کو جانچ اور پرکھ کر اپنے کالم میں حسن مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ کالم اپنے پہلے لفظ سے لے کر آخری لفظ تک پڑھنے والے کو اپنے سحر میں رکھتا ہے۔ کالم نگار نے لفظ لفظ چن کر مقبول عامر کے شعری و شخصی فن کی اتنی دلکش تصویر کھینچی ہے کہ پہلی ہی نظر میں دل میں اتر جاتی ہے۔ مقبول عامر کی زندگی پر طائرانہ نظر اور ان کے بارے میں نامور اہل قلم کی آراء کے حوالوں سے کالم ایک دستاویز کا درجہ اختیار کر جاتا ہے۔ مقبول عامر کے شعروں کے انتخاب سے پورا کالم ایک شاعرانہ خوشبو سے معطر ہو جاتا ہے۔ مقبول عامر پر ڈاکٹر اعوان کی بصیرت افروز تنقیدی رائے سے قاری کو مقبول عامر کی شعری عظمت سے آگاہی ملتی ہے۔ ڈاکٹر ظہور اعوان لکھتے ہیں:

> ''بنوں کا رہنے والا پٹھان مقبول حسین شاہ جب مقبول عامر بن کر شاعری کے افق پر نمودار ہوا۔ ایک تو پڑھنے سننے والوں نے کہا کہ ایک نیا ترقی پسند ستارہ طلوع ہو گیا ہے۔ افسوس کہ یہ ستارہ عین جوانی کے عالم میں غروب ہو گیا۔ اس کی شاعری کو بڑے بڑے شعراء فیضؔ احمد ندیم قاسمیؔ حبیب جالبؔ اور احمد فرازؔ نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان کے کلام کی نمایاں بات یہ ہے کہ خلاؤں میں پر مارنے کے باوجود ان کے قدم زمین سے پیوست ہیں یہی وہ ہنرمندی ہے کہ رومانی لہجے کے باوصف وہ عہد حاضر کے مسائل انسانی رشتوں کی حرمت اور اپنی مٹی سے محبت سے سرشار ہیں مقبول کی شاعری کا ایک ایک مصرعہ ان کے فن و فکر کی

پختگی اور کمال و ہنر کی تصویر و تنویر ہے مقبول عامر کے ہاں خوب صورت نظمیں بھی
ملتی ہیں۔نیلسن منڈیلا، بنجمن، مولائس اور باچا خان کے بارے میں اس کی نظمیں
پڑھنے کے لائق ہیں''۔(۲۱)

شعر پارے کو اپنے کالم میں موضوع بحث بناتے وقت ڈاکٹر اعوان اسے اعلیٰ ادبی اصولوں پر پرکھتے ہیں۔ وہ رسمی اور روایاتی تنقید کے خوشہ چین نہیں بلکہ وہ، مطالعہ اور تنقیدی بصیرت کے سنگم پر فن پارے تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ ضمیر کی روشنی میں فن پارے کے محاسن و معائب کا تجزیہ کرتے ہیں۔ان کی اسی خوبی کو سراہتے ہوئے ممتاز شاعر، ڈراما نگار، ادیب اور کالم نگار یونس قیاسی لکھتے ہیں:

''وہ علم و ادب سے وابستگی اختیار کیے ہوئے ہیں اور کتنا پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ان کے کالموں میں ناغہ نہیں آتا.کالموں کے علاوہ دوسری تخلیقات سے بھی فارغ نہیں ہوتے کتابیں لکھتے ہیں۔کتابیں پڑھتے ہیں۔کالم نگاری ان کا شوق اور مشغلہ ہے پھر ان کی کالم نگاری بھی ایسی ویسی کالم نگاری نہیں۔ یہ کوئی عام سی کالم نگاری ہوتی تو وہ اپنے مداحوں کو اتنا بڑا اور وسیع حلقہ پیدا نہ کرتے۔وہ اپنے قلم کے ذریعے جہاں عوام کے دلوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔وہاں اپنے دل کی بات بھی قلم کی نوک سے صفحۂ قرطاس پر لانے میں خوف محسوس نہیں کرتے ہیں۔منافقت نہیں کرتے دل کی بات دل میں رکھ کر قلم کے ذریعے چاپلوسی اور خوشامد کے قائل نہیں وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر کہہ اور لکھ جاتے ہیں''۔(۲۲)

یونس قیاسی کی اس رائے کو نظریاتی زاویے سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی نظریاتی پختگی اور ثابت قدمی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔وہ ایک نظریاتی ادیب ہیں۔مٹی سے محبت ان کی سرشت میں ہے۔وطن سے وفاداری

ان کے ایمان کا حصہ ہے۔ انھوں نے اسی جذبے کے پاکستانی ادب کی روایت کو آگے بڑھایا۔ وہ پاکستان کے نظریاتی اہل قلم قافلے میں صف اول میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اپنے خاص ادبی اُسلوب میں انھوں نے پاکستانیت کو اجاگر کیا۔ پاکستان ان کے نزدیک محض زمین کا ایک ٹکڑا نہیں۔ ایک نظریہ ہے۔ انھوں نے دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ امریکا، انگلینڈ اور یورپ میں ان کو سفر کا موقع ملا ہے۔ لیکن وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے وطن اپنی مٹی اپنی تہذیب اور اپنے لوگوں کو نہیں بھولے۔ وفا کی یہ مثالیں ادبی دنیا میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں کہ ایک قلم کار امریکا اور یورپ میں عیش وعشرت کی زندگی کو ٹھکرا کر اپنے وطن لوٹ آئے۔ اپنے ادبی کالموں میں بھی وہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ اُردو پاکستان اور یہاں کی تہذیب وثقافت اور ادب کے روشن مستقبل کے لیے بھرپور ادبی معرکہ آرائی کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اُردو سے محبت کا جوش وخروش ان کے ادبی کالموں کی روح ہے۔ اپنی ایک کالم بعنوان ''قصہ اب اُردو کو پاکستان سے باہر نکالنے کا'' میں لکھتے ہیں:

> ''حال ہی میں سرحد اسمبلی نے صوبہ سرحد کا نام پختونخوا رکھنے کے حق میں ایک قرارداد منظور کی جس پر سرحد کے پختون بھائیوں نے بجا طور پر مسرت کا اظہار کیا جو ان کا حق بنتا ہے۔ تاہم اس دوران اور اس فضا سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کچھ انتہائی متعصب اور تنگ نظر لوگوں نے پاکستان اور اس کی بنیادوں پر حملہ آور ہونا شروع کر دیا ہے۔ کہ اُردو زبان چونکہ ہماری زبان نہیں اس لیے اسے ہی پاکستان سے باہر کر دینا چاہیے۔ حیرت ہے اُردو اگر پاکستان کی زبان نہیں ہے، ہندوستان کی زبان نہیں ہے، تو پھر کس کی زبان ہے۔ اقوام متحدہ نے اس کو دنیا کی تیسری چوتھی بڑی زبان کیوں قرار دیا۔ اُردو پاکستان کی قومی زبان ہے۔ قائداعظم کی مادری زبان اُردو نہ تھی۔ لیکن انھوں نے اسے پاکستان کی قومی

زبان قرار دیا۔ اُردو علامہ اقبال، علامہ مشرقی، مولانا مودودی کی زبان ہے۔
دنیا میں سب سے زیادہ مذہبی لٹریچر اُردو زبان میں موجود ہے۔ پاکستان کی سب
زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں سے اردو زبان میں شائع ہونے والی
کتابوں کی تعداد زیادہ ہے''۔ (۲۳)

اُردو زبان کا دفاع ڈاکٹر اعوان کے ادبی کالموں کا ایک اہم موضوع ہے۔ جب بھی اور جہاں بھی انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وفاق پاکستان کی علامت اُردو زبان کے خلاف سازش ہو رہی ہے وُہ دفاع اُردو کا محاذ سنبھال لیتے ہیں۔ ان کے کالم درحقیقت اردو تحریک کی ایک تشکیل ہیں۔ اپنے کالموں میں وہ جذباتیت کا شکار ہو کر اُردو کا دفاع نہیں کرتے بلکہ منطق اور دلیل کی کسوٹی پر تاریخ کے تناظر میں اُردو زبان کی صفات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اپنے ادبی کالموں میں جس ہنرمندی سے انھوں نے اُردو زبان کی تاریخ اور تعلیمی اور ادبی روایت کے ذریعے اُردو زبان کے حق میں راہیں ہموار کی ہیں۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر اعوان نے تاریخی دلائل کے ساتھ اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ اُردو ہندوستان کے طول وعرض میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ ایک سندھی اگر پنجاب سرحد بلوچستان آئے تو وہ مقامی لوگوں سے اُردو ہی میں بات کرے گا اسی طرح اگر ایک پختون جب دوسرے صوبوں میں جائے گا تو وہ اُردو ہی کو وسیلہ اظہار کے طور پر اپنائے گا۔ سچ ہے کہ برصغیر کے ایک ہزار سالہ مسلم اقتدار نے دو عظیم ترین نشانیاں ظہور پذیر کی ہیں۔ ایک اُردو زبان اور دوسری پاکستان۔ سچ یہ ہے کہ اُردو کے توسط سے ہی پاکستان ظہور پذیر ہوا ہے۔ برصغیر کے ہر بڑے سیاسی، مذہبی، ثقافتی لیڈر کو اردو کو ہی ذریعہ اظہار بنانا پڑا۔ کیونکہ اسے برصغیر کے سب عوام الناس کو ساتھ لے کر چلنا تھا۔ ڈاکٹر اعوان اس اُردو دشمنی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ قوم پرستوں کا کہنا ہے کہ اُردو پاکستان کی زبان نہیں نہ اسے یہاں سمجھا جاتا ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو ایک ایک بڑا اُردو اخبار روزانہ دس دس لاکھ کی تعداد میں کیوں کر چھپتا ہے۔ اُردو زبان کے دفاع

میں ان کا ایک قومی انگریزی اخبار کے کالم نگار سے معرکہ بھی چلا جیسے اُردو دنیا میں خوب خوب پذیرائی ملی۔ اس ادبی معرکے میں ڈاکٹر اعوان اپنے مدلل انداز کے سبب سرخرو ہوئے اپنے ایک کالم میں انھوں نے اُردو دشمن کالم نگار کی خبر لیتے ہوئے لکھا:

"۔۔۔ملک سے اُردو کو ہٹا کر انگریزی کو رائج کرنا چاہیے کہ انگریزوں کی زبان ہے اور اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ ہمیں اُردو پڑھنے کی جگہ آرکیالوجی پڑھنی چاہیے۔ مگر اُردو کا نام ونشان مٹا دینا چاہیے۔ یہ اور اس قسم کے خیالات انگریزی اخبار کے ایک کالم نویس بے شمار دنوں سے مسلسل اس ملک کے انگریزی پڑھنے والوں کے کانوں میں انڈیل کر اپنی روشن خیالی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ موصوف نے تازہ ترین کالم میں دانش وحکمت کے نئے موتی پروئے ہیں۔ پڑھنے کے لائق ہیں فرماتے ہیں۔ پختون اُردو نہیں پڑھتے نہ ان کو اُردو آتی ہے۔ نہ ان کو پڑھنے سے کوئی فائدہ ہے۔ اگر موصوف اپنی آنکھوں سے تعصب کی عینک اتار کر صرف قوم پرستی کے علاوہ کچھ اور پڑھنے، سننے اور دیکھنے کی طرف متوجہ ہوں تو انھیں معلوم ہو جائے گا۔ اس وقت پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ۹۰ فیصد سے زیادہ لڑکے لڑکیاں پشتو بولنے والے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور خالص پختون ہیں"۔ (۲۴)

اسی کالم میں وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ صوبہ سرحد میں اُردو زبان اجنبی زبان نہیں ۔ جب سے شعبۂ اُردو قائم ہوا ہے۔ پشتون بچوں اور بچیوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ وہ ایم فل اور پی ایچ۔ڈی کرر ہے ہیں۔ اسی وقت صوبہ سرحد کے بچوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں اُردو پڑھانے والے اساتذہ نوے فیصد تعداد پشتو بولنے

والوں کی ہے۔اُردو کے پختون سکالرز غیر پختون سکالرز سے زیادہ اُردو زبان ادب ولٹریچر کو سمجھتے ہیں۔ان سے اچھا بولتے ہیں۔ڈاکٹر ظہور احمد اعوان اُردو کی خوبیاں گنواتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کہ اُردو کوئی مشکل زبان نہیں کراچی میں رہنے بسنے والے پچیس تیس لاکھ پختون بہت اچھی اُردو بول لیتے ہیں۔ان کے بچے تو اہل زبان سے اچھی اور بامحاورہ اُردو بولتے ہیں''۔(۲۵)

ڈاکٹر ظہور اعوان نے آئینی حوالے سے اُردو کے استحقاق پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ جائز مطالبہ کیا ہے کہ اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔اُردو میں اسلام، تاریخ، ادب سائنس وٹیکنالوجی، اخبارات اور دیگر بے شمار طرح کی کتابیں اور رسائل چھپ رہے ہیں۔

اُردو زبان کے حق میں ڈاکٹر اعوان کی معرکہ آرائی کے علاوہ معروف دانشور ادیب اور کالم نگار ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی سے بھی ادبی معرکہ آرائی کی ہے ڈاکٹر فیضی نے ظہور احمد اعوان کی تحقیقی وتنقیدی کتاب ''اقبال ومشرقی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے صاحب کتاب کے بارے میں کچھ ذاتی قسم کے منفی ریمارکس پاس کیے۔ظاہر ہے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ذاتیات پر اتر آئے۔ڈاکٹر اعوان نے اپنے کالم ''حدیث دیگراں'' میں عنایت اللہ فیضی کے تبصرے کے جواب میں لکھا:

''ڈاکٹر فیضی نے میرے بارے میں کچھ نیک خواہشات کا اظہار اپنے ایک حالیہ کالم میں میری کتاب کے حوالے سے کیا۔میرے کتاب ''اقبال ومشرقی'' کے حوالے سے انھوں نے میری ذات کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کے اپنے خوب صورت ذہن کا عکاسی ہے۔عیاں راچہ بیاں مجھے ان کی زبان میں گفتگو کا کافی یادا بھی حاصل ہے کہ اس شہر کا روڑا ہوں گلیوں تھڑوں کی زندگی کے

اتار چڑھاؤ سے لے کر لب و لہجے تک سب سے بخوبی آگاہ ہوں اور پھر گالیاں
دینا کسے نہیں آتا۔ دنیا کا سب سے آسان کام یہی ہے۔ انھوں نے کسی چنگیز خان
کی ایک تحریر کو سامنے رکھ مجھے جو منہ بھر بھر گالیاں دی ہیں۔ میں اس کے لیے بھی
ان کے حق میں دعائے خیر ہی کروں گا۔ گالیوں کے جواب میں گالیاں دینا وہ بھی
پبلک سطح پر کالموں کی صورت میں یہ میرا شیوہ ہے نہ مزاج۔ کالم ہمارے پاس
ضمیر، قارئین اور اخبار کی امانت ہے۔ اگر ڈاکٹر فیضی یا کسی بھی دشنام طراز کی
لب کشا ہوں اور دراز نفسیوں کا جواب دینا ہوا تو براہ راست آمنے سامنے،
گریباں میں ہاتھ نہ سہی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سڑک اور بازار میں بھی دیا
جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر فیضی صاحب سے گزارش ہے کہ نا معلوم وجہ سے کسی غصے یا
تعصب و حسد میں اس قدر مبتلا نہ ہوں کہ حقیقت اور منطق و دلیل کو فراموش کر
دیں۔ ڈاکٹر فیضی فرطِ غیض میں اس نابکار کالم نویس کو اپنی دشنام ہائے بے جا کی
دھارے پر رکھنے سے قبل اتنا بھی نہ غور فرما سکے کہ چنگیز خان کے نام پر شائع
ہونے والی تحریر میرے قلم سے نکل ہی نہیں سکتی۔'' (۲۶)

ڈاکٹر ظہور اعوان انسان دوستی اور ترقی پسندی کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں اور اسی نظریے کے مطابق ان کی زندگی گزری اور ادبی تخلیقات وجود میں آئیں۔ انھوں نے اپنے کالموں میں بتان رنگ و خون توڑے اور تعصب اور نفرت سے پاک معاشرے کے قیام پر زور دیا۔ اسی مثبت فکر کا اثر ہے کہ انھوں نے ہمیشہ نظریاتی معرکے لڑے ہیں۔ اور ادب کو جمہوری معاشرے اور انسان دوست رویے کے فروغ کا ذریعہ سمجھا۔ پروفیسر اقبال پراچہ اپنے مضمون ''ڈاکٹر ظہور احمد اعوان اور کالم نگاری'' میں لکھتے ہیں:

''ان کا کالم اور ذہن انھی کے لیے سوچتا اور لکھتا ہے۔ وہ اپنے کالم کے ذریعے
سماج کے ظالم طبقات کے خلاف ایف۔آئی۔آر چاک کرتے رہے ہیں۔
انصاف کے دروازوں پر دستکیں دیتے رہتے ہیں۔اندھیروں کو سویروں میں
تبدیل کرنے کے لیے قلم کی روشنی اور روشنائی کاشت کرتے رہتے ہیں''۔(۲۷)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی ادبی کالم نگاری کا ایک انفرادی وصف یہ بھی ہے کہ انھوں نے کئی ادبی اصناف کو کالموں کے ذریعے پروان چڑھایا اور اسے عوامی سطح پر مقبولیت عطا کی جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اب تک آپ کے کالموں کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ جن میں کئی کتابیں ایسی ہیں جن کے بار بار ایڈیشن چھپے۔ ڈاکٹر اعوان نے ادبی کالم میں جن اصناف ادب کے خدوخال اجاگر کیے ان میں سفرنامہ نگاری، خاکہ نگاری، رپورتاژ نگاری، تنقید اور گاہے بگاہے دیگر اصناف شامل ہیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کمال کے خاکہ نگار ہیں۔ آپ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اُردو میں سب سے زیادہ خاکے آپ نے تحریر کیے ہیں۔ اب تک ڈاکٹر اعوان کے خاکوں کے پانچ مجموعے چھپ چکے ہیں۔ جن کے نام ہیں۔''سب دوست ہمارے''، ''حساب دوستاں'' ''سیاسی چہرے''،''چہرہ بہ چہرہ''اور''سر دلبراں''۔ ڈاکٹر اعوان کے ان خاکوں میں اکثریت ان کے ادبی کالموں کے ذریعے اپنے قارئین تک پہنچ کر داد وصول کر چکے ہیں۔ ممتاز دانشور اور ادیب ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی ان کی خاکہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اعوان نے ان خاکوں میں اُسلوب اور انداز بیان کے کئی تجربے کیے
ہیں۔فن خاکہ نگاری کے نقاد ان تجربات پر قلم اٹھائیں گے تو ان کا نام مختلف
اسالیب کے امام کے طور پر جلی عنوانات کا مستحق قرار پائے گا۔کردار کی خامیوں
پر سے پردہ اُٹھانا اور خوبیوں کو چن چن کر بیان کرنا آساں ہے۔مگر خامیوں کو

خوبی کے پردے میں حسن بیاں سے مزین کر کے ایک 'پنتھ دوکاج'' کا مصداق
بنانا کوئی ڈاکٹر اعوان سے سیکھے۔'' (۲۸)

ڈاکٹر اعوان کے ادبی کالموں میں شامل شخصی خاکوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خاکہ نگار گہرے قوت مشاہدہ اور مردم شناسی کا جوہر رکھتا ہے۔ جراتِ اظہاران خاکوں کا حسن ہے۔فن خاکہ نگاری کے لیے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ خاکہ نگار میں شخصیات کی باطنی ونفسیاتی کیفیات کو جھانکنے کی صلاحیت موجود ہو۔ایک بہترین خاکہ نگار وہی تخلیق کار بن سکتا ہے۔ جو ماہر نفسیات ہو۔ کیونکہ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں۔ وہاں پر دوسرے شخص نے اپنے چہرے تلے کئی چہرے چھپائے ہوتے ہیں اور یہ ایک خاکہ نگار کے فن کی آزمائش ہے کہ وہ کس مہارت کے ساتھ اس اصلی چہرے تک پہنچتا ہے جو سارے زمانے کی نظروں سے چھپا رہتا ہے۔ڈاکٹر اعوان کا فن اس آزمائش میں پورا اترتا ہے۔انھوں نے بڑی چابکدستی سے ان چہروں تک رسائی حاصل کی اور اسے خاکے میں بیان کرنے کی ہمت کر ڈالی۔ مثال کے طور پر وہ اپنے رفیق کار اور استاد شعبہ اُردو پشاور یونیورسٹی ڈاکٹر نذیر تبسم کے خاکے ''راجہ اندر'' میں لکھتے ہیں:

''دیوہیکل سونے تک قوی ہیکل، جثہ شاعروں سے زیادہ پہلوانوں جیسا مگر انچ انچ پور پور شاعر۔ خوب صورت لہجے کا۔ اول درجے کا حسن پرست رومان دوست ۔۔۔ جوان اور حسین نسوانی چہروں سے اسے فی سبیل اللہ کا عشق ہے۔ چاہے اس کے طلباء ہی کیوں نہ ہوں اور یہ چہرے ہوتے ہی طالبات کے ہیں۔ جہاں آدھی سے زیادہ لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ حسن والے تبسم کی جان کا روگ ہیں۔ جہاں حسین چہرہ دیکھا تبسم کھلا اور کھلایا''۔ (۲۹)

ڈاکٹر اعوان کے خاکوں میں ایک افسانویت وواقعیت ملتی ہے۔ وہ بڑے افسانوی انداز میں کسی شخصیت

کے گرد واقعات اور کہانی بنتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں ترتیب و آہنگ کے ساتھ اپنے خاکے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ بات سے بات نکالتے اور شگفتہ لہجے میں خامیوں اور کوتاہیوں کی طرف لطیف انداز میں اشارے کرنا ان کے فن کا خاصا ہے۔ وہ مجموعی تاثر کچھ اس اہتمام کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ متوازن انداز میں خوبیاں اور خامیاں پہلو بہ پہلو ساتھ چلتی ہیں۔ فن کی یہ ندرت قاری کو دلچسپی کے حصار میں لیتی ہے اور وہ پورے خاکے سے خوب حظ اُٹھاتا ہے۔ وہ ممتاز ترقی پسند شاعر اور دانشور جوہر میر کے خاکے میں لکھتے ہیں:

''ان کا ذہن اس قدر زرخیز ہے اور قلم اتنا بلاخیز ہے کہ رفتار میں گھوڑوں اور راکٹوں کو بھی پیچھے چھوڑ جائے۔ پاکستان کا کوئی اخبار نویس اور اداریہ ساز ان سے زیادہ الرٹ اور بیدار نہیں ہے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک خبر پاکستانی خبر نامے میں رات نو بجے نشر ہوئی۔ دوسری صبح اخبار میں اس خبر کو بنیاد بنا کر ایک بھر پور جامع اور مکمل تجزیہ جوہر میر چھپ گیا ہے۔ ایسی نگاہ پاکستان کے اندر رہنے والے کسی سیاسی مدیر کو بھی میسر نہیں ہے''۔(۳۰)

ڈاکٹر اعوان کی خاکہ نگاری ایک فطری بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھی ہے وہ شعوری کوشش اور تکلف سے خاکہ نہیں لکھتے اس لیے ان کے خاکے تصنع اور بناوٹ سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ موقع محل کے مطابق حلیہ نگاری سے بھی اس مہارت سے کام لیتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے پوری تصویر پھر جاتی ہے۔ ان کا یہ فنی وصف انھیں اُردو کے عظیم ترین خاکہ نگاروں کے صف اول میں شامل کرتا ہے۔ حلیہ نگاری کے لیے جس باریک نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے ڈاکٹر اعوان میں وہ قدرتِ فن بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر پروفیسر شوکت واسطی کے خاکے میں ان کا حلیہ یوں بیان کیا گیا ہے:

''واسطی صاحب بھاری بھرکم، لحیم وشحیم وجیہ وضع کے آدمی ہیں۔ نقش و نگار کے

تیکھے پن میں صاف رنگت کبھی مباحث کا اعلان تھی تو اب آفتاب کی گزیدگی کے
کارن ملاحت کا میلان بن گئی ہے۔ اونچا نکلتا ہوا قد ۱۰ سال کم، سمارٹ مائل بہ
فربی جسم، آنکھوں میں ذہانت، شرارت بولتی ہوئی، چہرے کے چٹیل میدان پر
عینک اور اس کے محدب شیشے علم وفن کے شوکیس سجائے ہوئے، چال میں متانت،
کمر میں خم نہ چہرے پر تھکن، انگریزی لباس کے اوڑھنے بچھونے میں سجے
سجائے واسطی صاحب ایسے صاف ستھرے دھلے دھلائے آدمی ہیں کہ لگتا ہے
ابھی لانڈری سے نکلے ہیں''۔(۳۱)

خاکہ نگاری کو ادبی کالم میں سمونا ڈاکٹر اعوان کا منفرد مگر کامیاب تجربہ ہے بالعموم اخبار کے قاری سچ پڑھنا چاہتے ہیں اور خاکہ نگاری کے فن میں سچائی ہی روح کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر اس میں خوبیاں ہی خوبیاں بیان کی جائیں اور مدح و تحسین ہی مطمعِ نظر ٹھہرے تو پھر اسے قصیدہ تو کہا جا سکتا ہے خاکہ نہیں۔ خاکے فن کا یہی شعور ڈاکٹر اعوان کی خاکہ نگاری سے جھلکتا ہے۔

اُنھوں نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر من وعن سچائی کو خاکے میں سمیٹ لیا ہے۔ اگر چہ یہ حقیقت اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتی ہے کہ سچائی ہمیشہ تلخ اور کڑوی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان فطری طور پر خود پسند ہے۔ ڈاکٹر اعوان نے خاکے کے اصولوں کو پامال نہیں کیا تاہم انھوں نے ندرتِ فن کا یہ جلوہ بھی دکھایا ہے۔ کہ سچائی کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ جس کا ماہرانہ اظہار خاطر غزنوی کے خاکے میں ہوتا ہے:

''خاطر صاحب غصے کے بڑے تیز ہیں۔ جتنا جلد ان کو غصہ آتا ہے۔ اتنی ہی جلد
اتر بھی جاتا ہے مگر اس غصے کے آفٹر شاکس کافی عرصے تک باقی بھی رہ جاتے
ہیں۔ غصے کے ساتھ جذبوں کا بھی ایک منہ زور طوفان ان کے اندر ہمہ وقت

انگڑائیاں لیتا رہتا ہے۔ جو بھک سے جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑنے کے لیے
بیتاب رہتا ہے۔ اگر ان کے غصے اور جذبے کا وافر حصہ تخلیقِ عمل میں گھس کر خرچ
نہ ہو جائے تو خاطر صاحب قدم قدم پر فوجداریاں کرتے نظر آئیں''۔(۳۲)

''کوہاٹ کا روڑا'' کے عنوان سے لکھے گئے خاکے میں ان کے فن کی یہ روشن جہت سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر اعوان اپنے خاکے میں صاحب خاکہ کو انسان کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ نہ کہ فرشتے کی کسی معصومیت کے رنگ میں۔ ظاہر ہے انسان غلطی اور کمزوریوں کا پتلا ہے تاہم انھوں نے مثالی انسانی اوصاف کو بھی کھل کر بیان کیا ہے اور اسے بنیادی انسانی وصف کے روپ میں پیش کر کے انسانی عظمت کا روشن چہرہ دکھایا ہے۔ مزاحمتی و ملامتی شاعر کے عنوان سے فارغ بخاری کے خاکے میں یہ ہنر اجاگر ہوتا ہے۔ اس خاکے میں فارغ بخاری کی شخصیت ترقی پسند نظریات اور ان کے آدرشوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اور موقع محل کے مطابق فارغ بخاری کی شاعری سے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اعوان لکھتے ہیں:

''فارغ بخاری عجیب و غریب خصوصیات کا مجموعہ ہیں۔ خوش لباس، خوش اطوار، خوش گفتار ہر ایک سے فوراً بے تکلف ہو جانے والے ہر ایک پر اعتبار کرنے والے ہر ایک کو اچھا سمجھنے والے فارغ ایک طرفہ تماشا ہیں۔ فارغ ہمیشہ بنے ٹھنے رہتے ہیں۔ بالوں کو کبھی سفید اور دل کو کبھی سیاہ نہیں ہونے دیا۔ سوٹ بوٹ سے زیادہ واسطہ رکھتے ہیں۔ دیسی لباس کو کم ہی گھاس ڈالتے ہیں''۔(۳۳)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے ادبی کالموں میں جتنے خاکوں کو سمیٹا ہے وہ حسن اختصار کی خوبی لیے ہوئے ہیں۔ کالم اختصار کی خاص قیود و حدود کا پابند ہوتا ہے اور اس میں تفصیل کی گنجائش نہیں رہتی۔ ڈاکٹر اعوان نے ادبی کالم کے خاص فریم میں صاحبان خاکہ کی تصویریں اس مہارت سے سجی نظر آتی ہیں کہ اس کے سارے رنگ شوخی و رعنائی کے

عکاس بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اعوان چھوٹے چھوٹے جملوں اور لفظوں سے صاحب خاکہ کے اندر و باہر کی دنیا کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ پروفیسر گل ناز اس حوالے سے لکھتی ہیں:

''ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کا شمار جدید خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ نہ صرف زود نویس بلکہ بسیار نویس ادیب ہیں۔ اب تک درجنوں شخصیات کو اپنی کتابوں کے سکرین پر ان کے ظاہر و باطن، مثبت و منفی، روشن و تاریک پہلوؤں کے ساتھ انتہائی جاندار لب و لہجے سے حقیقت پر مبنی واقعات کے ساتھ زندہ متحرک صورت میں پیش کر چکے ہیں۔ خاکہ جن فنی لوازمات کا متقاضی ہے یعنی حلیہ نگاری، واقعہ نگاری، وحدت تاثر، غیر جانبداری، شگفتگی اُسلوب اور شخصیت کی جاندار عکاسی وغیرہ یہ سبھی عناصر آپ کے خاکوں میں کم و بیش توازن اور تناسب کے ساتھ ملتے ہیں۔ آپ نے شخصیات کے اتنے مکمل اور جامع حلیے پیش کیے ہیں کہ اکثر اوصاف آپ کے پیش کردہ حلیوں سے ہی شخصیت اصلیت کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے''۔ (۳۴)

ڈاکٹر ظہور اعوان اُردو کے واحد کالم نگار ہیں جو کئی برسوں سے روزانہ کالم لکھتے آ رہے ہیں۔ یہ ایک مشکل کام ہے اور یہی وجہ ہے کہ دور دور تک کوئی کالم نگار ان کی ہم سری کرتے دکھاتے نہیں دے رہا۔ ظاہر ہے روزانہ کالم لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے قاری کے لیے دلچسپ بنا کر پیش کیا جائے اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ کالم نگار اپنے کالم کو موضوعاتی یکسانیت سے بچائے اور انھیں دلچسپ اور تر و تازہ صورت میں پیش کرے۔ ڈاکٹر اعوان کے کالموں میں موضوعاتی جہان آباد ہوتا ہے اور اسی خوبی کی وجہ سے ان کے کالم دلچسپ ہوتے ہیں وہ کبھی شخصیات پر قلم اُٹھاتے ہیں اور کبھی علمی و ادبی موضوعات پر خاص طور پر اپنے ادبی کالم میں خاکے کو سموتے وقت ان کا یہ فن

نمایاں طور پر سے محسوس ہوتا ہے۔ اس کے اعتراف میں اُردو کے معروف نقاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اعوان کی تحریر کا یہی وصف ہے جو مجھ سے ساڑے پانچ سو صفحات کی کتاب (حسابِ دوستاں) کو دو مختصر نشستوں میں پڑھوانے لے گیا اور ایک سو شخصیات کے حوالے سے تعلیمی، سماجی اقدار، سیاسی ماحول اور ادیبوں کی زندگی ونفسیات کے بارے میں اتنا کچھ دیا گیا۔ کہ درجنوں کتابوں کے مطالعے سے میسر نہ آتا۔ یہی نہیں کہ اس کتاب نے مجھ ایسے متعدد اہل قلم سے متعارف کرا دیا جن سے میں بالکل واقف نہ تھا اس کتاب نے مجھے سیراب وشاداب کیا معلومات کی سطح پر بھی فکر واحساس کی سطح پر بھی''۔ (۳۵)

ڈاکٹر اعوان کے خاکوں کی دلچسپی ودلکشی میں ان کے جانداروں اور پر کشش اُسلوب کا بنیادی کردار ہے خاکے کے حسن کو دوبالا کرنے میں خاکہ نگار کی زبان وبیان پر مہارت ضروری ہے۔ اُسلوب میں جس قدر ادبیت کی چاشنی ہوگی خاکہ اتنا ہی مؤثر اور دل نشین ہوگا۔ ڈاکٹر اعوان کا اُسلوب ادبیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ ذخیرۂ الفاظ اور ان کے استعمال پر ان کی ہنرمندی قابل داد وتحسین ہے۔ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو صاحب خاکہ کے حسب حال ہوتے ہیں۔ ان خاکوں میں شستہ وبرجستہ شیرین ومتین لب ولہجہ رہا ہے۔ لیکن بعض خاکوں میں لب ولہجہ جوشیلا، جذباتی اور تقریری بھی ملتا ہے۔ لفظوں کی بہتات ہے۔ لیکن پھر بھی بعض الفاظ کی تکرار ملتی ہے۔ (۳۶)

ڈاکٹر اعوان کا کالم گزشتہ کئی برسوں سے روزانہ چھپتا آرہا ہے۔ وہ روزانہ اپنے لاکھوں قارئین سے رابطے میں رہتے ہیں۔ اس تعلق کو نبھانے کے لیے انھوں نے بڑی ریاضت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ایک مشکل امر ہے کہ قاری کو اپنے ۲۴ گھنٹے کی زندگی میں اپنے ساتھ رکھا جائے ڈاکٹر اعوان نے فن کی کسوٹی پر پورا اُترتے ہوئے پچیسواں گھنٹہ دریافت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب دنیا کے مختلف ممالک کے علمی، ادبی اور تہذیبی سفر پر روانہ ہوتے ہیں

تو اپنے ادبی کالم روزانہ اپنے سفر کی روداد بھی قلم بند کرتے ہیں۔ یہ ادبی کالم کی روایت میں اپنی نوعیت کا منفرد اور دلچسپ تجربہ ہے۔ جسے قارئین نے بے حد سراہا۔ قارئین کے اصرار پر یہ تمام ادبی کالم سفرنامے کی صورت میں شائع ہوئے۔ ان کے سفرنامے روایت کے اسیر نہیں یہ اسلوب کی جدت اور تازگی کی عمدہ مثال ہیں۔ وہ دلچسپ پیرائے میں کسی بھی ملک کے تہذیبی، معاشی سیاسی اور ادبی منظرنامے کو بیان کرتے ہیں۔ وہ صرف خارجی ماحول کا ہی مشاہدہ نہیں کرتے بلکہ اپنے سفرناموں میں اس فن کے تمام اوصاف سمیٹتے ہوئے اسے ہمہ جہت، بامعنی مدلل اور دستاویزی بنا دیتے ہیں۔ یہ دستاویز محض تاریخی وجغرافیائی حدبندیوں پر محیط نہیں ہوتیں بلکہ دوران سفر ان کے شب وروز مشاغل پر مبنی ہوتی ہے۔ جس سے سفرنامہ کا داخلی پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ سفر میں پیش آنے والے واقعات، مشاہدات، کیفیات اور واردات قلبی کو واضح وشگفتہ انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ وہ ایک سطحی منظر بین کی طرح اعداد وشمار پر مبنی گرد وپیش کے امور کا میکانکی تمثیلچہ تیار نہیں کرتے بلکہ اپنی اپنی باریک ذہنی کے وصف تمام اسرار بمع دیگر جزئیات جذب کر لیتے ہیں۔ ظہور اعوان سفرنامے کو معلومات عامہ بننے نہیں دیتے۔ مزید براں اس سلسلے میں شواہد وضوابط کی بھول بھلیوں کی گرد بھی نہیں چھانتے وہ تو بس سیدھے سادے انداز میں ''جو دل پر گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے'' کے مصداق اپنے دل کی بپتا رقم کر دیتے ہیں۔ وہ قاری کو نہ صرف اپنا ہم سفر بلکہ ہمنوا بھی بنا لیتے ہیں۔ (۳۷)

ڈاکٹر اعوان کے سفرنامے ادبیت کی چاشنی میں رچے بسے ہوتے ہیں۔ وہ سفر کے ہر منظر کو چشمِ تخیل سے دیکھتے ہیں اور رواں دواں اُسلوب میں کاغذ پر اُتار دیتے ہیں۔ وہ موقع محل کے مطابق شگفتہ انداز میں بھی لکھتے ہیں۔ ان کے مزاح میں ہلکے پھلکے طنز کی کاٹ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین ڈاکٹر اعوان کے ادبی کالموں کے اسلوب کے بارے میں لکھتی ہیں:

''ان کے اسلوب کی فنی بنت میں جہاں سادگی کو مقام حاصل ہے وہاں دیگر زبانوں کی پیوندکاری بھی دلچسپی کو بڑھانے کا باعث بنتی ہے۔ وہ پشتو، پنجابی،

ہندکو زبان کے علاوہ ہندی زبان کے الفاظ بھی روانی سے سموتے ہیں جس سے
تحریر کی دلکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے''۔(۳۸)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کالموں میں احمد بشیر ایک دلچسپ کردار ہے جو حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتا ہے۔ یہ ایک زندہ جیتا جاگتا کردار ہے جس کے ذریعے ڈاکٹر اعوان اپنے کالم کو ایک بصیرت افروز شگفتگی سے نوازتے ہیں۔ یہ ادبی کالم کی روایت کا ایک منفرد اور دلچسپ کردار ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی تخیل یا خیالی دنیا کا کردار نہیں بلکہ جیتا جاگتا زندہ کردار ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کرداروں میں استاد بشیر کا کردار اپنی نفسیات، سیاست سے بیزار یا ور ادب دوستی کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ کالم نگار جب اپنے کالم کے کردار سے مکالمہ کرتا ہے تو یہ حصہ کالم میں ایک دلکشی اور دلچسپی کا سماں پیدا کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ''تیتر، چڑیاں اور اُستاد بشیر'' کے عنوان سے لکھے گئے کالم کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

''۔۔۔میں کھانس کھنکار کر۔۔۔آگے بڑھنے کی جسارت کر ہی رہا تھا کہ سامنے سے اُستاد بشیر آتا دکھائی دیا۔ ''سر آپ یہاں بھی'' میں نے کہا کہ ''اُستاد بشیر یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اُستاد بشیر چہکا، ''سبحان تیری قدرت، آپ دیکھ نہیں رہے کہ یہ خوب صورت خوش الحال پرندے رب کی ثنا کر رہے ہیں۔کیسی کیسی گوش آویز آوازیں نکال رہے ہیں''۔ میں نے کہا ''اُستاد کیا غضب ڈھاتے ہو۔ یہ یتیم اسیر اللہ کے قہر میں پھنسے ہوئے پرندے اپنی غلامی اور گرفتاری پر دہائیاں دے رہے ہیں اور تُم کہہ رہے ہو کہ نغمہ الاپ رہے ہیں''۔ اُستاد بشیر یہ سُن کر بپھر گیا۔۔۔۔''مگر آپ جانوروں اور پرندوں کی نفسیات نہیں جانتے۔ یہ ہماری آپ کی طرح دانشور نہیں۔ اُنھوں نے والٹیر، روسو، کارل مارکس کا مطالعہ نہیں کیا۔ یہ غلامی میں خوش رہتے ہیں''۔(۳۹)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان ایک صاحبِ اُسلوب کالم نگار ہیں۔ ان کا اُسلوب کسی تقلید کا شکار نہیں بلکہ ڈاکٹر اعوان کی تخلیقی شخصیت کا عکس اور ذات کے مثبت روّیوں کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر اعوان ایک سچے، کھرے، اور نڈر انسان ہیں۔ زندگی سے محبت اور ظلم سے نفرت ان کا نظریۂ حیات ہے۔ اسی نظریے نے انھیں بے ضمیر معاشرے میں بھی سچ کہنے اور سچ لکھنے کی جرأت عطا کی ہے۔ ان کا یہ روپ ان کے اُسلوب میں بھی جھلکتا ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بغیر کسی خوف و تردود کے کہہ دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ حسن ان کے ادبی کالموں میں بھی نظر آتا ہے۔ سادگی اور روانی ان کے اُسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین اس تناظر میں لکھتی ہیں:

> ''وہ زندگی کے ہر شعبے کی ناہمواریاں ظہور صاحب کے قلم کی رو میں ہیں اور یہی بوقلمی ان کے کالموں کی مقبولیت کی اصل وجہ ہے۔ جہاں تک مقبولیت کا تعلق ہے اس میں ان کے رواں دواں سادہ اُسلوب کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ اُسلوب کی سادگی اور روانی ابلاغ کی قوّت کو بڑھا دیتی ہے اور خالق عام قاری کے دل و دماغ تک باآسانی پہنچ جاتا ہے۔ ظہور صاحب کے اُسلوب کی اسی خاصیت نے انہیں بڑے بڑے موضوعات پر لکھنے پر قادر کیا ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان معاشرتی ناہمواریوں کا گہرا شعور رکھنے والے دردمند، حساس فنکار ہیں۔ ان کی نظر سے چھوٹی بڑی کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں رہتی۔ اور اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے وہ مختلف انداز اختیار کرتے ہیں۔ تاکہ قاری کو ہر وقت جدت وحدت کا احساس رہے۔ اور ان کالموں کی تازگی بھی برقرار رہے۔ چنانچہ کہیں تمثیلی انداز اپناتے ہیں، کبھی استعارتی اور رمزیت کا حربہ استعمال کرتے ہیں اور کبھی علامتی انداز کیا جاتا ہے۔ بات سے بات نکالنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ ان کے کالموں میں نہ صرف انشائی ادب جیسی خصوصیات بھر دیتی ہیں بلکہ کبھی کبھی تو یہ

انداز بالکل علامتی افسانے جیسا ہو جاتا ہے۔(۴۰)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے اُسلوب کی تشکیل میں ان کی سادگی اور سادہ بیانی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ کالم میں آسان فہم اور بہاؤ کی کیفیت رکھنے والے کالم نگار کے لہجے کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ وہ جزئیات نگاری کی اہمیت کا شعور رکھنے والے کالم نگار ہیں۔ ان کے ہاں چھوٹے چھوٹے واقعے کی بھی سادہ اور مختصر لفظوں میں اتنی تفصیل اور جامعیت ملتی ہیں کہ قاری چونک اُٹھتا ہے۔ ان کے اُسلوب کو سراہتے ہوئے پروفیسر اشرف بخاری لکھتے ہیں:

> ''ظہور احمد اعوان صاحب شاعر کیوں نہ بنے اور افسانہ نگار ہوتے ہوتے کیوں رہ گئے کہ ان کی نثر میں قدم قدم پر جو تمثیلات ملتی ہیں جو بنتی پھیلتی سمٹتی ہیں، اُڑتی نظر آتی ہیں۔ واقعات کی تصویر کشی کو جو پیرایہ ملتا ہے طنز و مزاح کے جو چھینٹے دوم مچائے دیتے ہیں۔ حالات و واقعات کا وہ جو آئینہ سجاتے ہیں، یہ سب شعراء اور افسانہ نگاروں کی مملکت سے تعلق رکھتی ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی نثر میں شعر کی کیفیت غزل کی نرماہٹ اور افسانے کی دلکشی کا سحر پایا جاتا ہے۔ ظہور اعوان صاحب جب افراد کا نقشہ کھینچنے لگتے ہیں تو ان کی خیال آرائی لطف دے جاتی ہے۔ معلوم نہیں ان کے کان میں کس نے پھونک دیا کہ واقعات وحقائق کی طنازہ کو چھوٹے چھوٹے فقروں کے ذریعے زیر کمند لایا جاتا ہے کہ ان کا اُسلوب قدم قدم پر ایک خوشگوار تحیر کی چغلی کھاتا ہے''۔(۴۱)

ڈاکٹر اعوان کے کالموں کے اُسلوبیاتی مطالعے کے ساتھ ساتھ فکری اور فلسفیانہ مطالعہ کیا جائے تو یہ کالم، علم و ادب کی ایک تحریک ہیں۔ ڈاکٹر اعوان کو اُردو میں سب سے زیادہ ادبی کالم لکھنے والے تخلیق کار کے عہدے پر فائز کرنے والی یہی قابلیت اور کمٹ منٹ ہے کہ ان کا قلم ہمہ وقت اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے چلتا ہے۔ اور اس کے گواہی ان کے کالم اور ان کے کالموں کا اُسلوب اور خیالات دیتے ہیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو فکری اور فنی حوالے سے ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کو اُردو ادبی کالم نگاری کی روایت میں اعلیٰ مقام پر فائز کرتے ہیں۔

٭ ٭ ٭ ٭

عطاء الحق قاسمی (۱۹۴۳ء):

ادبی کالم کی روایت میں عطاء الحق قاسمی ایک سدابہار تخلیق کار کے منصب پر فائز ہیں۔ نصف صدی سے ان کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ لیکن آج بھی ان کے کالم شگفتگی، تازگی اور رنگارنگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ عہد موجودہ کے سب سے بڑے مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی ان کے اندازِ کالم نگاری کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آپ پر رشک آتا ہے کہ اتنا لکھتے ہیں اور شگفتگی اور تازہ کاری میں ذرا فرق نہیں آتا۔ آپ اس رمز کو پا گئے ہیں کہ قلم کی ساری توانائی اس کی سچائی میں مظہر ہے''۔ (۴۲)

اردو کے ایک اور مقبول ظرافت نگار شفیق الرحمان کا کہنا ہے۔

'' عطاء الحق قاسمی پاکستان کا آرٹ بکوالڈ ہے'' (۴۳)

ادبی کالم لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ تخلیقی صلاحیت اور ریاضت کے ساتھ ساتھ یہ اپنے لکھنے والے سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ وہ کم مدت میں کالم کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ اخبارات روزانہ شائع ہوتے ہیں۔ آج کی زندگی بے پناہ مصروفیت کے گرداب میں ہے۔ گلوبلائزیشن نے جہاں معلومات کے بہاؤ اور تغیر کے عمل کو تیز کر دیا ہے۔ وہیں کالم نگار کے فرائضِ منصبی کا دائرہ بھی وسیع کر دیا ہے۔ اب کالم نگار کو کسی بھی موضوع کو نبھانے کے لیے کم وقت اور بسا اوقات گھنٹوں کے اندر اندر اپنے کالم قارئین کے سامنے لانا ہوتا ہے۔ صرف وہی کالم نگار اس مشکل دریا کو پار کر سکتا ہے جو کالم نگاری کا ہم مزاج بھی ہو اور وہ اِس جن کو قابو میں رکھنے کا ہنر بھی جانتا ہو۔ عطاء الحق قاسمی ایسا ہی جہاندیدہ کالم نگار ہے۔ جس نے وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے کالم نگاری کے ایسے شگوفے چھوڑے ہیں کہ شاید و باید۔

عطاء الحق قاسمی کو عوام و خواص کی طرف سے قبولیت عام کی جو سند ملی ہے، شاید ہی کسی دوسرے کالم نگار کو ملی ہو۔ صحافت و ادب کے ماہرین و ناقدین نے کالم نگاری کی روایت میں قاسمی کو سرِ فہرست رکھا ہے۔ ذیل میں نامور ادیبوں اور کالم نگاروں کی آراء درج کی جا رہی ہیں تا کہ عطاء الحق قاسمی کے دستِ ہنر کے خدوخال نکھر کر سامنے آ سکیں۔

نامور شاعر اور ادبی کالم نگار ابنِ انشاء لکھتے ہیں۔

''ادب اور صحافت کے لیے فخر کی بات ہے کہ عطاء الحق قاسمی ایسے لکھنے والے ان شعبوں میں موجود ہیں''۔ (۴۴)

اردو صحافت کے بڑے نام مجید نظامی کا کہنا ہے:

''میں نے ''نوائے وقت'' کی گذشتہ تیس برس کی ادارت کے دوران بڑے بڑے پھنے خان کالم نگار بھگتائے ہیں۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ عطاء الحق قاسمی سے بہتر کالم نگار کوئی نہیں'' (۴۵)

اردو کے معروف افسانہ نگار اور صاحب طرز کالم نگار جناب انتظار حسین لکھتے ہیں:

''عطاء الحق قاسمی کے کالم اخبار کی فضا سے پھوٹتے نظر آتے ہیں، اس میں ایک رنگ کا اضافہ کرتے نظر آتے ہیں: یوں سمجھیے کہ یہ کالم اس طریقے سے اخبار کے بطن سے برآمد نہیں ہوتے۔ یہ اس طرز پر سوچے اور لکھے گئے ہیں۔ جس طرز پر پطرس بخاری نے اپنے مضامین لکھے تھے یا ہمارے دور میں مشتاق احمد یوسفی نے لکھے ہیں''۔ (۴۶)

اس ضمن میں نامور افسانہ نگار اشفاق احمد کی رائے ہے:

''عطاء الحق قاسمی کو پاکستان کا بہترین کالم نگار ہونے کا ایوارڈ ملا ہے۔ جس کی مجھے بہت خوشی ہے کہ میری رائے بھی یہی ہے۔'' (۴۷)

مشہور ناول نگار عبداللہ حسین نے ان لفظوں میں عطاء الحق قاسمی کے فن کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

''میں آپ کا کالم باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں، پچھلے چند کالم بے حد پسند آئے۔ یہ کالم یک طرفہ آئیڈیولوجیکل جذبات سے آزاد ہیں اور ''دشمنوں'' کے خلاف روایتی برہمی کے اظہار کی بجائے حقیقت کے آئینے میں ان کا تجزیہ کیا گیا ہے''۔ (۴۸)

اردو ظرافت نگاری کی روایت میں کرنل محمد خان کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ عطاء الحق قاسمی کی کالم نگاری کے تنقیدی تجزیئے میں لکھتے ہیں:

''سدا بہار مزاح نگار عطاء الحق قاسمی اپنی تحریروں اور طبیعت کی وجہ سے پاکستان کے بے بہا قدرتی وسیلوں میں سے ایک وسیلہ ہے'' (۴۹)

اردو شعر و شاعری کی مزاحیہ روایت کے بڑے تخلیق کار سید ضمیر جعفری کی رائے بھی سند کا درجہ رکھتی ہے:

''ہمارے کھیتوں میں اگنے والی کپاس کے پھولوں کی طرح ہنستا ہوا کالم عطاء الحق قاسمی کے سوا شاید کسی نے نہیں لکھا''۔ (۵۰)

کالم نگاری کے شگفتہ اسلوب کے خالق و مالک محمد خالد اختر کی رائے بھی معتبر درجے پر فائز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''عطاء الحق قاسمی جتنی شگفتہ نثر لکھتا ہے، چراغ حسن حسرت زندہ ہوتے تو آج کے اِس نثار کو دیکھ کر خوش ہوتے''۔ (۵۱)

شاعروں، ادیبوں اور کالم نگاروں کی اِن آراء کا تجزیہ کیا جائے تو عطاء الحق قاسمی ایک ایسے کالم نگار کے روپ میں سامنے آتے ہیں جنھوں نے کالم کے خدوخال نکھارنے اور اجالنے میں ادبی وسائل سے بھرپور مدد لی ہے۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ان کے کالم کا مطالعہ کرتے ہوئے واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک شاعر وادیب کا کالم ہے اور اس کالم کی تمام تر فضا اور تخیل ادب میں سانس لیتی ہے۔ کالم کی روایت کے نوجوان تخلیق کار، شاعر وادیب اسحاق وردگ عطاء الحق قاسمی کی کالم نگاری کو ایک سطر میں سمیٹتے ہوئے کہتے ہیں:

''کالم لکھنا عطاء الحق قاسمی کا شوق نہیں عشق ہے'' (۵۲)

عطاء الحق قاسمی کے کالموں کی ادبی فضا جاننے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیات وشخصیت پر ایک گہری نظر ڈالی جائے۔ تاکہ اس ادبی، سماجی، تعلیمی وسیاسی پس منظر کو سمجھا جائے۔ جس سے عطاء الحق قاسمی کی تخلیقی شخصیت کی تشکیل ہوئی اور جس کا عکس ان کی کالم نگاری میں محسوس ہوتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی ایک علمی اور روحانی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں وہ یکم فروری ۱۹۴۳ء کو امرت سر میں ممتاز عالم دین مولانا بہاء الحق قاسمی کے ہاں پیدا ہوئے۔ اور جب ان کی عمر چار سال ہوئی تو وہ ۱۹۴۷ء کو پاکستان آ گئے اور وزیر آباد میں ان کے والد نے رہائش اختیار کی۔ عطاء الحق قاسمی کا بچپن وزیر آباد ہی میں گزرا۔ انھوں نے تعلیم کے ابتدائی مراحل وزیر آباد ہی میں طے کیے۔ وہ چھ بہنوں دو بھائیوں میں ساتویں نمبر پر ہیں۔ ایک انٹرویو میں وہ اپنی پیدائش کے بارے میں یہ دلچسپ واقعہ سناتے ہیں:

> ''ہم دونوں بھائیوں کی پیدائش ایک بزرگ کے تعویز کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ اباجی کو اولاد نرینہ کی خواہش تھی مگر جب بیٹیاں پیدا ہوتی گئیں۔ تو ایک بزرگ سے ملے اور ان سے کہا وہ دعا کریں کہ اِن کے ہاں بیٹا پیدا ہو۔ اس پر بزرگ نے تعویز دیا۔ جس کے نتیجے میں میرے بڑے بھائی ضیاء الحق قاسمی پیدا ہوئے۔ اس کے بعد پھر کئی بیٹیوں کی پیدائش پر دوبارہ تعویز لیا گیا۔ تو میری پیدائش ہوئی۔ یوں ہم دونوں بھائیوں کی پیدائش اِس تعویز کی برکت اور نتیجے میں ہوئی۔ بعدازاں اِن بزرگ نے اباجی کو اجازت دے دی کہ ضرورت مندوں کو یہ تعویز دے سکتے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ یہ تعویز انھوں نے جس جس کو دیا اِس کے ہاں نرینہ اولاد ہی پیدا ہوئی''۔ (۵۳)

عطاء الحق قاسمی کے والد صاحب چونکہ ایک متقی اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ لہٰذا عطاء الحق قاسمی کا بچپن اپنے والد محترم کی کڑی نگرانی میں گزرا۔

عطاء الحق قاسمی عام بچوں کی طرح بچپن میں شوخی وشرارت اور کھیل کود میں مصروف رہتے۔ تاہم ان کی

شرارتوں میں معصومیت اور ذہانت پائی جاتی۔ میٹرک کے بعد وہ ایم۔اے او کالج میں داخل ہوئے اور یہاں سے انھوں نے ایف۔اے اور بی۔اے کے امتحانات پاس کیے۔ بی۔اے کے بعد انھوں نے ادبی دلچسپی اور شوق کو دیکھتے ہوئے ایم۔اے اردو کرنے کی ٹھانی اور اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ یہاں پر انھیں بہترین ادبی ماحول اور قابل اساتذہ میسر آئے۔ تاہم کالم نگاری کا آغاز کالج کی تعلیم کے ابتدائی سال ہی سے ''شہاب'' میں لکھنے سے ہو گیا تھا۔ ساتھ ساتھ کئی دیگر پرچوں میں بھی لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

اسی دوران انھوں نے ملک کے معروف قومی روزنامے ''نوائے وقت'' میں لکھنا شروع کیا۔ اور ان کی اہم ادبی وصحافتی تحریریں اخبار کے تعلیمی ایڈیشن میں چھپنے لگیں۔ اورینٹل کالج میں ان کو سید وقار عظیم، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ، اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا جیسے نامور اساتذہ کرام کی صحبت میں پڑھنے کا موقع ملا۔ خاص طور مینارِ علم وادب ڈاکٹر سید عبداللہ کی تربیت نے عطاء الحق قاسمی کی شخصیت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

ان اساتذہ کرام کے علاوہ انھوں نے اس دور میں چند ادبی دوستوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور علمی مباحث سے بہت کچھ سیکھا۔ ان میں امجد اسلام امجد، گلزار وفا چودھری، سرفراز سید، ضیاء شاہد، قیوم نظامی، ارشاد راؤ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور عبداللطیف اختر جیسے احباب شامل ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اس دور کے بارے میں کہتے ہیں۔

''کالج میں آیا تو میرا رجحان غزل گوئی کی طرف ہوا''(۵۴)

ایم۔اے کے بعد جب عملی زندگی کے آغاز کا مرحلہ درپیش ہوا تو انھوں نے کئی جگہ نوکری تلاش کی۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد وہ روزنامہ ''نوائے وقت'' سے منسلک ہوئے اور جب روزنامہ ''ندائے ملت'' شائع ہونے لگا تو سب ایڈیٹر کے طور پر اس سے وابستہ ہوئے۔

اِسی دوران ان کی ملاقات ایم۔اے او کالج کے پرنسپل اور مشہور ماہرِ تعلیم کرامت حسین بخاری سے ہوئی جس میں پرنسپل صاحب نے انھیں کالج میں پڑھانے کی دعوت دی۔ لیکن انھی دنوں عطاء الحق قاسمی امریکا چلے گئے۔ تاہم وہ اپنی شخصیت اور رجحانات کی وجہ سے امریکی معاشرے کا حصہ نہ بن سکے اور واپس آ کر وہ ایم۔اے۔او کالج میں اردو لیکچرر کے طور پر بھرتی ہوئے۔ ساتھ ساتھ وہ ''نوائے وقت'' میں لکھنے کا شوق بھی پورا کرتے رہے۔ اور یہی سے ان کے کالم کے ایک روشن دور کا آغاز ہوتا ہے۔ آج تک ''روزنِ دیوار سے'' کے عنوان سے وہ کالم لکھتے آ رہے ہیں۔

کالموں کا پہلا مجموعہ ''روزنِ دیوار سے'' کے عنوان سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۹۷۲ء سے لے

کر ۱۹۷۷ء تک کے کالم شامل ہیں، کتاب کا انتخاب ومقدمہ معروف مزاح نگار محمد خالد اختر نے لکھا ہے۔اس سال کا آدم جی ادبی ایوارڈ اِسی کتاب کو ملا۔ان کی دوسری کتاب ''عطایئے'' کے نام سے اگست ۱۹۸۲ء کو شائع ہوئی۔ تیسری کتاب ''حدِ مکرر'' ۱۹۸۳ میں شائع ہوئی۔کالموں کا چوتھا مجموعہ ''جرم ظریفی'' کے عنوان سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔۱۹۹۱ء میں ان کے دو مجموعے شائع ہوئے ان میں پہلا مجموعہ ''تجاہلِ کالمانہ'' اور دوسرا ''سرگوشیاں'' کے نام سے ہے۔کالموں کے دو اور مجموعے ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آئے۔ان کے نام ہیں۔

''حبسِ معمول'' اور ''کالم والم'' ۱۹۹۳ کا سال کالم نگاری کی دنیا میں اس لیے اہم ہے کہ اِس برس عطاء الحق قاسمی کے تمام کالموں کا مجموعہ ''کالم تمام'' کے نام سے شائع ہوا۔اس کے بعد کالموں کی کتابی شکل میں اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔جن میں ''ہنسنا رونا منع ہے'' اور ''12 سنگھے'' شامل ہے۔

کالموں کے ان دس مجموعوں کے علاوہ عطاء الحق قاسمی کے چار سفرنامے بھی شائع ہوئے ہیں۔پہلا سفرنامہ ''شوقِ آوارگی'' دوسرا ''گوروں کے دیس میں'' تیسرا ''دلی دور است'' چوتھا ''دنیا خوب صورت ہے'' شائع ہو چکا ہے۔ان کتب کے علاوہ ان کی شاعری کا ایک مجموعہ ''ملاقاتیں ادھوری ہے'' بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔

کالم نگار، شاعر اور سفرنامہ نگار کے علاوہ عطاء لاحق قاسمی ایک جانے پہچانے خاکہ نگار بھی ہیں۔جن کا ثبوت خاکوں پر مشتمل ان کی کتاب ''مزید گنجے فرشتے'' ہے۔مزاح کے حوالے سے ان کی ایک کتاب ''وصیت نامے'' اور پیروڈی کی کتاب ''غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور'' بھی خاصے کی چیزیں ہیں۔

ان کی مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ان کے فن وشخصیت پر ایک کتاب ''یہ نصف صدی کا قصہ ہے''۔یہ دراصل ان کے طویل سوانحی انٹرویو پر مشتمل ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی کالم نگاری کا جائزہ:

عطاء الحق قاسمی کالم برائے کالم نہیں لکھتے۔تخلیقی سرشاریوں نے ان کے کالم میں شگفتگی اور تازہ کاری کے محاسن کو زندہ کیے رکھا ہے۔عام طور پر شدید مقصدیت کے غلبے کی وجہ سے ایک کہنہ مشق تخلیق کار کی تحریر بھی سطحیت کی نذر ہو جاتی ہے۔عطاء الحق قاسمی کے دستِ ہنر سے کالم نگاری ہلکی پھلکی مقصدیت کے باوجود ادبیت کے دائرے سے خارج نہیں ہوئی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی کی شعوری کوشش ہوتی ہے کہ ان کے کالم میں طنز مزاح پر غالب نہ ہو جبکہ مزاح طنز پر غالب ہو جائے۔اِس حوالے سے عطاء الحق کا کہنا ہے۔

> ''میں ذاتی طور پر مزاح کی افادیت کا قائل ہوں۔مزاح نگار اپنے قارئین کو دوست بنا کر انھیں ان کی خامیوں سے آگاہ کرتا ہے۔جبکہ طنز نگار بسا اوقات دوستوں میں بھی ایک

مخالفانہ فضا قائم کر دیتا ہے۔جس سے اصلاح کی گنجائش کم رہ جاتی ہے"۔(۵۵)

عطاء الحق قاسمی بنیادی طور پر شاعر وادیب ہیں۔صحافت کے میدان میں اگر کالم ادبی خدوخال سے محروم ہو جائے تو پھر اسے صحافتی تحریر کہا جائے گا۔صحافتی تحریر کی زندگی ایک دن کی ہوتی ہے۔ادبی کالم اور صحافتی کالم میں بنیادی فرق ہی یہی ہے کہ صحافتی کالم نگار کی شخصیت تخلیق کے کیف و ہنر سے پاک ہوتی ہے۔وہ ایک سپاٹ زبان اور کبھی کبھار اخباری خبر کی صحافتی زبان میں کالم لکھتا ہے۔ایسی تحریر قاری کے ذوقِ جمال پر گرانبار ثابت ہوتی ہے۔عطاء الحق قاسمی کے کالم میں ایک شاعر وادیب کے طرزِ احساس وجدان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔چاہے فکر کا آہنگ ہو یا خیال کی ترنگ کالم میں ادبیت کی روح سموئی ہوتی ہے۔وہ لفظوں کے ساتھ ایک ماہر جوہری کا برتاؤ کرتے ہیں۔جس طرح ایک جوہری زیورات میں حسن و جمال کی رعنائیاں بھر دیتا ہے۔وہ زیورات میں نگینے بھی اسی تجربہ کاری کے ساتھ سموتا ہے جس سے زیورات میں نگینے فطری آہنگ کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔عطاء الحق قاسمی کا کالم کا شاعرانہ آہنگ کالم کے اسلوبِ بیان میں شعر وادب کا جلال و جمال لیے محسوس ہوتا ہے۔وہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں زندگی کے خدوخال سے شعر کا وجود تخلیق ہوتا ہے۔لہٰذا ہم کالم نگار عطاء الحق قاسمی کو شاعر عطاء الحق قاسمی سے جدا کر کے دیکھ ہی نہیں سکتے۔بھلا ایسے خوب صورت اشعار کا شاعر جب کالم نگاری میں طبع آزمائی کرے گا تو کیا کالم کے لفظ لفظ میں ادبیت کی سرشاری محسوس نہ ہوگی؟

ان وصل کے رنگوں میں ہے اک رنگِ جدائی
خوابوں میں سرابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

☆☆☆☆

اب دستِ دعا کیسے اٹھے ، سوچ رہا ہوں
دنیا تیرے دامن میں رہا کچھ بھی نہیں

☆☆☆☆

بھٹک رہا ہے مکمل صداقتوں کے لیے
میرا یقین قرینِ قیاس رہتا ہے

☆☆☆☆

میں در بدر تھا مگر بھول بھول جاتا تھا
کہ اک چراغ دریچے میں جاگتا بھی ہے

☆☆☆☆

وہ جانتا نہیں تو بتانا فضول ہے
اس کو میرے غموں کی خبر ہونا چاہیے

☆☆☆☆

تتلیاں ہجرت کریں گی موسموں کے ساتھ ساتھ
اور شہرِ گل میں آشوبِ ہوا رہ جائے گا

☆☆☆☆

ان اندھیروں میں بھی منزل تک پہنچ سکتے ہیں ہم
جگنوؤں کو راستہ تو یاد ہونا چاہیے

☆☆☆☆

ظلم بچے جن رہا ہے کوچہ و بازار میں
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیے

☆☆☆☆

شبِ وصال میسر نہ شام ہجر عطاؔ
میں کس دیار میں کن موسموں کی قید میں ہوں

☆☆☆☆

تم آؤ گے تو باتیں بھی کریں گے
ابھی اتنا بتانا چاہتا ہوں

☆☆☆☆

عطاء الحق قاسمی کے کالموں میں ادبیت کے نکھار و اظہار کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر ظفر عالم ظفری لکھتے ہیں۔

''عطاء الحق قاسمی نے صحافت میں ادب کو پیش کیا۔ اور ادب بھی وہ نہیں جسے پڑھا، لبوں میں جنبش ہوئی، ہنسی کے فوارے سے چھوٹے اور پھر بس۔ عطاء الحق قاسمی نے صحافت میں وہ ادب پیش کیا۔ جس میں بھرپور انسانی معاشرے کی زندہ جھلک موجود ہے''۔(۵۶)

ڈاکٹر ظفر عالم ظفری کی اِس رائے کا تجزیہ کیا جائے تو عطاء الحق قاسمی کے کالموں میں ادب کی یہ آفاقی قدر ملتی ہے کہ ادب بنیادی طور پر زندگی کا ترجمان ہے۔ اور اعلیٰ ادب میں سماج کی روح سمٹی ہوتی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں کے اندر بڑے ہی شگفتہ پیرائے میں اپنے سماج کے مناظر کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی پیش کش کا انداز اتنا دلربا

اور مسحور کن ہوتا ہے کہ قاری کے ذوقِ جمال پر لطیف اثرات مرتب کرتا ہے۔ دراصل عطاء الحق قاسمی کے کالم ناامیدی میں امید کی آواز ہیں۔ وہ اپنے ظریفانہ لہجے میں سماج کی آنکھ سے آنسو پونچھ کر انھیں وہ مسکراہٹ لوٹانے کی کوشش کرتے ہیں جو زندگی کے بازار میں کہیں گم ہوگئی ہے۔ جذبے کا یہ خلوص انسان دوستی کا بھرم ہے۔ یہ ایک ایسی قدر ہے جس نے عطاء الحق قاسمی کے کالم کو ادبی روایت سے جوڑ رکھا ہے۔

مزاح ایک خداداد تخلیقی صلاحیت ہے۔ سنجیدہ تحریر کی بہ نسبت مزاح تخلیق کرنا بہت محنت اور ذہانت مانگتا ہے۔ یہ عمل برسوں کی ریاضت کے بعد وجود میں آتا ہے۔ جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اردو ادب میں اعلیٰ معیار کا مزاح لکھنے والے شاعر و ادیب اتنی کم تعداد میں ہیں کہ انھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کو قدرت نے تخلیقی مزاح کی صلاحیت ودیعت کر رکھی ہے۔ انھوں نے دورِ حاضر کے ہنگامی موضوعات کو برت کر اس میں مزاح کے ایسے رنگ پیش کیے کہ وہ کبھی پھیکے نہیں پڑیں گے۔ حالانکہ ہنگامی موضوعات پر لکھنے سے تحریر میں ایک ہنگامی کیفیت لی ہے۔ یعنی وہ وقتی طور پر تو لطف و مزاح دے جاتی ہے۔ تاہم چند ہی دنوں بعد اپنا اثر کھو بیٹھی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کا مزاح ایسے معائب اور خامیوں سے پاک ہے۔ ہنگامی موضوعات پر شگفتہ کالم لکھ کر اس میں پھلجڑیاں چھوڑ دینا ان ہی کا خاصا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے مزاحیہ کالم نگار مزاح کے اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی تقاضوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اور ان کے کالموں میں مزاح کے نام پر پھکڑ پن، جگت بازی در آتی ہے۔ جو بہرحال کوئی ادبی اور تخلیقی لہجہ نہیں۔ طنز و مزاح کا بنیادی وصف ہی ہمدردانہ شعور کا اظہار ہے۔ دشنام طرازی، تضحیک اور تذلیل کے نام پر اوٹ پٹانگ تحریروں نے کالم نگاری کا ادبی چہرہ مسخ کر رکھا ہے۔ ان حالات میں عطاء الحق قاسمی کا ادبی کالم طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ قائم کر کے سامنے آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے عطاء الحق قاسمی کے اسلوبِ بیان کی اس جہت کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شائستگی کو مزاح کی ضد سمجھا جاتا ہے مگر عطاء الحق نے مزاح کو شائستگی سے آراستہ کر کے، اور شائستگی میں مزاح کے رنگ بھر کے اردو مزاح نگاری میں ایک منفرد اسلوب پیدا کیا جو سراسران کا اپنا ہے۔ ان کے مزاح کا ہدف بھی چپ چاپ ان کے شائستگی کی مار کھا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر مزاح نویس کے لبوں پر مسکراہٹ ہے تو اس کی آنکھوں میں محبت ہی محبت بھی تو ہے۔ اردو مزاح کے زوال پذیر معیاروں کو عطاء الحق قاسمی نے بلاشبہ ایک بار پھر عروج و ارتقاء کی راہ پر ڈال دیا ہے اور عطاء الحق کی یہ بہت اہم اور تاریخی عطا ہے''۔(۵۷)

صورتِ واقعہ مزاح کا ایک اہم حربہ ہے۔ مزاح کی تخلیقی اور خداداد صلاحیت رکھنے والے مزاح نگار اپنے اردگرد کے واقعات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اس کی قوتِ مشاہدہ سے معاشرے کا ظاہر و باطن چھپا نہیں بلکہ عیاں

لکھتی ہیں:

"عطاء الحق قاسمی نے اپنی صحافتی زندگی کا زیادہ تر حصہ مارشل لاء میں گزارا ہے۔ یا پھر نام نہاد جمہوریتوں کے تحت لیکن کسی بھی حال میں اِن کا قلم جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے سے باز نہیں آیا۔ ان کے کالموں کا علامتی رنگ انھی مارشل لاؤں اور نام نہاد جمہوریتوں کی دین ہے۔ "رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور" کے مصداق جب بھی ان کے قلم پر پابندی لگی وہ پہلے سے زیادہ رواں ہوگیا"۔ (۵۸)

علامتی اسلوب کے ان کالموں میں "طوطے ای طوطے" "الہ دین کے جن کا زوال" "بہتی گنگا" "کوڑھ کرلی" "ہیرو، کامیڈین اور راب ولن" اور "آقاؤں کے لیے ایک کالم" بہترین مثالیں ہیں۔

علامت کا استعمال ایک تخلیقی اور ادبی ہنر ہے۔ اور یہ ہنر بے پناہ فکری فنی گہرائی مانگتا ہے۔ چونکہ کالم کے قارئین عام لوگ بھی ہوتے ہیں اور ان کی ذہنی سطح اور شعور اور ان کی صلاحیت اتنی توانا اور زرخیز نہیں ہوتی کہ وہ علامتی کالم کی تفہیم بآسانی کرسکیں۔ ہمارے ہاں بالعموم علامت میں اتنا ابہام ڈالا جاتا ہے کہ وہ تجریدیت کی حدود میں داخل ہوجاتی ہے۔ حالانکہ علامت کا اصل حسن یہ ہے کہ اس کا ابلاغ ہوجائے۔ یعنی قاری علامت کو سمجھتے ہوئے اس مفہوم کو پالیں۔ جو کالم نگار کے ذہن میں موجود ہے۔

علامت کے استعمال کے ضمن میں عطاء الحق قاسمی کو یہ فنی ادراک حاصل ہے ان کے علامتی کالم علامت کے پردے میں اتنی گہرائی اور بصیرت رکھتے ہیں کہ انھیں پڑھتے ہوئے قاری اس تمام سماجی وسیاسی منظرنامے کو سمجھ جاتا ہے۔ جس کو عام طور پر حکومتِ وقت عوام کی فہم اور سمجھ سے دور رکھتی ہے۔ چاہے وہ دورِ آمریت ہو یا دورِ جمہوریت۔ ہر حکومت اظہارِ رائے پر پابندی کو اپنی حکمرانی کے لیے ضروری سمجھتی ہے۔ اور اس کے لیے وہ اظہار کے مختلف ذرائع پر قدغنیں لگاتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے ہر دورِ حکومت میں ان آمرانہ رویوں کے خلاف مزاحمت کی ہے اور اپنا مافی الضمیر عوام تک پہنچانے کے لیے علامت سے بھی بطریق احسن کام لیا ہے۔

"طوطے ای طوطے" بھی ایسا ہی علامتی کالم ہے جس میں حکومت کے آلہ کار بننے والے ادیبوں، صحافیوں، سرکاری ملازمین اور افسرانِ بالا پر گہرا طنز ملتا ہے۔ غلام ذہن کے اِن لوگوں کے لیے "طوطے" کی علامت استعمال کی گئی ہے۔ کالم کے اِس اقتباس سے ہم علامتی اسلوب میں عطاء الحق قاسمی کے دستِ ہنر کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں:

"میں نے تعجب سے ایک نظر طوطوں کو اور پھر ان کے مالک کو دیکھا۔ مالک ہنس رہا تھا۔ طوطے بھی ہنس رہے تھے میں نے اپنی حیرت پر قابو پایا اور کہا" یہ طوطے ہم انسانوں کی باتیں سمجھتے ہیں اور ہم انسانوں کی زبان میں باتیں کرتے ہیں یہ کیا ماجرا ہے؟"۔ مالک نے

بتایا۔''یہ طوطے معمولی طوطے نہیں ہیں۔ان میں کچھ سیاسی طوطے ہیں اور کچھ ادبی اور صحافتی طوطے ہیں، انقلابی طوطے ہیں اور اسلام پسند طوطے ہیں۔ یہ سب دانا جانور ہیں!''[1] میں نے یہ سن کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا''اگر یہ اتنے ہی دانا ہیں'' تو انھوں نے تمھاری غلامی کس طرح قبول کرلی ہے''۔آقا نے جواب دیا۔''میں تو محض ان کا رکھوالا ہوں، یہ میرے غلام نہیں۔ میں تو خود غلام ہوں۔ یہ دیکھو!'' یہ کہہ کر اس نے اپنی پشت پر سے کپڑا اٹھایا جس پر غلامی کا داغ موجود تھا''(۵۹)

عطاء الحق قاسمی بتدریج کالم کے آغاز سے لے کر اختتام تک علامت کو ایک ارتقائی مراحل سے گزارتے ہیں۔ان کے ہاں علامت ایک زندہ اور جیتا جاگتا متحرک حوالے کی شکل میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ علامت کی تشکیل کے لیے وہ واقعہ نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری کے وسائل سے کام لیتے ہیں۔ دراصل علامتی کالم لکھتے وقت عطاء الحق قاسمی کے اندر کا افسانہ نگار بیدار ہو کر کالم کی پوری فضا پر چھا جاتا ہے۔ چونکہ ان کو واقعہ نگاری کے فن پر عبور حاصل ہے۔اس لیے ان کے علامتی کالم میں افسانے کے علامتی اظہار کے خدوخال اجاگر ہو کر سامنے آتے ہیں۔اور یہی وہ خصوصیات ہیں کہ ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے ان کے کالم میں علامت کے استعمال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا:

''عطاء الحق قاسمی نے علامت کو خوب صورت اور بھرپور انداز میں استعمال کیا ہے۔اور ان کا انداز، تکنیک اور اسلوب ایسا ہے کہ انہیں اگر جدید علامتی افسانے کہا جائے۔تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔اگر عطاء الحق قاسمی اظہار کے لیے کالم کی صنف کا انتخاب نہ کرتے تو وہ یقیناً ایک اچھے اور کامیاب افسانہ نگار ہوتے''۔(۶۰)

کالم نگاری میں علامت کے استعمال کی روایت کے تناظر میں عطاء الحق قاسمی ایک اہم تخلیق کار ہیں۔علامت کا استعمال ایک ادبی عمل ہے اور کسی بھی صنفِ ادب میں فن وفکر کے توازن کو نظر انداز کر دیا جائے۔تو پھر وہ ایک بے ڈھنگے پن کی صورت میں سامنے آتا ہے۔علامت ہر حال میں ایک بصیرت کا حامل علامت نگار چاہتا ہے۔عطاء الحق قاسمی کے کالم اِس ہنر کی بہترین مثال ہیں۔اردو کے معروف شاعر امجد اسلام امجد اِس حوالے سے لکھتے ہیں۔

''جو چیز خالص ادب میں یاروں سے بن نہیں آتی۔عطاء الحق قاسمی نے اسے اخباری کالموں میں نہایت کامیابی سے برت کر دکھایا ہے۔اخبار بینوں کا ادبی ذوق ادب کے باقاعدہ قارئین سے یقیناً فروتر ہوتا ہے۔ایسے میں عطا کے علامتی انداز میں لکھے ہوئے کالم ابلاغ اور مقبولیت کی منزلوں سے سرخرو ہو کر گزرتے ہیں۔عطاء کے یہاں علامتیں قاری

کے علم بصر اور قافیہ شناسی کا امتحان نہیں لیتیں بلکہ تمثال کی طرح مختلف حواس خمسہ کے بطن
سے پھوٹتی ہیں اور یوں آپ تجرید میں بھی تجسیم کا سامزہ لیتے ہیں'' (۶۱)

دراصل امجد اسلام امجد نے بھی علامتی افسانے کے تناظر میں اُسی عیب کا ذکر کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی کے علامتی کالموں کی تعریف کی ہے اور اِس جہت کو سراہا ہے کہ عطاء الحق قاسمی کے کالم میں ابلاغ اور تفہیم کا عمل بخوبی جاری وساری رہتا ہے۔ جس کی مثال ان کے وہ کالم میں جو ضیاء الحق کے دورِ آمریت میں لکھے گئے۔ جنھوں نے مارشل لاء کی جکڑ بندیوں میں مزاحمتی لہجے کو پروان چڑھایا اور اندھیروں میں جگنو بن کر روشنی پھیلانے کی کوشش کی۔ ان کے علامتی کالموں میں ''ہیرو کامیڈین اور اب ولن'' بھی ایسا ہی کالم ہے۔ یہاں انھوں نے ایک فلمی اداکار کی علامت کو حکمرانوں کے طرزِ سیاست اور منافقت کے لیے استعمال کیا ہے۔ کالم سے اقتباس قارئین کو بہت کچھ سمجھنے اور سمجھانے پر مجبور کرتا ہے۔

''ہر فلم میں وہ ایک ناپسندیدہ شخصیت کے کردار میں سامنے آتا ہے، جس کے گرد خوشامدیوں کا ہجوم ہے۔ اور جس کے کارندے بستی میں لوٹ مار میں مشغول رہتے ہیں۔ تین چوتھائی فلم میں ان کی دہشت سے علاقے کے لوگوں کو لرزاں و ترساں دکھایا جاتا ہے۔ مگر آخر میں فلم کا ہیرو انہیں پوری طرح زیر کر لیتا ہے'' (۶۲)

ان کے کالموں میں امید اور روشنی کا پیغام ہوتا ہے۔ وہ مایوس کن حالات میں بھی علامت کو رجائیت کے پیغام کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک طرف تو اپنی علامتوں کو وضع کیا تو دوسری طرف محاوروں کو بطور علامت بڑی خوب صورتی کے ساتھ استعمال کیا۔ وہ خوشامد پسند حلقوں کی جانب سے حکومت کی بے جا خوشامد پر گہرے طنز کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

''بہتی گنگا'' میں ہاتھ دھونا ایک محاورہ ہے اور ہم گذشتہ تیس برس سے مختلف ادوار میں اِس محاورے کو فقرے میں استعمال ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا ہے جو کبھی کسی امتحان سے نہیں گزرتا۔ بس ہر دور میں بہتی گنگا سے ہاتھ دھونا جانتا ہے۔ لیکن گزشتہ عرصے میں ایک اور گروہ سامنے آیا۔ جس نے آغاز بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے سے نہیں کیا بلکہ ایک دم سے بہتی گنگا میں اشنان شروع کر دیا۔ اِن کے اِس اقدام سے عوام کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی۔ چنانچہ وہ جو ہاتھ دھونے پر اکتفا کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک ہی جست میں اشنان کی کوششیں شروع کر دیں۔ گنگا ایک تھی اور اِس سے مستفید ہونے والوں کی

> تعداد اِس کے کناروں سے بھی بڑھ گئی۔ نتیجتاً دھکم پیل شروع ہوگئی اور پھر جس کا زور چلا اس نے ہاتھ دھو لیے اور جس کا زور زیادہ چلا اس نے ''کپڑے اتارے'' اور اشنان کر لیا۔'' (۶۳)

عطاء الحق قاسمی ایک کثیر الجہت تخلیقی شخصیت کا نام ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کا ایک جہان آباد ہے۔ وہ اپنے شگفتہ اسلوب میں کسی بھی موضوع پر دلچسپ انداز میں کالم لکھنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ سیاست، سماج، ادب، ثقافت، فنونِ لطیفہ ماضی، حال، مستقبل، بین الاقوامی امور، علمی و ادبی زوایئے، سماجی رویے، میڈیا، قومی و اسلامی اقدار اور دیگرنت نئے موضوعات ان کے کالم میں در آتے ہیں۔ وہ اپنے علم، سوچ، تجزیئے، فکر اور اسلوب سے ہر موضوع میں ظرافت کے رنگ بھر دیتے ہیں۔ چاہے موضوع کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو۔ ان کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ بات سے بات نکالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اِسی لیے ان کے کالم کتابی صورت میں چھپنے کے بعد ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔ یہ ان کا اعزاز ہے کہ ان کے کالموں کے کئی مجموعے بار بار شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک مجموعوں پر ان کو علمی و ادبی و صحافتی تنظیموں کی طرف سے اعلیٰ ایوارڈ مل چکے ہیں۔ وہ بظاہر بڑی عام سی بات یا واقعے کو لے کر چلتے ہیں اور جوں جوں وہ آگے بڑھتے ہیں قاری کی آنکھوں میں حیرت کی چمک اور چہرے پر لطف کی مسکراہٹ کھلتی نظر آتی ہے۔ قاری کو بیک وقت اِس بات کی حیرت اور خوشی ہوتی ہے کہ کالم کے اندر سے نئی نئی پھلجڑیاں نکلتی ہیں۔ دراصل وہ گہرے مشاہدے سے اپنی خداداد تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لا کر موضوع کے ان پہلوؤں کو بھی سامنے لے آتے ہیں۔ جن پر بالعموم کسی کی توجہ نہیں ہوتی۔ پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ عطاء الحق قاسمی موضوع کے باطن سے ایسا فقرہ نکالتے ہیں جو قاری کو ایک بلند آہنگ قہقہہ لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ فقرہ اپنی ظرافت، اسلوب، فکر و گہرائی اور لفظیات کے حوالے سے ایک جاندار فقرہ ہوتا ہے۔ جس میں زیرِ بحث موضوع کو شگفتہ اندازِ تحریر میں سمیٹا جاتا ہے اور اِس طرح ان کا ایک فقرہ اِس موضوع پر کئی دیگر کالموں پر بھاری ہوتا ہے۔

انتظار حسین عطاء الحق قاسمی کے اِس فن کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عطاء الحق قاسمی فقرہ دھار والا لکھتے ہیں۔ اصل میں جس طرح غزل میں دیکھا جاتا ہے کہ مصرع کیسا نکالتا ہے کالم میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ لکھنے والا فقرہ کیسے لکھتا ہے۔ فقرے میں دھار ہونی چاہیے یہ نہیں تو کالم نہیں لکھنا چاہیے آدمی کوئی آسان کام کرنے مثلاً تحقیقی مقالے وغیرہ لکھے''۔ (۶۴)

ان کے اسلوب کی اِس خوبی کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر فوزیہ چودھری لکھتی ہیں:

> ''عطاء الحق قاسمی بظاہر معمولی اور سیدھی بات سے کالم کا آغاز کرتے ہیں اور پھر اپنے

مخصوصی شگفتہ انداز میں ہنستے ہنساتے بات کو آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ بظاہر غیر سنجیدہ لیکن درحقیقت گہری سنجیدگی سے حالات کے تانے بانے سے نتائج اخذ کرتے ہوئے آخر میں ایسی چونکا دینے بات کہہ دیتے ہیں جس سے قارئین سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"(۶۵)

یہی وہ خوبیاں ہیں جو ان کے کالم کو معاشرے کے ہر طبقے میں بھی مقبول بنائے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں مزاح کے کئی حربوں کو مہارت کے ساتھ برتنے کا سلیقہ ملتا ہے۔ وہ طنزِ لطیف کو خوب صورتی سے استعمال کرتے ہیں اور حسب ضرورت طنزِ ملیح کا استعمال بھی کامیابی سے کرتے ہیں ان کا کالم معاشرے میں پھیلی ہوئی منافقتوں اور تضادات کے خلاف ایک دیوار ثابت ہوتا ہے۔ ان کے کالم میں مزاح کے ایک خوب صورت اور دلچسپ زبان و بیان کے نمونے ملتے ہیں۔ سادہ اور سلیس زبان میں فطری بہاؤ کے ساتھ مزاح کے پھول کھلانا عطاء الحق قاسمی کے کالموں کو انفرادی شان بخشتا ہے۔ اُن کو زبان پر ایک مکمل گرفت حاصل ہے۔ اس لیے ان کے ہاں لفظوں کے استعمال میں ایک تنوع نظر آتا ہے۔ وہ کسی سے متاثر نہیں۔ نہ ہی وہ کسی نقل و تقلید کے قائل ہیں۔ انھیں اپنی ذات اور فن پر مکمل اعتماد ہے۔ اسی لیے ان کے کالم ان کی انفرادیت کے ثبوت ہیں۔ یہ اندازِ تحریر ان کی شخصیت سے پھوٹتا ہے۔ جس میں کسی مصنوعی پن اور غیر فطری عمل کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ ان کا یہی اعتماد ان کے اسلوب کی روح ہے۔ جب ایک تخلیق کار کو اپنے فن پر پورا اعتماد مل جائے تو پھر وہ اپنے فن کے کرشمے یوں دکھاتا ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں نئے نئے تجربے کرتا ہوا اور طرزِ بیان دریافت کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کا اسلوب بھی اِسی خوبی اور صلاحیت میں مملو ہے۔ یقیناً اِس میں ان کی احساسِ ذمہ داری کو بھی عمل دخل ہے۔ کالم ان کے لیے ایک کارِ عبادت ہے۔ اِسی لیے وہ یکسوئی دھیان اور سنجیدگی کے ساتھ اِسے ادا کرتے ہیں۔ وہ لطیفوں، چٹکلوں اور کہاوتوں کے استعمال پر قادر ہیں۔ تاہم وہ گھسے پٹے لطیفوں کے بجائے نئے نئے لطیفوں سے اپنے کالم کو سجاتے اور سنوارتے ہیں۔ وہ موقع بہ موقع رعایتِ لفظی کے استعمال سے بھی ایک شگفتہ کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ خاص طور پر پنجابی الفاظ کے برجستہ استعمال سے انھوں نے کالم میں ایک نئے تجربے کی راہ دکھائی ہے۔ اِس طرح ان کے ہاں مقامی و عوامی اظہارِ بیان کے رنگ بھی آ جاتے ہیں اور قاری بہ سہولت کالم نگار کا عرضِ مدعا مزاح کے ساتھ سمجھ جاتا ہے۔ اور اِس طرح وہ خوب خوب لطف و سرور بھی لیتا ہے۔ اِس حوالے سے سید ضمیر جعفری نے ان کے ہاں عوامی اور پنجابی رنگ کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

"عطاء کے کالموں میں اردو کالم نگاری نے پہلی مرتبہ انگرکھا اتار کر گلے میں پٹکا اوڑھنا سیکھا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اردو میں اِس قسم کا بوریاں والا اور تعویزاں والا بلھے

شاہیاں کرتا ہوا گھبرو کالم نگار جو پاکستان کی مٹی میں ملا دلار رہتا ہے اور ہمارے کھیتوں میں
اگنے والی پیاس کے پھولوں کی طرح ہنستا ہے شاید کسی نے نہیں دیکھا"۔(٦٦)

عطاء الحق قاسمی نے عمر کی ٦٠ سے زیادہ بہاریں دیکھ لی ہیں۔ وہ اب بھی ہفتے میں ۴ کالم لکھتے ہیں۔ ان کالموں کو پڑھ کر کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ عطاء الحق قاسمی کے کالموں میں بوچھل پن آ گیا ہے یا وہ پہلے جیسے تازگی اور برجستگی سے محروم ہیں۔

☆☆☆☆

حسن نثار (۱۹۵۶ء):

حسن نثار میں ایک منفرد طرزِ ادا کے مالک ہیں۔ان کے کالم حقیقت اور تخیل کے سنگم پر جنم لیتے ہیں۔ وہ معاشرے کے تلخ حقائق کو کھلی آنکھ سے دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے والے کالم نگار ہیں۔ جو لمحۂ موجود سے غیر مطمئن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالم پہلے لفظ سے لے کر آخری لفظ تک ایک بے چینی اور بے قراری کے احساس میں لپٹے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

حسن نثار ایک انقلابی ذہن واحساس رکھنے والے تخلیق کار ہیں۔ بنیادی طور پر وہ شاعر اور ادیب ہیں۔معمولی ذوق رکھنے والا قاری بھی ان کے کالم میں شعریت وادبیت کے نقوش بخوبی دیکھ سکتا ہے۔حسن نثار جولائی ۱۹۵۶ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔انھوں نے اپنے تعلیمی مراحل راولپنڈی، میاں چنوں، فیصل آباد اور لاہور میں طے کیے۔وہ اقتصادیات میں ایم۔اے ہیں۔صحافتی زندگی کا آغاز ماہنامہ ''دھنک'' سے کیا۔سرور سکھیرا اس کے ایڈیٹر تھے۔۱۹۸۸ء میں روزنامہ ''مساوات'' میں چلے گئے۔ اور کالم نگاری کا آغاز کیا۔ روزنامہ ''خبریں'' لاہور کے آغاز پر اس میں کالم لکھنے لگے۔وہ جون ۱۹۹۷ء تک یہاں ''چوراہا'' کے نام سے کالم لکھتے رہے۔اِن دنوں روزنامہ ''جنگ'' کے صفحہ نمبر ۲ پر ان کا کالم ''چوراہا'' کے عنوان سے اور ہفت روزہ ''اخبارِ جہاں'' میں ''بادبان'' کے نام سے شائع ہوتا ہے۔

حسن نثار نظریاتی طور پر بائیں بازو کے دانشور ہیں۔اس لیے ان کے کالم فکری طور پر معاشی عدم استحکام، سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف ایک موثر احتجاج کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ معاشی مساوات اور عوام کی ترقی وخوشحالی ان کا دیرینہ خواب ہے۔ اور یہ خواب ان کے کالموں کا بنیادی فلسفہ بن کر سامنے آتا ہے۔ممتاز دانشور، صحافی اور کالم نگار ارشاد احمد حقانی ان کے کالم نگاری کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''حسن نثار سے میرا تعارف ان کی تحریروں کے ذریعے ہوا۔ایک صحافی ہونے کے ناطے میں چونکہ اکثر اداریے اور کالم پڑھتا ہوں۔اس لیے معمول کے مطالعے کے دوران ان کے کالم زیرِ مطالعہ نظر آئے اور بہت جلد میں ان کا مداح اور قدر دان بن گیا۔حسن نثار کی

جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ ہے اپنے نظریات سے ان کا اخلاص، جس چیز کو وہ برائی سمجھتے ہیں۔ اس کے بارے میں غیر مصالحانہ رویہ اور لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی بات کہنے کا انداز ہے۔ شدتِ احساس اور تلخی اظہار ان کی ہر تحریر کا طرۂ امتیاز ہے۔ حسن نثار مراعات یافتہ طبقات سے متنفر اور ان کا بے رحم ناقد ہے۔ وہ ان کی منافقت، ان کی مردم آزاری ان کے استحصالی ہتھکنڈوں اور دو غلے پن کا بدترین دشمن ہے۔ اور اس دن کا منتظر ہے۔ جب بقول فیض ''تخت گرائے جائیں گے اور تاج اچھالے جائیں گے''۔ حسن نثار ظلم اور استحصال سے کوئی مفاہمت یا مصالحت یا نرمی کرنے کا قائل نہیں اور اپنی تنقید میں شمشیر براں کی چمک اور کاٹ رکھتا ہے۔'' (٦٧)

ارشاد احمد حقانی کی اِس معتبر رائے کے تناظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسن نثار تیز اور کٹیلے لہجے کے کالم نگار ہیں۔ ان کے کالموں میں استحصالی طبقے کا احتساب ملتا ہے۔ تاہم اِس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے کالموں میں مقصدیت فن کالم نگاری یا ادبی کالم نگاری کے تقاضوں پر غالب ہے۔ حسن نثار ادب اور صحافت کے مزاج مقصد اور جمالیاتی تقاضوں سے بے خبر نہیں۔ اس لیے ان کے کالم میں قاری کی تسکین بھی ہوتی ہے اور ذوقِ ادب کی آبیاری بھی۔

طنز حسن نثار کے اسلوب کی روح ہے۔ طنز ادب کا ایک جاندار اور فنکارانہ وسیلہ ہے۔ جو نظم و نثر دونوں میں برتا جاسکتا ہے۔ کالم میں حسن نثار نے طنز کی نشریت کو گہرے، انداز بیان سے استعمال کیا ہے۔ طنز دو دھاری تلوار ہے جسے چلانے کے لیے بے پناہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں کہیں کالم نگار نے ذرا بے احتیاطی کی۔ طنز اپنے مقصد سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسے طنز کو پھکڑ بازی کہتے ہیں۔ حسن نثار کا فن اِس عیب سے پاک ہے۔

اپنے ایک کالم ''اسمبلیاں نہیں اصطبلیاں'' میں ان کا طنزیہ اُسلوب بیان ملاحظہ کیجیے۔ جس میں انھوں نے اسمبلی کو طنزیہ طور پر اصطبل کہا ہے لکھتے ہیں:

''اصطبل وہ عالی شان اور پرشکوہ عمارت ہوتی ہے۔ جہاں آدمی نہیں مختلف النسل گھوڑے باندھے رکھے، پالے پوسے اور سنبھالے جاتے ہیں۔ یہ گھوڑے کبھی کبھی خواندہ اور اکثر نیم

نگاری کے بنیادی محرکات ہیں۔ اور یہی وہ نکتہ ہے کہ وہ عوام کے جذبات کا ترجمان ہے۔ اس کا دل عوام کے لیے دھڑکتا ہے۔ اور قلم عوام کے لیے لکھتا ہے۔ چاہے حکومت دائیں بازو کی ہو یا بائیں بازو کی، وہ عوام کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کی پہلی ترجیح بھی عوام ہے اور آخری ترجیح بھی عوام ہے۔ وہ ہر وہ نقاب اِتار پھینکنا چاہتا ہے جو عوام کو دھوکا دینے کے لیے حکمرانوں نے یا سیاست دانوں نے چہروں پہ سجائے ہوئے ہوں۔ وہ استحصال کا ہر وہ پردہ ہٹانا چاہتا ہے۔ جو اِس نظام پر پڑا ہوا ہے۔ وہ اپنے کالموں کے مجموعے ''چوراہا'' میں لکھتے ہیں۔

''اگر کالم نگاری ہی کرنی ہے تو پھر بنیادی تصورات کو چیلنج کرنا ہوگا اس ملک اور معاشرے کے تضادات کو سرِ عام ننگا کرنا ہوگا۔ بہت سی باتوں کو (Redefine) کرنا ہوگا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ''یوم آزادی'' نہیں۔ آقاؤں کی تبدیلی کا دن قرار دینا ہوگا۔ جمہوریت کو چند خاندانوں کی آمریت لکھنا ہوگا۔ جمہوریت کے ساتھ ہر مارشل لاء کو بھی ناخالص قرار دینا ہوگا۔ انتخابی نظام کو عوام کی ناکہ بندی کہنا ہوگا ناگ کو ناگ اور ناگن کو ناگن بتانا ہوگا۔ بددعا دینی ہوگی یا بغاوت عوام کو شہری نہیں رعایا لکھنا ہوگا۔ دوستیاں ترک کرنی ہوں گی دشمن پیدا کرنے ہوں گے جوگ لینا ہوگا'' (۷۰)

حسن نثار کے کالم میں حقیقت نگاری کی تصویروں کے ساتھ رومانیت کے رنگ بھی ملتے ہیں۔ ماضی کو آواز، رنگینیٔ الفاظ کا جادو، جذبے کی شدت اور مستقبل کی روشنیوں کی سمت لپکنے کی بے چینی حسن نثار کی رومانیت کے خدوخال ہیں۔ جو کل بھی تروتازہ تھے اور آج بھی ہیں اور مستقبل میں بھی اِس تازگی کی مہک کم نہیں ہوگی۔ اُن کی نثر ایک شاعرانہ نثر ہے۔ اس میں شعری آہنگ کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ اور ادبیت کا لطف بھی۔ ان کے کالم ''متوفی نامعلوم'' کا یہ ٹکڑا پڑھیے۔ جس میں ایک بھوکے شہری کی خودکشی کا ماتم کرتے ہوئے اپنے درد کو ان لفظوں میں ظاہر کیا گیا ہے:

''یہ ''نامعلوم متوفی'' اپنا بہادر ہم زاد لگتا ہے۔ ہم زاد اِس لیے کہ کبھی کبھار میرا جی بھی چاہتا ہے کہ خودکشی کرلوں۔ لیکن میں بزدل ہوں۔ اس لیے خودکشی کی بجائے کالم کشی پر ہی اکتفا

کرتا ہوں۔ لیکن میرا یہ نامعلوم ہم زاد بہت بہادر تھا۔ جس نے اِس نظام کے منہ پر تھوک

کر اپنے لہو سے اِس کے خلاف خاموش ایف آئی آر درج کر دی لیکن افسوس اس نامعلوم

متوفی کی طرح ان گنت نامعلوم لوگ جو یک مشت نہیں قسطوں میں مر رہے ہیں۔ اس شخص

کی موت پر احتجاج نہیں کریں گے۔ اس کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا عزم یا

مطالبہ نہیں کریں گے''۔(۷۱)

ان کے کالم اسلوب اور اندازِ تحریر کی رنگا رنگی اور تنوع کی کیفیات میں رچے بسے ہیں۔ اِسی طرح یہ فکری و موضوعاتی سطح پر یکسانیت کے عیب سے بھی پاک ہیں۔ اخبار میں ایک طرح کے کالم پڑھنے سے قاری اکتاہٹ کا شکار ہو سکتا ہے۔ قاری کے لیے وہی تحریر پر لطف اور دل چسپ ہو سکتی ہے۔ جس میں تر و تازگی اور نیا پن ہو۔ ایک تجربہ کار اور نبض شناس کالم نگار اِس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے کالموں کو یکسانیت کے عیب سے بچاتا ہے۔ اور کالم کی یہ خوبصورتی تب قائم رہ سکتی ہے۔ جب کالم نگار کے فن میں تنوع ہو۔ یہی تنوع حسن نثار کے کالم کا حسن ہے۔ وہ طنز و مزاح واقعہ نگاری، ڈرامائیت، ادبیت اور فلسفیانہ طرزِ اظہار کے وسائل سے لیس کالم نگار ہے۔ لہٰذا وہ نئے نئے روپ دکھاتا ہوا اپنے قاری کو اپنی تحریر کے حصار میں بند رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔ کبھی وہ طنز و مزاح کے پردے میں کالم باندھتا ہے تو کبھی افسانوی فضا بناتا ہوا کسی کردار کے گرد موضوع کا تانا بانا باندھتا ہے۔ مکالمہ نگاری اور ڈرامائی کیفیات سے بھی اس نے اپنے کالموں کا جادو جگایا ہے۔ ''ہیلو آنٹی۔ ہیلو انکل'' بھی ایسا ہی کالم ہے۔ جس میں مکالمہ در مکالمہ چلتا ہے اور یوں مکالمے کے ذریعے وہ اپنی بات قاری کے ذہن منتقل کرتا ہے۔ اِس کے ہاں ایک فلسفیانہ رجحان بھی ملتا ہے۔ وہ کالم کے آغاز درمیان یا آخر میں بڑے کومل لفظوں میں فلسفیانہ گفتگو باندھ کر قاری کے وجدان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ''پھانسی اور خودکشی'' بھی ایسا ہی کالم ہے۔ جس کا آغاز فلسفیانہ انداز میں ہوتا ہے۔

''موت ایک ایسی منزل ہے۔ جس پر ہم سب نے بغیر کسی کوشش کے پہنچ ہی جانا ہوتا ہے۔

ایک ایسی منزل جو سب کو ملی، سب کو ملے گی، ایک ایسی منزل جو خود چل کر آتی ہے''۔(۷۲)

حسن نثار کے کالموں کی سب سے بڑی خوبی ہی یہی ہے کہ وہ دل سے لکھے جاتے ہیں اور پڑھنے والے کو یوں لگتا ہے جیسے یہ دل سے پڑھے جارہے ہیں اور وہ بے اختیار غالب کے اس مصرعے کی تصویر بن جاتا ہے۔''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' ۔

☆☆☆☆☆

یونس قیاسی (۱۹۴۲ء):

کالم نگاری کی روایت کا ایک چمکتا دمکتا حوالہ یونس قیاسی بھی ہے۔ یونس قیاسی ایک ممتاز ڈراما نگار، شاعر اور کالم نگار ہیں۔ ان کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے بیک وقت اردو، پشتو اور ہندکو زبان و ادب میں طبع آزمائی کی۔ اور ان تینوں زبانوں کے ادب میں ایک قابل رشک مقام بنایا۔ ممتاز صحافی حبیب الرحمٰن یونس قیاسی کی صلاحیتوں کے اعتراف میں لکھتے ہیں:

> ''اردو، پشتو، ہندکو شعر و ادب، ڈراما نگاری، کالم نویسی اور صحافت کی دنیا کے معروف نام یونس قیاسی نے اِن تمام زبانوں اور تمام اصناف میں اس قدر کام کیا ہے اور اتنا دقیق کام کیا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ وہ کس زبان کے بڑے شاعر ہیں، بڑے ادیب ہیں۔ بڑے ڈرامہ نگار ہیں۔ بڑے کالم نگار نویس یا بڑے صحافی ہیں، مقبول ڈرامہ نگار اور پشتو فلموں کے نغمہ نگار کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات جانی پہچانی ہیں''۔(۷۳)

یونس قیاسی کی ہمہ جہت شخصیت ادب و صحافت کے کئی خانوں میں بٹی ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک ترقی پسند اور روشن خیال دانشور ہیں۔ وہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کے فروغ کے پرچارک ہیں۔ امن، محبت، ترقی اور خوشحالی ان کے سنہرے خواب ہیں۔ وہ جاگتی آنکھوں سے معاشرے میں اپنے ان خوابوں کی تعبیر دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر جب کبھی انھیں اپنے ان خوابوں کی تعبیر نہیں ملتی تو پھر وہ قلم اٹھا کر کالم لکھتے ہیں اور کالم کے کینوس پر اپنے گم شدہ خوابوں کو اتارتے ہیں۔ ''قیاس آرائیاں'' کے عنوان سے ان کا کالم قومی اخبار روزنامہ ''آج'' پشاور میں متواتر شائع ہوتا ہے اور کالم سے ان کا رشتہ پچھلے کئی عشروں پر محیط ہے ۲۰۰۹ میں ان کے کالموں کا پہلا مجموعہ ''قیاس آرائیاں'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے کالموں کے مجموعے میں نامور شعراء ادباء اور صحافیوں نے اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان میں معروف شاعر امجد اسلام امجد ممتاز، شاعر و ادیب پروفیسر ڈاکٹر خاطر غزنوی، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، قاسم حسرت، محترمہ زیتون بانو، ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی وغیرہ شامل ہیں۔ امجد اسلام امجد نے یونس قیاسی کی ادبی شخصیت کو ان لفظوں میں سراہا ہے:

> ''جب کبھی پشاور ٹیلی ویژن کے نامور اور معیاری لکھاریوں کی فہرست تیار کی جائے گی تو یونس قیاسی کا نام سرفہرست ہوگا۔ معاشرتی برائیوں کے خلاف لکھنے کی جرأت کرنا قیاسی کی

کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ قیاسی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے خود کو صرف علاقائی کلچر تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انھوں نے قومی کلچر کے مختلف موضوعات پر کالم بھی لکھے ہیں۔ ایک حوالے سے وہ ڈرامہ نگار کے علاوہ ایک اچھے کالم نگار بھی ہیں''۔ (۷۴)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان یونس قیاسی کی کالم نگاری کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قیاسی صاحب کی شخصیت پیچیدہ نہیں۔ سادہ اور سلیس ہے اس طرح ان کا اسلوبِ بیان و تحریر بھی اسی طرح واضح اور روشن ہے اور وہ حسن رکھتا ہے جو سادگی کا لازمی خاصہ ہوتا ہے۔ قیاسی صاحب جس طرح خود محبت کرنے والے انسان ہیں اسی طرح ان کی تحریر بھی محبت کے جذبوں سے سرشار ہے۔ یہ مجموعہ قیاسی صاحب کی ورسٹائل ادبی شخصیت کے ماتھے کا ایک اور چمکتا جھومر ہے۔'' (۷۵)

یونس قیاسی کے کالم عنوان سے لے کر آخری لفظ تک تخیل اور حقیقت کی آب و ہوا میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ درمیان میں ایک افسانوی فضا، شگفتگی، وارفتگی اور فلسفے و تجزیے کی پگڈنڈیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ یوں ان کے کالم ادب و صحافت کی سرحد پر جنم لیتے ہیں۔ دراصل یونس قیاسی کی ہمہ جہت شخصیت کا پرتو ان کے کالموں میں محسوس ہوتا ہے۔ وہ ایک سنجیدہ انسان ہیں۔ کبھی کبھی ان کے کالم شگفتگی سے سنجیدگی کی طرف اور کبھی سنجیدگی سے شگفتگی کی طرف سفر کرتے ہیں۔ ''جمہوریت کی گاڑی اور ریورس گیر'' بھی ایسا ہی ایک کالم ہے۔ سب سے پہلے جو خوبی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ کالم کا عنوان ہے۔ جس میں زیرِ لب ایک مسکراہٹ کھلتی محسوس ہوتی ہے۔ جمہوریت کی پاکستانی صورتحال اور پھر اِس پر ریورس گیئر کا، گہرا طنز کالم میں طنز و مزاح کے امکانات کا پتا دیتا ہے۔ کالم کا آغاز ہی انتہائی دلچسپی کا حامل ہے۔

''سردار جی اپنی ذاتی گاڑی میں سسرال جارہے تھے، گاڑی ان کا ڈرائیور چلا رہا تھا، فاصلہ طویل تھا، جس کا زیادہ تر حصہ طے کرنے کے بعد کچھ باقی رہ گیا تھا، سردار جی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر خراٹے لے رہے تھے، گاڑی دھچکے کے ساتھ رکی، تو سردار جی بھی نیند سے بیدار ہوگئے'' ''گاڑی کیوں رک گئی''؟ سردار جی نے ہڑبڑا کر ڈرائیور سے پوچھا۔ ڈرائیور نے بتایا۔ ''سردار جی پٹرول ختم ہوگیا ہے اس لیے اب گاڑی آگے نہیں جاسکتی'' سردار جی نے کچھ سوچا۔ پھر کمال ہوشیاری کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا'' گاڑی آگے نہیں جاسکتی تو پھر گاڑی ریورس پر چلاؤ تا کہ اپنے گھر واپس تو جاسکیں۔'' (۷۶)

یونس قیاسی نے زندگی اور سماج کو ایک تخلیق کار کی نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ زندگی کے

اعلیٰ اقدار کے قائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کالم کو اپنے نظریات کے پرچار کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ ان کے کالم میں عوامی لب و لہجے کی سلاست اور روانی کی لہریں چلتی ہیں۔ وہ مشکل پسندی کے قائل نہیں۔ دراصل وہ اخبار کے منصب اور مزاج سے باخبر ہیں۔ ان کی نظر اور توجہ عوام کے خوابوں کی دنیا میں ہے۔ ایک باخبر ادیب کی وجہ سے وہ اپنے کالموں میں عوام کے نبض شناس کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس لیے ان کو اردو کا عوامی کالم نگار کہا جا سکتا ہے۔ جس کا اندازہ ان کے کالم ''ایک سوال اپنے قارئین کے لیے'' سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کالم میں وہ ادبی اسلوب میں عوام سے ایک مکالمے کی صورت میں گفتگو کرتے ہیں۔ اور یوں بات سے بات نکالتے ہوئے وہ مطلب کی بات بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ عبارت دیکھیے:

> ''پھولوں اور پھلوں سے لائے ہوئے باغوں کو آگ لگ جائے چشموں اور جھرنوں کے شہد جیسے میٹھے پانیوں میں لہو کی سرخی نظر آنے لگے، خوشبوؤں میں بسی ہوئی معطر ہواؤں میں بارود کی بو شامل ہو جائے، مسکراتے اور خوشی سے دمکتے چہروں پر شادابی کی بجائے اندوہناک پرچھائیاں رقص کرنے لگیں، کھیتوں میں بڑی مکئی کی پکی ہوئی فصل جنگلی جانوروں کی خوراک بن جائے۔ سبزہ ویران ہو جائے اور کاروبار زندگی مکمل پر تباہ ہو جائے تو زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔''(۷۷)

مزاحیہ کردار طنز و مزاح کا ایک معروف حربہ ہے۔ کالم نگار بسا اوقات مزاحیہ کردار کے منہ سے ایک ایسا جملہ یا فقرہ کہلوا دیتا ہے جو حالات پر ایک تلخ مگر سچا تبصرہ ہوتا ہے۔ یونس قیاسی نے بھی اِس ادبی حربے کو خوب صورتی سے برتا ہے۔ ان کے اِس مزاحیہ کردار کا نام ''پمپولہ'' ہے ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی اِس مزاحیہ کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''یونس قیاسی صاحب کا ''پمپولہ'' ایک سادہ لوح کردار ہے۔ مگر سادہ لوحی میں بڑے بڑوں کو ٹیکہ لگا دیتا ہے۔ قیاسی صاحب جو بات اپنی طرف سے لکھنا نہیں چاہتے وہ بات ''پمپولہ'' کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ قیاسی صاحب کے اسلوب کا بڑا کمال ہے۔''(۸۷)

سرحد کے ادب و صحافت میں یونس قیاسی ایک بڑی شخصیت کا نام ہے۔ انھوں نے جہاں شاعری، ڈرامہ اور دیگر اصناف ادب کے دامن کو وسعت دی ہے۔ اسی طرح انھوں نے کالم میں ادبیت کے خدوخال نکھارنے میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں اور یہ ان کی تخلیقی شخصیت کا ایک بھرپور حوالہ ہے۔

☆☆☆☆

پروین شاکر (۱۹۵۲ء۔۔۱۹۹۴ء)

پروین شاکر کو بجا طور پر اُردو ادب کی ملکۂ سخن کہا جاتا ہے ۔انھوں نے شاعری میں وہ اجتہاد کر دکھایا ہے۔ جو خواتین شاعرات پر قرض بھی تھا اور فرض بھی۔ پروین شاکر کی شاعری میں ہمیں عورت کے جذبے واحساس کی دنیا کا پتہ ملتا ہے۔ان سے پہلے کسی شاعرہ نے کبھی ایسے اچھوتے موضوعات کو چھوا اور نہ اِن کے بعد شاعری میں کسی خاتون کا جادو چل سکا ہے۔

پروین شاکر کی بنیادی وجہ شہرت تو ایک انمول اور بے مثال شاعرہ کی حیثیت سے ہے۔تاہم بہت کم قارئین یہ جانتے ہیں کہ وہ ایک کالم نگار کے روپ میں بھی ادبی کالم کی روایت کا تابندہ نام ہے۔زندگی نے مہلت نہ دی ورنہ پروین شاکر کی کالم نگاری میں تخلیقی ہنرمندیوں کی ایک کائنات آباد تھی۔ان کی کالم نگاری ۳ برسوں پر محیط ہے۔ان کا کالم ہفتے میں ایک آدھ بار ہی شائع ہوتا تھا۔تاہم اپنی جاذبِ نظر ادبی شخصیت، علیت اور حساسیت کی بنا پر بہت شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ان کے کالم ملک کے سب سے بڑے اخبار روزنامہ ''جنگ'' میں ''گوشۂ چشم'' کے عنوان سے چھپے۔اور بعد ازاں کتابی صورت میں بھی اِسی نام سے شائع ہوئے۔

پروین شاکر کے کالموں کا سب سے بڑا موضوع زندگی ہے۔ان کے نزدیک زندگی کائنات کی سب سے بڑی خوب صورتی ہے اور زندگی سے وابستہ سارے رنگ کائنات کے سب حسین موسموں سے زیادہ دلفریب اور دلاویز ہیں۔ پروین شاکر جیسی حساس فنکارہ جب دیکھتی ہیں کہ زندگی کے چہرے پر اداسی کا سایہ ہے۔ اور آنکھوں میں دکھوں کے آنسو ہیں۔تو وہ تڑپ اٹھتی ہیں اور بے چین ہوکر بے اختیار قلم اٹھاتی ہیں۔ان کی یہ تڑپ اور بے چینی ان کے کالموں میں پہلو بہ پہلو چلتی رہتی ہے۔ان کی کالم نگاری کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر عبدالغفار کوکب لکھتے ہیں۔

> ''پروین شاکر کے کالموں میں ہمیں نہ تو جذباتی گھن گرج ملتی ہے۔ اور نہ ہی وہ تشبیہ، استعارہ، رعایت لفظی یا علامتوں کا سہارا لیتی ہیں۔انھوں نے اپنے کالموں میں مزاح کے بجائے طنز کا انداز اپنایا ہے۔لیکن اس طنز میں کاٹ نہیں ہے۔بلکہ ایک قسم کی

افسردگی پائی جاتی ہے۔ان کی حساس طبیعت جب معاشرے میں کوئی ظلم ہوتا دیکھتی تو بے
چین ہو جاتی۔ یہ بے چینی کبھی شاعری کی صورت میں اور کبھی کالم کی شکل میں عوام کے
دلوں میں پہنچ جاتی۔انھوں نے اپنے کالموں میں مسائل و مشکلات کے سلسلے میں عوام کی
بے بسی اور بے چارگی کو ابھارا ہے''۔(۷۹)

پروین شاکر کے کالم معاشرے کے زخموں پر مرہم رکھنے کا عمل ہے۔انھوں نے عوام کے آنسو پونچھنے کی کوشش کی ہے۔ان کے لفظ لفظ سے ہمدردی اور خلوص کی خوشبو آتی ہے۔ یہ کالم مایوس کن حالات میں بھی امید کی روشنی جلاتے ہیں۔تعمیری سوچ اِن کالموں کا مرکزی حوالہ ہے۔

پروین شاکر چھوٹے چھوٹے فقروں میں اپنی بات سمیٹنے کا ہنر جانتی ہیں۔گو کہ انھوں نے اتنے زیادہ کالم نہیں لکھے۔لیکن محدود تعداد کے باوجود ان کالموں کے اندر اپنے معاشرے کی سچی تصویر نظر آتی ہے۔

پروین شاکر کے کالموں میں کوئی مصنوعی یا غیر فطری فضا نظر نہیں آتی۔ وہ سیدھے سادے انداز میں اپنا مدعا پیش کرتی ہیں۔انھیں نہ تو اپنا علم بگھارنے کا شوق ہے اور نہ ہی اپنی ادبی شخصیت اور افسری کا زغم وہ عام فہم انداز میں اپنی بات قاری کے ذہن میں منتقل کرتی ہیں۔روزمرہ، محاورے، ضرب الامثال اور برجستہ شعروں کے استعمال سے ان کے کالم ادبیت کے حسن سے لبریز ہوتے ہیں۔ان کا لہجہ اور بات کرنے کا انداز رواں دواں ہے۔ان خوبیوں نے ان کے کالموں کو بیک وقت فصاحت و بلاغت کے محاسن سے نوازا ہے۔سرکاری افسر ہونے کے باوجود وہ جراتِ اظہار کی خصوصیت سے بہرہ ور نظر آتی ہیں۔انھوں نے اپنے کالموں میں حالات کا تجزیہ ضمیر کی روشنی میں کیا ہے۔اپنے ایک کالم ''حالات حاضرہ کو کئی سال ہو گئے'' میں وہ عوام کے دکھ درد میں یوں شریک ہوتی ہیں:

''کوئی دن نہیں جاتا کہ دس گیارہ بندے قتل نہ کر دیتے جاتے ہوں۔زخمیوں کا شمار اس کے
علاوہ ہے۔وفاقی وزیر اطلاعات کا کہنا ہے کہ ''ایک کروڑ کے شہر میں چار پانچ انسانوں کی
ہلاکت سنگین صورت حال نہیں۔اتنے لوگ تو روزانہ لاہور میں مر جاتے ہیں۔یہ ایک

نہایت ایمان افروز بیان ہے۔اس کے کئی پہلو قابل غور ہیں (بیان کے) بھلے وقتوں میں، ایک کروڑ کے شہر میں ایک آدمی کی ہلاکت بھی سنگین ہوتی تھی۔ جیسے سیلاب کے دنوں میں انجینئر ہمیں بتاتے ہیں کہ دریا کا پانی خطرے کے نشان سے اتنا نیچے یا اتنا اوپر ہے۔ وطن عزیز میں چونکہ قبروں کی انجینئر نگ بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا کھرل صاحب کے یہ کوئی مشکل نہیں کہ سنگینی کی کوئی نشانی مقرر کردیں۔ ویسے ہم کھرل صاحب سے بالکل متفق ہیں۔ چار پانچ لوگوں کا مرنا بھی کوئی مرنا ہے کم از کم چار پانچ ہزار تو ہوں۔ ایک کروڑ کے حساب سے کوئی معزز فیصد تو نکل سکے۔"(۸۰)

پروین شاکر نے بہت کم عرصے کے لیے کالم لکھے۔ لیکن انھوں نے ترقی پسندی اور مزاحمتی روّیے کو اپنے کالموں میں خوب صورتی کے ساتھ سمویا ہے۔ ان کے انداز تحریر میں ایک جان اور شان پائی جاتی ہے۔ فکری حسن کے ساتھ ساتھ فنی حسن بھی قاری کو خوب حظ دیتا ہے۔ محض ادبی محاسن ہی کالم کے لیے کافی نہیں ہیں۔ بلکہ اس میں فکر وادب کا حسین امتزاج بھی ہونا چاہیے۔ پروین شاکر کے کالم اِس توازن کی عمدہ مثال ہیں۔ یہ کالم اپنی روانی میں ہمیں ایسی کہانی سناتے ہیں۔ جس کے تانے بانے ہماری قومی زندگی کے ماضی حال اور مستقبل کی ان سچائیوں سے ملتے ہیں۔ جن پر بالعموم پردے پڑے ہوتے ہیں۔ پروین شاکر نے اِس وقت اپنے "گوشہ چشم" میں ان پردوں کو اٹھایا جب دوسرے کالم نگار اس سے چشم پوشی برت رہے تھے۔ یہی وہ محاسن ہیں جو پروین شاکر کو ادبی کالم کی روایت اہم کالم نگار ثابت کرتے ہیں۔

☆☆☆☆

مذکورہ کالم نگاروں کے علاوہ ایک طویل فہرست ہے جو ادبی کالم نگاری کی روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اہم کالم نگار ہیں جن کی ایک الگ پہچان ہے۔دورِ حاضر میں تو کالم نگاروں کی ایک اچھی خاصی کھیپ تیار ہو چکی ہے۔ان میں تا دمِ تحریر جو نام ذہن میں آرہے ہیں وہ یہ ہیں (ہوسکتا ہے کہ کئی نام لکھنے سے رہ بھی جائیں تو یہ سہواً ہوگا قصداً نہیں۔) ڈاکٹر اجمل نیازی، منّو بھائی، حامد میر، عبدالقادر حسن، اوریا مقبول، سعد اللہ جان برق، ایاز میر، مشتاق شباب، ناصر علی سید، مریم گیلانی، مظہر گیلانی، آبادشاہ پوری، اظہر امرتسری، ابوسعید بزمی، زیڈ۔اے سلہری۔ارشاد احمد حقانی، رفیق ڈوگر، مجیب الرحمان شامی، سلیم آفاقی، نذیر ناجی، اثر چوہان، ظہیر کاشمیری، عباس اطہر، افتخار نسیم، افتخار الدین خٹک، جمیل مرغز، اکرام رانا، منیر احمد منیر، حمید اختر، ظہیر بابر، اے ار خالد، کشور ناہید، صالح محمد صدیق، سردار محمد صادق، انور قدوائی، بلال احمد، حمید رضا صدیقی، محمد صلاح الدین، نعمان تاثیر، مظفر قریشی، احمد حمید، اظہر جاوید، حفیظ صدیقی، زہرہ نقی، نصر اللہ خاں، ظہیر کاشمیری، ظہور الحسن ڈار، ڈاکٹر اسرار احمد، پروفیسر محمد سلیم، ڈاکٹر ہمایوں ہما، الطاف گوہر، قیوم قریشی، ادیب جاودانی، بشریٰ رحمٰن، منیر نیازی، جواد نظیر، مرزا اسلم بیگ، حبیب الرحمٰن، عطاء الرحمٰن، مجاہد منصور، حسن رضوی، اظہر سہیل، ابوالانجم برلاس، ضیا شاہد، اعظم سہروردی، احمد سعید، حسنین جاوید، اظہر ندیم، عبدالقدیر رشک، وارث میر، انعام درانی، سلیم صافی۔

آج ان کالم نگاروں کا موضوع زیادہ تر سیاست ہے۔ساتھ سماجی اور معاشرتی مسائل پر بھی خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ادب کو بھی اپنے کالم کا موضوع بنا دیتے ہیں۔بہرکیف موضوع کوئی بھی ہو یہ کالم نگار اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں سرگرمِ عمل ہیں۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ اے حمید، ''چاند چہرے''، مکتبہ القریش لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۔ ۷

۲۔ ایضاً، ص۔ ۳۰

۳۔ ایضاً، ص۔۵۵

۴۔ ایضاً، ص۷۔۸

۵۔ ایضاً، ص۔۵۷

۶۔ ایضاً، ص۔۱۱۷

۷۔ ایضاً، ص۔۷۔۸

۸۔ ایضاً، ص۔۹

۹۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ''کاظم علی جوان''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔ جولائی ۲۰۰۹ء، ص۔ ۱۲۔۲۲

۱۰۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ''اُردو ادبی صحافت'' الوقار پبلی کیشنز لاہور دسمبر ۲۰۰۸ء، ص۔۳

۱۱۔ ایضاً، ص۔۱۱

۱۲۔ ایضاً، ص۔۱۴۱

۱۳۔ ایضاً، ص۔۱۹۹

۱۴۔ ایضاً، ص۔ ۱۱۲

۱۵۔ ایضاً، ص۔۱۸۵

۱۶۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی کالم نگاری''، مشمولہ: 'حدیث دیگراں' الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۹ء ص۔۶۲۲

۱۷۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ''اُردو ادبی صحافت''، ص۔ ۷۰

۱۸۔ ایضاً، ص۔۷۰

۱۹۔ ایضاً،ص۔ ۵۲،۵۱

۲۰۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ''پچیسواں گھنٹہ'' الوقار پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ء ص۔ ۲۱۸

۲۱۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ''اُردو ادبی صحافت''، ص۔ ۱۸۲

۲۲۔ یونس کا قیاسی، '' جانے کس جرم کی سزا پائی ہے سزا یاد نہیں''، مشمولہ: 'حدیث دیگراں'، ص۔ ۱۵۱

۲۳۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ''پچیسواں گھنٹہ''، ص۔ ۶۶۷

۲۴۔ ایضاً،ص۔ ۶۷۹

۲۵۔ ایضاً،ص۔ ۲۸۰

۲۶۔ ایضاً،ص۔ ۷۲۱

۲۷۔ پروفیسر اقبال پراچہ، ''ڈاکٹر ظہور احمد اعوان اور کالم نگاری''، مشمولہ: 'حدیث دیگراں'، ص۔ ۶۳۰

۲۸۔ ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی، حساب دوستاں، مشمولہ: 'حدیث دیگراں'، ص۔ ۴۰۶

۲۹۔ انور خواجہ، ''سرِ دلبراں''، مشمولہ: 'حدیث دیگراں'، ص۔ ۳۹۳،۳۹۲

۳۰۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ''چہرہ بہ چہرہ'' ادارہ علم وفن پشاور ۱۹۹۹ء، ص۔ ۳۰۸

۳۱۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ''سب دوست ہمارے'' ادارہ علم وفن پشاور ۱۹۹۲ء، ص۔ ۶۴

۳۲۔ ایضاً،ص۔ ۷۱

۳۳۔ ایضاً،ص۔ ۷۹

۳۴۔ پروفیسر گل ناز، ڈاکٹر ظہور اعوان کی خاکہ نگاری کا جائزہ، مشمولہ: ''حدیث دیگراں''، ص۔ ۵۲۴،۵۲۳

۳۵۔ پروفیسر گل ناز، ''سیاسی چہرے کا تنقیدی جائزہ''، مشمولہ: 'حدیث دیگراں، ص۔ ۴۸۷

۳۶۔ پروفیسر گل ناز، ''سب دوست ہمارے کا تنقیدی جائزہ''، مشمولہ: 'حدیث دیگراں، ص۔ ۴۳۴

۳۷۔ شمائلہ عنبر، ''گنگا جمنا کے دیس میں''، مشمولہ: 'حدیث دیگراں، ص ۲۶۷۔۲۶۸

۳۸۔ مختار علی خان خٹک، ''اکیسویں صدی، ایک رسالہ''، مشمولہ: 'حدیث دیگراں'، ص۔ ۶۲۳

۳۹۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ''پچیسواں گھنٹہ'' ص۔ ۵۵۔۵۶

۴۰۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین، ''ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی کالم نگاری'' مشمولہ ''حدیث دیگراں'' ص۔ ۶۲۱۔۶۲۲

۴۱۔ پروفیسر اشرف بخاری، ''کتابوں پر تبصرہ''، مشمولہ ''حدیث دیگراں'' ص۔ ۶۱۳

۴۲۔ عطاء الحق قاسم، فلیپ ''کالم تمام''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ، ۱۹۹۳ء

۴۳۔ ایضاً، فلیپ

۴۴۔ ایضاً، فلیپ

۴۵۔ ایضاً، فلیپ

۴۶۔ ایضاً، فلیپ

۴۷۔ ایضاً، فلیپ

۴۸۔ ایضاً، فلیپ

۴۹۔ ایضاً، فلیپ

۵۰۔ ایضاً، فلیپ

۵۱۔ ایضاً، فلیپ

۵۲۔ اسحاق وردگ ''کالم نگاری کی روایت''، غیر مطبوعہ مضمون

۵۳۔ ازھر منیر ''یہ نصف صدی کا قصہ ہے''، تخلیقات، لاہور، مارچ ۱۹۹۳ء ص۔ ۱۷

۵۴۔ انٹرویو۔۔۔۔۔امجد رؤف خان، مطبوعہ ''سیارہ ڈائجسٹ'' لاہور، جون ۱۹۹۱ء، ص۔۲۱

۵۵۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، ''اردو صحافت میں طنز و مزاح''، فیروز سنز لاہور، ۱۹۹۶ء، ص۔۲۴۳

۵۶۔ ایضاً، ص۔۲۴۳

۵۷۔ عطاء الحق قاسمی، فلیپ ''روزنِ دیوار سے'' نگارشات مطبوعات لاہور، ۱۹۷۸ء

۵۸۔ ڈاکٹر فوزیہ چودھری، ''شاداب موسموں کی آواز''، نستعلیق مطبوعات لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۔۶۰

۵۹۔ عطاء الحق قاسمی، ''کالم تمام''، ص۔۹۶

۶۰۔ ڈاکٹر فوزیہ چودھری، ''شاداب موسموں کی آواز''، ص۔۶۱

۶۱۔ امجد اسلام امجد، ''چشم، تماشا'' روزنامہ ''جنگ'' لاہور ، ۱۴ اگست ۱۹۸۲ء

۶۲۔ عطاء الحق قاسمی، ''کالم تمام''، ص۔۱۲۱

۶۳۔ عطاء الحق قاسمی، ''روزنِ دیوار سے'' سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ، مارچ ۱۹۹۱ء ، ص۔۲۳۶

۶۴۔ عطاء الحق قاسمی، فلیپ، ''روزنِ دیوار سے مطبوعات لاہور، ۱۹۷۸ء

۶۵۔ ڈاکٹر فوزیہ چودھری، ''شاداب موسموں کی آواز''، ص۔۵۹

۶۶۔ عطاء الحق قاسمی، فلیپ ''کالم تمام''

۶۷۔ ارشاد احمد حقانی ، ''جب تخت گرائے جائیں گے''، مشمولہ: چوراہا، سارنگ پبلی کیشنز لاہور ، ۱۹۹۷ء، ص۔۴

۶۸۔ حسن نثار، ''چوراہا''، ص۔۴۵

۶۹۔ ایضاً، ص۔۴۱

۷۰۔ ایضاً، ص۔۸

۷۱۔ ایضاً، ص۔۲۵

۷۲۔ ایضاً، ص۔۵۵

۷۳۔ حبیب الرحمٰن ''صحافت کی دنیا کا معروف نام''، مشمولہ ''قیاس آرائیاں''، منظورِ عام پریس پشاور، مارچ ۲۰۰۹ء، ص۔۳

۷۴۔ یونس قیاسی، ''قیاس آرائیاں''، ص۔ ۱۱

۷۵۔ ایضاً، ص۔۱۵

۷۶۔ ایضاً، ص۔۲۸

۷۷۔ ایضاً، ص۔۱۱۶

۷۸۔ ایضاً، ص۔۱۳

۷۹۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب، ''اُردو صحافت اور فکاہیہ کی روایت''، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۷ء، ص۔۲۷۴

۸۰۔ ''پروین شاکر چشم تماشا'' ص ۲۳

☆☆☆☆

بابِ پنجم

پاکستان میں ادبی کالم نگاری مجموعی جائزہ

باب پنجم

پاکستان میں ادبی کالم نگاری مجموعی جائزہ

انسان کی فطرت میں تحقیق اور تلاش کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہے اور اسی جذبے کی وجہ سے صحافت اور دیگر ذرائع ابلاغ وجود میں آئے۔

صحافت کے لغوی معنی نامہ نگاری کے ہیں۔صحیفہ کا مطلب ہے رسالہ یا کتاب۔صحیفہ ایسے شائع شدہ مواد کو بھی کہتے ہیں۔جس کا مقصد معاشرے کو معلومات فراہم کرنا ہو۔صحافت وہ ذریعہ ہے۔جو اقوام عالم کے سیاسی ،معاشرتی ،معاشی ،تہذیبی اور ثقافتی حالات سے عوام کو معلومات فراہم کرتا ہے،موجودہ زمانے میں بڑھتی ہوئی ترقی اور مصروفیات کی وجہ سے زندگی کی شکل وصورت تبدیل ہوگئی ہے۔سائنس وٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی سے صحافت کے خدوخال بھی بہت زیادہ ترقی یافتہ ہوگئے ہیں۔صحافت کو ریاست کے چوتھے ستون کا درجہ حاصل ہے۔صحافت ایسی طاقت ہے جو حکومت کی حکمت عملی کارکردگی اور منصوبہ بندی پر اثر انداز ہوتی ہے۔حکومت کے ساتھ ساتھ صحافت عوام میں بھی ایک مؤثر کردار رکھتی ہے۔عوام کی سیاسی ،نفسیاتی اور تہذیبی تربیت میں صحافت مرکزی کردار رکھتی ہے۔عوام کی رائے بنانے اور بگاڑنے میں صحافت کا مثبت اور منفی کردار کا عمل دخل تسلیم شدہ ہے۔

رائے عامہ کی تشکیل ،عوام کی ترجمانی ،قومی شعور کی بیداری ،زندگی کا آئینہ ،معلومات کا ذریعہ حکومت اور عوام میں رابطہ کاری فکری رہنمائی حکمرانوں کے غلط طرز عمل کا احتساب اور قومی ترقی میں اپنا کردار ادا کرنا صحافت کے بنیادی فرائض ہیں۔صحافت اور معاشرہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ایک کی ترقی ،ارتقا اور موجودگی دوسرے کی تکمیل اور ترقی کی ضامن ہے۔بامقصد صحافت قومی اور معاشرتی زندگی پر گہرے اثرات

مرتب کرتی ہے۔اس لیے صحافت کو عوام کی رائے کی ترجمان کہا جاتا ہے۔

اُردو صحافت کی تشکیل میں اردو زبان و ادب کے اہل قلم نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اردو ادب ہی کے سہارے اردو میں صحافت کی روایت آگے بڑھی۔ صحافت اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اگر چہ صحافت کی زبان و انداز تحریر ادبی تحریر سے مختلف ہوتا ہے۔ تاہم پھر بھی ماہرین اسے ادب ہی کی ایک شاخ سمجھتے ہیں۔ادب اور صحافت میں کئی رابطے ہونے کے باوجود ہر دو الگ الگ شعبے ہیں۔ادب و صحافت کا مواد، موضوع، طرز اظہار جداگانہ اہمیت کا حامل ہے۔ادب اور صحافت کے قاری کی ذہنی سطح اور مطالبات و تقاضوں میں فرق ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی ادب کسی زمانے کے خارجی حالات و واقعات کے مقابلے میں اس زمانے کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ ادیب لکھتے وقت اپنے داخلی محرکات، جذبات و احساسات سے بھی اثر لیتا ہے۔ جب کہ صحافی صرف خارجی عوامل ہی کو عام فہم اور سادہ طرز تحریر میں بیان کرتا ہے۔

اُردو صحافت کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو صحافت نشو ونما میں اردو کے شاعروں ادیبوں کا واضح کردار نظر آتا ہے۔ وہ صحافتی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اپنے ادبی ذوق کی تشکیل بھی کرتے رہے۔ درحقیقت اردو صحافت نے اردو ادب کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔اردو صحافت کے ابتدائی دور کے مدیران کی اکثریت شعر و ادب سے وابستہ تھی۔

اُردو نثر کی ابتداء دکن سے ہوتی ہے۔نثر کا اب تک دریافت شدہ نثر کا نمونہ ''سب رس'' ہے۔اس سے قبل بھی نثر نے ابتدائی منزلیں طے کی ہیں۔لیکن وہ مذہبی یا اخلاقی موضوعات پر ہیں ''سب رس'' سے قبل نثر کے لکھنے والوں کے لہجے میں سادگی، روانی اور صفائی ملتی ہے۔تاہم لفظوں کے استعمال میں فنکارانہ حسن کاری کا فقدان ہے۔

اُردو نثر کے اُسلوب کی ترقی کا دوسرا دور شمالی ہندوستان میں تحسین کی ''نوطرز مرصع'' ہے۔اس دور کی نثر میں پر تکلف انداز بیان مقفیٰ و مسجع عبارات آرائی ہے۔ جو فارسی اسلوب کے زیر اثر رواج پذیر ہوئی۔

اُردو نثر کا تیسرا دور ''نوطرز مرصع'' سے ''فورٹ ولیم کالج'' تک ہے۔فورٹ ولیم کالج کی نثر کا اعلیٰ

نمونہ میر امن کی باغ و بہار کی صورت میں ملتا ہے۔ اسی دور میں اردو کا اولین ترجمان اخبار ''جام جہاں نما'' منظر عام پر آیا۔ مارچ سے جون ۱۸۲۲ء کے وسط تک یہ اخبار اُردو میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۸۳۰ء میں ایسٹ انڈیا کی کمپنی نے محسوس کیا کہ جب تک فارسی زبان سرکاری زبان رہے گی۔ اس سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں۔ چنانچہ اس نے اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ اس سے اُردو نثر کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس دور میں اخبارات کے دو بڑے مراکز تھے۔ اول دہلی دوم لاہور۔ آہستہ آہستہ اُردو صحافت ہندوستان کی طول و عرض میں پھیلنے لگی۔

ہم ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بیشتر اُردو صحافت کی ترقی کا جائزہ اختصار سے لیں گے۔ تاکہ اُردو نثر کے اسلوب کا وہ تاریخی پس منظر سمجھ سکیں۔ جس کے بطن سے بعد ازاں اُردو کالم کے نمائندہ اسالیب نے جنم لیا۔

اُردو نثر کے فروغ میں ابتدائی کردار ''دہلی اخبار'' نے ادا کیا۔ محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر اس کے منتظم تھے۔ اس خبار میں سلیس و رواں نثر میں خبریں اور واقعات درج ہوتے تھے۔ عبارت رنگین و مسجع نثر کے بجائے سادہ اور عام فہم ہوتی تھی۔ ''سید الاخبار'' ۱۸۳۷ء میں سر سید احمد خان کے بھائی سید محمد خان کی نگرانی میں شائع ہوا۔ اُردو صحافت کا ایک اہم دور سر سید احمد خان سے شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے دسمبر ۱۸۷۰ء میں ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ ان سے پہلے صحافت کا طرز بیان شاعرانہ انداز بیان رکھتا تھا۔ زبان شاعرانہ، پر تکلف اور لفاظی سے بھرپور تھی۔ ''تہذیب الاخلاق'' نے اُردو نثر کا ایسا نمونہ پیش کیا۔ جس میں اُردو نثر آئندہ سو سال تک ڈھلتی رہی اور اس نے رنگین مقفٰی اور خیالی نثر اور داستانی و شاعرانہ انداز بیان پر خط تنسیخ پھیر دیا۔

اُردو صحافت و نثر کے ایک اہم اسلوب کی بنیاد ''اودھ پنچ'' سے پڑتی ہے۔ مزاح، طنز اور ظرافت اس اسلوب کی روح ہے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں جب کہ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اُردو صحافت میں سنجیدگی، گہرائی اور فکر و نظر کی بلندی پیدا ہو رہی تھی۔ اسی زمانے میں لکھنؤ قہقہوں کا گلشن بنا ہوا تھا۔ ''اودھ پنچ'' لکھنؤ سے جنوری ۱۸۷۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے مدیر و منتظم منشی سجاد حسین تھے۔ جبکہ دیگر لکھنے والوں میں اکبر الٰہ آبادی

مرزا مچھو بیگ وغیرہ شامل تھے۔اس اخبار نے سرسید احمد خان کی تحریک پر خوب طنز کیا۔

مشہور ناول نگار عبدالحلیم شرر نے اُردو صحافت کو''تہذیب'' اور''دل گداز'' کی صورت میں خوب صورت رسائل دیئے۔انھیں اپنے اُسلوبِ بیان کے قدرت و دل کش موضوعات کی رنگا رنگی اور سلاستِ زبان کے اعتبار سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

بیسویں صدی کے دیگر نمایاں اخبارات میں''ہندوستانی''،''لکھنو''،''قیصر الاخبار دھلی''، ''پنجابی اخبار''، ''رفیق ہند''، ''آفتاب پنجاب''لاہور، ''کشف الاخبار''بمبئی، ''اخبار عام''، ''پیسہ اخبار ''لاہور، وغیرہ شامل ہیں۔

بیسویں صدی کے آتے آتے اُردو صحافت نے ترقی وبلوغت کے کئی مراحل طے کر لیے ہیں۔نئی صدی کے آغاز میں صحافت اور ادب میں سرسید احمد خان کی عقلیت کے خلاف ردعمل پیدا ہوا۔لہٰذا ''مخزن'' کے بیشتر لکھنے والوں پر رومانیت غالب تھی۔یوں بتدریج صحافت جو ادب کے دائرہ اثر سے باہر چلی گئی تھی۔پھر ادب کے سانچے میں ڈھلنے لگی۔نئی صدی میں صحافت سے وابستہ اہل قلم کی اکثریت بنیادی طور پر شاعر و ادیب کی تھی۔مولانا ظفر علی خان، محمد علی جوہر، ابولکلام آزاد، حسرت موہانی بیک وقت شاعر و ادیب بھی تھے اور اپنے عہد کے معتبر صحافی بھی تھے۔انھوں نے اپنے دست ہنر سے صحافتی اُسلوب کو ادبی اُسلوب بنا دیا۔

ابوالکلام آزاد اُردو زبان و ادب و صحافت میں بے مثل اُسلوب کے خالق ہیں۔انھوں نے اپنے عہد ساز ہفت روزہ''الہلال'' سے صحافت کے ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد رکھی۔مولانا ظفر علی خان کی تربیت اپنے والد کے زیر سایہ ہوئی۔مولانا ایک شعلہ بیان خطیب بھی تھے۔جس کے اثرات ان کی تحریروں میں بھی جھلکتے ہیں۔مولانا محمد علی جوہر نے ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو روز نامہ''ہمدرد'' جاری کیا۔انھوں نے صحافت کے ذریعے قوم کے اندر جذبہ آزادی اجاگر کرنے کی کوشش کی۔''ہمدرد'' نے دنیا بھر میں استعماری طاقتوں کے خلاف ملت اسلامیہ میں تحریک منظم کی۔

صحافت کے اس دور میں بالترتیب قاضی عبدالغفار نے ''جمہور'' مولانا سید حبیب نے ''سیاست'' وحید الدین سلیم ''مسلم گزٹ'' حامد انصاری ''مدینہ'' دیانرائن نگم کا ''زمانہ'' سید سلیمان ندوی ''معارف'' مولانا حسرت موہانی ''مستقل'' ملک نصراللہ عزیز کا ''مدینہ'' اور سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ''الجمعیۃ'' شائع کیے۔ اُردو صحافت کا ایک اور اہم دور بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں شروع ہوتا ہے۔ اس عہد کا سب سے اہم اخبار ''انقلاب'' ہے۔ جو نامور اور تجربہ کار صحافیوں مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر کی ادارت میں ۱۹۲۷ء میں نظر عام پر آیا۔

اب رفتہ رفتہ اخبارات میں جدید رجحانات کے تحت سیاسی اور صحافتی شاعری چھپنے لگی۔ چراغ حسن حسرت شروع میں ''آفتاب'' کلکتہ میں کولمبس کے قلمی نام سے کالم لکھتے تھے۔ حسرت کا بڑا کارنامہ ہفت روزہ ''شیرازہ'' کا اجرا تھا۔ یہ ایک علمی، ادبی اور مزاحیہ ہفت روزہ تھا۔ اس میں سالک کا فکاہیہ کالم ''افکار و حوادث'' بھی چھپتا رہا۔ ۱۹۳۸ء میں مولانا غلام مرتضیٰ میکش، چراغ حسن حسرت اور باری علیگ نے ''احسان'' سے علیحدہ ہوکر ''شہباز'' کا اجراء کیا۔

آزادی کی مہم کو تیز کرنے کے لیے مختلف سیاسی جماعتوں کے ترجمان اخبار بھی اسی دور میں چھپنے لگے۔ اتحاد پارٹی کا ہم خیال ''رہبر ہند'' مجلس احرار اسلام کا ''آزاد'' اس کی مثالیں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں تین اہم نئے اخبار منظر عام پر آئے ان میں ''نوائے وقت''، ''انجام'' اور ''جنگ'' شامل ہیں۔ تاہم انھیں مقبولیت قیام پاکستان کے بعد ملی۔

اُردو صحافت کے جدید دور آغاز قیام پاکستان سے ہوتا ہے۔ ''نوائے وقت'' آغاز میں پندرہ روزہ جریدہ کی شکل میں چھپتا تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اس کا پہلا پرچہ نکلا اور ۲۲ جولائی ۱۹۴۴ء میں یہ روزنامے کی صورت میں چھپنے لگا۔

ادبی کالم نگاری کے فروغ میں ''نوائے وقت'' کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ پاکستان کے مقبول ترین اخباروں میں روزنامہ ''جنگ'' کا نام سرفہرست رہا ہے۔ اس کا آغاز دوسری جنگ عظیم کے آغاز یعنی ۱۹۳۹ء میں ہوا۔

پاکستان بننے کے بعد یہ کراچی منتقل ہوگیا۔ اور یہاں سے اس کی اشاعت کا سلسلہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو شروع ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد ''انجام'' بھی دہلی سے کراچی منتقل ہوگیا تھا۔ یہ اپنے وقت کا کامیاب ترین اخبار تھا۔ روزنامہ ''امروز'' بھی اُردو صحافت کا ایک معتبر اخبار گزرا ہے۔ یہ اخبار پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے زیر اہتمام ۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو چھپنا شروع ہوا۔ یہ ترقی پسند رجحانات اور بائیں بازو کی سیاست کا ترجمان تھا۔ ۱۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو لاہور سے وقار انبالوی کی ادارت میں روزنامہ ''سفینہ'' کا آغاز ہوا۔ اس دور کے دیگر اہم اخبارات میں لاہور سے روزنامہ ''آفاق'' اور ہفت روزہ ''چٹان'' راولپنڈی سے روزنامہ ''کوہستان'' کراچی سے روزنامہ ''حریت'' نمایاں اخبارات ہیں۔

۱۶ ستمبر ۱۹۶۳ء کو لاہور سے پاکستان کے رجحان ساز صحافی عنایت اللہ نے روزنامہ ''مشرق'' جاری کیا۔ ماہرین صحافت کے نزدیک یہ اُردو کا پہلا مکمل اخبار رہا ہے۔ ''مشرق'' نے اخبارات کو جدت طرازی کی ایسی راہ دکھائی جس پر چلنے ہی میں اخبارات کو اپنی کامیابی نظر آئی۔

سقوط ڈھاکہ، پاک انڈیا جنگ، عام انتخابات کی ہنگامہ خیزیوں کی وجہ سے ۱۹۷۰ء کی دہائی پاکستان میں سیاسی حوالے سے بڑی ہنگامہ خیز رہی ہے۔ سیاسی جماعتوں نے اپنے ترجمان اخبارات کی اشاعت شروع کی تاکہ عوامی رائے اپنے حق میں ہموار کی جاسکے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنی پالیسیوں کو عوام تک پہنچانے کے لیے روزنامہ ''مساوات'' لاہور کا اجراء کیا۔ جماعت اسلامی نے ۱۹۷۰ء کو ملتان اور کراچی سے روزنامہ ''جسارت'' جاری کیا۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۹۰ء کو لاہور سے روزنامہ ''پاکستان'' جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر ضیا شاہد اور مالک اکبر علی بھٹی تھے۔ روزنامہ ''پاکستان'' سے علیحدگی کے بعد ضیاء شاہد نے ۲۶ ستمبر ۱۹۹۲ء کو ''خبریں'' جاری کیا۔

کراچی سے رونامہ ''اُمت'' کی آمد بھی ایک کامیاب کوشش ہے۔ معروف کالم نگاروں منو بھائی اور حسن نثار نے ۱۹۹۵ء میں روزنامہ صداقت جاری کیا۔ لیکن یہ بھی بند ہو گیا۔ ان روزناموں کے علاوہ پاکستان کے چاروں صوبوں سے وقتاً فوقتاً اخبارات ورسائل نکلتے رہے ہیں۔ لیکن ان میں اکثریت ایک خاص دائرے تک محدود ہے۔ ان میں روزنامہ ''دن'' روزنامہ ''آج'' پشاور، روزنامہ ''میدان'' پشاور، روزنامہ ''مشرق'' پشاور اور روزنامہ ''جناح'' اسلام آباد وغیرہ شامل ہیں۔

تادم تحریر پاکستانی صحافت پر روزنامہ ''ایکسپریس'' چھایا ہوا ہے۔ جو گیارہ بڑے شہروں سے شائع ہونے والا واحد کثیر الاشاعت روزنامہ ہے۔ اب میڈیا میں ایک نئے انقلاب کا دروازہ کھل چکا ہے۔ اور بڑے اخباری ادارے اپنے نیوز چینل بھی شروع کر چکے ہیں۔ جن میں ''جنگ'' کا جیو، نوائے وقت کا ''وقت'' چینل ایکسپریس کا ''ایکسپریس نیوز'' اور ''خبریں'' کا گروپ ۵ شامل ہے۔ پاکستانی صحافت اب عالمی سطح کی صحافت سے ہم آہنگ ہو چکی ہے۔ اور جدید رجحانات اور تقاضوں کی تکمیل کے لیے تیار ہے۔

کالم نگاری عصری صحافت کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخباری دنیا میں کالم کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اب کالم نگار ملکی سطح پر معتبر اور منفرد شناخت کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے اخبارات ورسائل میں کالم کے لیے خصوصی گوشے مختص کیے جاتے ہیں۔ کالم صحافت کی بنیادی ضرورت کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ اب کالم نگاری نے ایک ایسے ادارے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جو عوام کی سوچ، فکر اور رائے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اخبارات مقبول کالم نگاروں کو بھاری معاوضے دیتے ہیں۔ اب معروف کالم نگاروں کے کالموں کے مجموعے شائع ہوتے ہیں۔

کالم عصر حاضر میں صحافت کی ایک مقبول ترین اصطلاح اور صنف کا نام ہے۔ جدید سماجی تصورات کے حوالے سے کالم کو اب صحافت کی روح کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایک وسیع المعانی لفظ ہے۔ اُردو نے کالم کی اصطلاح کو

جوں کا توں انگریزی سے مستعار لیا ہے اور تقریباً انگریزی ہی کے مفہوم پر اُردو میں بھی کالم کے ہی معنی نکلتے ہیں۔

کالم کے لغوی اور اصطلاح معنی الگ الگ ہیں۔ اُردو اور انگریزی لغات کے مطابق کالم سے مراد صفحے کا حصہ خصوصاً اخبار کا خانہ، فوج کا دستہ، ستون، کھمبا، وغیرہ ہیں۔ اسی طرح ماہرین نے بطور اصطلاح کالم کی جو تعریف واضع کی ہے اس کے مطابق کسی مستقل عنوان کے تحت اخبار یا رسالے میں باقاعدہ تحریر کو کالم کہتے ہیں۔ زندگی کے کسی شعبے میں ہونے والے کسی عمل کے متعلق قلم کار کا ہلکے پھلکے انداز میں ایسا نامکمل اظہار خیال کالم کہلاتا ہے۔ جو لکھنے والے کی اپنی اپروچ اور اپنے اُسلوب کا مظہر ہو۔

ذرائع ابلاغ کی ترقی اور زندگی کے پھیلاؤ سے کالم کی شکل وصورت نے بھی خاصی ترقی کر لی ہے۔ اب کئی اقسام کے کالم لکھے جارہے ہیں۔ جن میں سیاسی کالم، طبی کالم، دینی یا مذہبی کالم معاشرتی یا سماجی کالم، ثقافتی کالم، خواتین کے کالم، تعلیمی کالم فکاہیہ کالم، ادبی کالم، مکتوبی کالم، ترکیبی کالم وغیرہ شامل ہیں۔ سیاسی کالم میں ملکی اور بین الاقوامی سیاسی صورت حال کا تجزیہ کیا جاتا ہے طبی کالم میں مستند اور تجربہ کار ڈاکٹر، اطباء، اور ہومیو پیتھک ڈاکٹر قارئین کے طبی مسائل اور بیماریوں کے بارے میں مشورے دیتے ہیں۔ دینی کالم ممتاز اور مستند علمائے کرام تحریر کرتے ہیں۔ ان کالموں میں دینی مسائل عبادات اور دیگر فقہی امور کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔

معاشرتی یا سماجی کالم میں زندگی کے مسائل اور المیوں کو سنجیدہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ثقافتی کالم کسی ثقافتی تقریب پر روداد یا تبصرے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ خواتین کا کالم بالعموم خواتین لکھتی ہیں۔ جن میں خواتین کے مسائل اور دلچسپی کی چیزیں زیر بحث لائی جاتی ہے۔ تعلیمی کالم تعلیمی امور کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ ذاتی ڈائری نما کالم میں اداریئے کی عبارت کی طرح ٹھوس انداز میں کالم نگار اپنی سرگزشت قسط وار چھاپتا ہے۔ فکاہیہ کالم میں شگفتہ انداز تحریر میں روزمرہ کے مسائل کو طنزیہ ومزاحیہ رخ سے دیکھا جاتا ہے۔ مکتوبی کالم میں قارئین کی آراء اور تجاویز کو جگہ دی جاتی ہے۔ ادبی کالم میں ادبی موضوعات کو توجہ کا مرکز بنایا جاتا ہے۔ ادب ایک کثیر

المعانی اصطلاح ہے۔ادب کی تعریف کے ضمن میں نقطہ ہائے نظر کا اختلاف ہمیشہ موجود رہا ہے۔ یہ لفظ عربی سے اُردو میں آیا ہے۔عربی میں یہ لفظ انسان کے بلند شریفانہ فضائل کو ظاہر کرتا ہے۔جس کے لیے دوسرا لفظ ''تہذیب'' ہے۔ بعد میں استعارۃً میں سے وہ تمام علوم مراد لے جانے لگے۔ جو ذہنی شائستگی اور تمدنی تعلقات کی پاکیزگی سے متعلق ہیں۔

ادب کی اپنی خاص صفات ہیں۔اور اسی بنیاد پر ادبی اور صحافتی تحریر میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ادب اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی صحافت سے مختلف ہے۔ غیر ادبی تحریر کا مقصد اظہار تک محدود ہوتا ہے۔ جبکہ ادبی تحریر میں منصف کی اپنی ذات بھی شامل ہوتی ہے۔ادبی تحریر کا مواد عام انسانی دلچسپی پر مشتمل ہوتا ہے۔

غیر ادبی کے لیے یہ شرط نہیں۔ غیر ادبی تحریر کسی ہیئت کی پابند نہیں ہوتی۔ جب کہ ادبی تحریر کے لیے کسی ہیئت کا پابند ہونا لازم ہے۔ادبی تحریر تخیل سے کام لیتی ہے۔ جبکہ غیر ادبی تحریر کا بنیادمقصد معلومات کی ترسیل ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق ادب وہ فن لطیف ہے جس کے ذریعے ادیب جذبات وافکار کو اپنے خاص نفسیاتی وشخصی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ الفاظ کے واسطے سے زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی وتنقید بھی کرتا ہے۔اور اپنے تخیل اور قوت متخیلہ سے کام لے کر اظہار وبیاں کے ایسے موثر پیرائے اختیار کرتا ہے جن سے سامع وقاری کا جذبہ وتخیل بھی تقریباً اسی طرح متاثر ہوتا ہے۔جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل اور جذبہ متاثر ہوا مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ادب کی مکمل تعریف یہی ہو سکتی ہے۔ کہ ادب کی مکمل تعریف نہیں ہو سکتی ہے۔

اُردو صحافت میں کالم نویسی کے آغاز کا سہرا ابوالکلام آزادؔ کے سر بندھتا ہے۔ جنھوں نے مستقل عنوان اور طرز بیان کے ساتھ کالم کی روایت شروع کی۔ پروفیسر شفیق جالندھری کے مطابق اُردو صحافت میں مستقل عنوان اور لکھنے والے کے نام کے ساتھ موجودہ انداز میں کالم کا آغاز ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزادؔ

نے ''الہلال'' میں ''افکار و حوادث'' کے عنوان سے ایک شگفتہ کالم شروع کیا۔ یہ طنزیہ اور مزاحیہ کالم تھا۔

سوال یہ ہے کہ ادبی کالم صحافت کا حصہ ہے یا ادب کی صنف ہے؟ کیونکہ مختلف آراء رکھنے والے شاعر و ادیب کے ہاں اس باب میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اُردو کے معروف ترین ادبی کلام نگار ڈاکٹر انتظار حسین سے صحافت کی ایک خاص صنف سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب ایک اعلیٰ و ارفع عمل ہے۔ ادبی کالم ادب کے اعلیٰ معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ اس لیے اسے ادبی صنف نہیں کہا جا سکتا۔ معروف نقاد اور ادبی کالم نگار ڈاکٹر ظہور احمد اعوان اس حوالے سے کہتے ہیں:

> ''کہ ادبی کالم ادب ہی کی ایک صنف ہے۔ اپنے موقف کی وضاحت میں وہ یہ دلیل دیتے ہیں۔ کہ پنجاب یونیورسٹی نے اسے اپنے نصاب میں بطور ادبی صنف شامل کیا ہے''۔(۱)

ان آراء کا تجزیہ کیا جائے تو حقیقت میں اسے ادب کا حصہ سمجھ لینا چاہیے اور اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ادبی کالم کے اپنے ضابطے اور قاعدے مقرر کیے جائیں۔ مثال کے طور پر ابن انشاء، خامہ بگوش ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کئی ادبی کالموں کے مجموعے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ابن انشاء کی مشہور طنزیہ و مزاحیہ کتاب ''اُردو کی آخری کتاب'' ابتدائی صورت میں کالم میں چھپتی رہی ہے اور اب یہ ایم اے اُردو کے نصاب میں شامل ہے۔

ادبی کالم، کالم نگاری کی ایک مقبول اور زرخیز قسم ہے۔ جس میں دلچسپ اور شگفتہ پیرائے میں زندگی کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ادبی اُسلوب کے حامل کالم نگار کی مقبول قسم طنز و مزح کے ادبی اُسلوب میں انسانی معاشرے کے مسائل کو ہلکے پھلکے انداز میں بیان کرنا ہے اور اس مقصد کے لیے طنز و مزاح کے سبھی حربوں کو مہارت کے ساتھ استعمال کرنا ہے۔ یہ کالم تخلیقی مزاح کے طبعی میدان اور خداداد صلاحیت سے وجود میں آتے ہیں۔ اس سے پڑھنے والے کی حس مزاح کی تہذیب ہوتی ہے۔ طنز و مزاح کو عام طور پر ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا جاتا

ہے۔ جبکہ طنز ایک علیحدہ اور مزاح ایک علیحدہ ادبی اصطلاح ہے۔ طنز بحیثیت صنف ادب بڑا اہم اور اثر آفرین حربہ ہے۔ اس کے ذریعے طنز نگار اہل وطن کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھتا ہے۔ طنز دراصل اصلاح کا ذریعہ ہے۔ طنز نگار مسلمہ اصولوں اور آفاقی قدروں کے پامال کرنے والوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُردو میں طنز و مزاح کے ابتدائی خدوخال ہمیں انگریز دور کے ظلم استبداد کے خلاف ردعمل کے طور پر نظر آتے ہیں۔ مزاح خوش طبعی وذکاوت کے ذہنی میلان سے جنم لیتا ہے۔

اس میں ایک فطری برجستگی کا وصف موجود ہے۔ ایک ماہر مزاح نگار میں ذہانت وذکاوت، بذلہ سنجی، کی خداداد صفات پائی جاتی ہیں۔ مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے۔ جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے۔ ادب وصحافت کے نکھار میں ادبی کالم کی روایت کو کسی طور پر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ صحافت کی پر خار وادی میں ادبی کالم احساس کی نزاکت، فکر کے آہنگ، ذوقِ جمالیات کی تہذیب اور صحافت کے نکھار کا ایسا نقیب ہے۔ جس کی تاریخ سے نامور اہل قلم شاعروادیب وابستہ رہے ہیں۔

ادبی کالم کے ابتدائی دور کے اہم کالم نگاروں میں عبدالمجید سالک ایک اہم کالم نویس ہیں۔ مولانا سالک ادارتی ذمہ داریوں کے ساتھ کالم بھی لکھتے رہے۔ جب ''افکاروحوادث'' کا کالم سالک کے حصے میں آیا تو انھوں نے اپنے ادبی اسلوب کے بل بوتے پر اسے شہرت دوام تک پہنچایا۔ سالک کے کالم ادبی اُسلوب اور فکری شائستگی کے دائرے میں ہوتے ہیں۔ ان میں طنز و مزاح کے نام پر عامیانہ پن، پھکڑ پن ذاتیات اور غیر شائستہ اندازِ تخاطب رائج نہ تھا۔ سالک کے کالموں کی زبان سادہ اور عام فہم رہتی۔ اس میں تصنع اور بناوٹ نام کو بھی نہ تھا۔ انھوں نے اپنی تحریر کو صحافتی عیوب سے بچا کر ادبی محاسن سے لبریز کیا۔ ادبی کالم نگاری میں چراغ حسن حسرت اپنے منفرد اسلوب، بذلہ سنجی اور امتیازی خصوصیات کی بنا پر صف اول کے بے مثال کالم نگاروں میں شامل رہے ہیں۔ وہ ایک قادرالکلام شاعروادیب تھے۔ انھوں نے کلاسیکی ادب کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ جس کی جھلک ان

کے کالموں میں بھی نظر آتی تھی۔ ان کی کالم نگاری پر طنز و مزاح کا ادبی رنگ غالب ہے۔ وہ لفظی ہیر پھیر کے ذریعے شگفتگی پیدا کرنے کی اعلیٰ مہارت رکھتے ہیں۔ بقول عبدالمجید سالک کہ زبان کے معاملے میں اہل زبان کے روزمرے اور محاورے کی پابندی ان کے لئے مذہب کا درجہ رکھتی تھی۔ ان کے کالموں میں ایک جہاں دیدہ، معاملہ فہم اور ذہین کالم نگار کے خدوخال اجاگر ہوتے ہیں۔

اُردو ادبی کالم کے ابتدائی دور میں کالم نگاری کو ادب کے ذائقوں سے آشنا کرنے والے اہل قلم میں عبدالماجد دریاآبادی کا نام اور کام بھی لائق تحسین ہے۔ ان کے کالموں میں ایک علمی و ادبی فضا چھائی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر تیس کی دہائی میں تہلکہ مچانے والے افسانوی مجموعے ''انگارے'' کی مخالفت بھی ان ہی کے کالموں میں ہوئی۔ ماجد بنیادی طور پر ایک ادیب تھے اور ادیب بھی ایسے جن کا ایک منفرد اور ناقابل تقلید اسلوب تھا انھوں نے ہر جگہ اس اسلوب کا جادو جگایا۔ وہ علمی ادبی اسلوب میں ایک ہلکی پھلکی خیال آرائی بھی کرتے ہیں۔ وہ ادبی کالم نگاروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو موقع محل کے مطابق اشعار کا برجستہ استعمال کرتے ہیں۔

حاجی لق لق نے فکاہیہ کالم اور ظریفانہ شاعری میں خوب نام کمایا۔ انھیں قدرت کی طرف سے حس مزاح ملی تھی ان کے ہاں صورت واقعہ کا مزاح فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ برتنے کا سلیقہ ملتا ہے۔ حاجی لق لق کا کالم تخیل پرواز، باریک بینی، سماج شناسی اور جملہ سازی کے پرتبسم نمونے ملتے ہیں۔ ان کی زبان اپنی سادگی اور بے ساختگی کی وجہ سے لفظی و معنوی اسقام سے پاک ہے۔ وہ کم سے کم لفظوں اور جملوں میں زیادہ سے زیادہ ادائے مطلب پر قادر ہیں۔

سعادت حسن منٹو کی بنیادی وجۂ شہرت افسانہ نگاری ہے۔ لیکن انھوں نے کالم نگاری کے شعبے میں بھی کامیاب تجربے کیے ہیں۔ اور اپنے ادبی اُسلوب اور کاٹ دار جملوں کے باعث اپنے دور کے کالم نگاروں میں نمایاں مقام حاصل کیا ان کے کالموں کا انتخاب ''تلخ ترش اور شریں'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ منٹو کالم کے

مزاج وکردار کو سمجھتے تھے۔ان کے کالموں میں ایک افسانوی اور ڈرامائی فضا ملتی ہے۔جو قاری کو پہلے لفظ سے آخری لفظ تک اپنے گرفت میں رکھتی ہے۔طنز منٹو کا خاص ہتھیار ہے۔منٹو نے پاکستان کے نامساعد حالات کے دور میں کالم لکھے اس لیے انھوں نے اپنے دور کی عکاسی کے لیے طنز و مزاح کو ادبیت کے ساتھ بطریق احسن استعمال کیا۔

ادبی کالم کو جن ہمہ جہت شخصیات نے اعتبار بخشا۔ان میں ایک معتبر نام مجید لاہوری کا بھی ہے۔قدرت نے ان کو شاعری کی صلاحیت سے بھی نوازا تھا اور نثر میں بھی وہ کالم نویسی اور مضمون نگاری میں رواں تھے۔تاہم انھیں سب سے زیادہ شہرت کالم نگاری سے ملی۔انھوں نے بڑے مقبول کالم نگاروں کے دور میں اپنی جداگانہ شناخت بنائی اور کالم کو عوامی سطح پر مقبول بنایا۔ان کو مزاح کے کئی حربوں کے استعمال میں فنی مہارت حاصل تھی۔وہ نئے اور انوکھے موضوعات کا انتخاب کرتے۔وہ عام واقعات کو بھی ادبی رنگ میں حسن ترتیب کے ساتھ بیان کرنے پر قادر ہے۔

شوکت تھانوی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت گزرے ہیں۔انھوں نے لگ بھگ ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔انھوں نے ناول بھی لکھے۔ڈرامے بھی لکھے،خاکہ نگاری اور شاعری بھی کی۔بنیادی طور پر وہ اعلیٰ پائے کے مزاح نگار تھے۔ ان کے کالموں میں ایک نوع کی ادبی چاشنی پائی جاتی ہے۔تقسیم ہند کے بعد ان کا کالم ''جنگ'' میں ''وغیرہ وغیرہ'' کے عنوان سے چھپنے لگا۔شوکت تھانوی نے روایتی موضوعات کی بھیڑ میں نئے موضوعات کی منفرد راہ نکالی۔اس لیے ان کے کالم اپنی تازگی اور ندرت کے باعث قارئین کو خوب حظ پہنچاتے ہیں۔

ابراہیم جلیس کے کالموں میں ترقی پسند نظریۂ ادب کے زیر اثر مساوات و جمہوریت کے خیالات ظریفانہ انداز تحریر کے پس منظر میں تحرک کا باعث بنتے ہیں۔ان کے کالم بامحاورہ اور سلیس اُردو کا عمدہ نمونہ ہیں اور یہ خصوصیت کسی تقلید کی اسیر نہیں بلکہ ان کی تخلیقی روشنی ہے۔اُردو کے بہت کم تخلیق کار ایسے ہیں۔جنھیں قدرت نے بے پناہ ہمہ جہت تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ان ہی بے بدل تخلیق کاروں میں ایک نمایاں نام ابن انشاء ہے۔

انھیں اُردو کے مقبول شعراء کے صف ادبی میں معتبر مقام حاصل ہے۔وہ غنائی لہجے کے شاعراور شگفتہ سفر نامہ نگار ہیں۔کالم نگاری میں بھی انفرادیت یہ ہے۔کہ انھوں نے صحافتی موضوعات کو بھی اپنے زورقلم کے ذریعے ادب کا موضوع بنایا۔ان کے کالموں کے مجموعے''خمار گندم''اور''اردو کی آخری کتاب'' وغیرہ بی۔اےاورایم۔اے سطح پر نصاب کا حصہ ہے۔ابن انشاء کی ادبی کالم نگاری کو معبر ناقدین نے سراہتے ہوئے انھیں اردو کے غیر معمولی کالم نگار کے درجے پر فائز کیا ہے۔ان کے ہاں ادبی ظرافت اصلاح اور مقصدیت کے تحت تخلیق ہوتی ہے۔

انتظار حسین کی بنیادی وجہ شہرت اُردو کے ایک بڑے افسانہ نگار کی ہے۔انھوں نے ناول بھی لکھے، ڈرامے بھی لکھے، تراجم بھی کیے اور یادنگاری سے بھی تعلق رکھا۔ان کی ادارت میں کئی اخبارات اورادبی رسائل شائع ہوتے رہے۔تاحال انتظار حسین کے کالموں کے دومجموعے''ذرے''اور ''بوند بوند'' شائع ہوچکے ہیں۔ انتظار حسین کے کالم شہر کے ادبی حلقوں ،ادبی محفلوں ،ادبی مباحث ،آرٹس کونسلوں اورادبی وتہذیبی فضا کے گرد گھومتے ہیں۔کلچر،تہذیب وثقافت اور نئے ادبی زاویے ان کے کالموں کے موضوعات بنتے ہیں۔وہ کبھی پاک ٹی ہاؤس اورادیبوں کے دیگر بیٹھکوں کی خبر دیتے ہیں اور کبھی اپنے موضوعات آرٹس کونسل کی تقاریب کے بارے میں ہوتی ہیں۔وہ ہلکے پھلکے شگفتہ انداز میں ادبی اختلاف کو بھی اپنے کالموں میں سموتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ادب کے باذوق قارئین ان کے کالم شوق سے پڑھتے ہیں۔اور یوں انھیں ادب کی نئی راہوں سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔انتظار حسین کے کالم نئی شعری اور نثری مجموعوں کا تعارف نامہ بھی ہوتے ہیں۔ناسٹلجیا کے زیراثر ماضی کی یاد نگاری ان کے کالموں کا دلچسپ روپ ہوتا ہے۔وہ افسانوی فضا کے ذریعے اپنے کالم کو دلچسپ بناتے ہیں۔انتظار حسین بلاشبہ ادبی کالم کی روایت میں ایک صاحب اسلوب کالم نگار ہیں۔تخلیقی آہنگ ان کے زبان کا ایسا حسن ہے۔جو دوسرے کالم نگاروں کے ہاں کم کم ہی نظر آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی کالم نگاری کا سلسلہ نصف صدی پر محیط ہے۔''تہذیب وفن''ان کے ادبی کالموں کا مجموعہ

ہے۔قاسمی صاحب کے کالموں کی فکری اساس ترقی پسند نظریۂ ادب پر استوار ہے۔ان کے ہاں ادب، تہذیب اور سماج کی بدلتی اقدار پر ایک گہری اور سنجیدہ نظر ملتی ہے۔ان کا غالب موضوع علم و ادب ہی ہے۔تاہم کبھی کبھار وہ فکاہیہ لہجے میں معاشرتی منظرنامے کو بھی کالم کا موضوع بنا لیتے ہیں۔احمد ندیم قاسمی کے نزدیک ادب ایک صحت مند تہذیب کی معتبر اکائی ہے اور ادب ترقی یافتہ سماج کی تشکیل میں شعور و آگہی پھیلانے کا کام سرانجام دیتا ہے۔ان کے کالموں میں گاہے بگاہے یہ سوال بھی زیر بحث رہتا ہے۔ادب رو بہ زوال کیوں ہے؟ انھوں نے گہرائی کے ساتھ اس سوال کا تجزیہ پیش کیا ہے۔اس کے ساتھ انھوں نے اہل ادب کو مکالمے کی دعوت دی ہے۔کہ وہ ادب کے جمود کو توڑنے میں اپنا کردار ادا کریں۔مٹی سے محبت اور انسان دوستی قاسمی صاحب کے فکر و فن کا بنیادی حوالہ ہے۔جس کی جھلک ان کے کالموں میں بھی ملتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی اردو ادب میں مقبول سفرنامہ نگار، ڈراما نگار اور شاعر کے درجے پر فائز ہیں۔کالم نگاری میں بھی ان کا ایک مستند مقام ہے۔اب تک ان کے کالموں کے درجنوں مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔عطاء الحق قاسمی کا کالم ''روزن دیوار سے'' کے عنوان سے روزنامہ ''جنگ'' میں شائع ہوتا ہے۔اس سے پہلے یہ کالم طویل عرصے تک روزنامہ ''نوائے وقت'' میں چھپتا رہا۔عطاء الحق قاسمی کے کالم ان کی تخلیقی اپچ ذہانت اور ذکاوت کا نتیجہ ہیں۔جن میں فکر و فن کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔وہ اپنے منفرد اور شگفتہ اسلوب کی بدولت آج بھی قارئین کے وسیع حلقے میں مقبول ہیں۔ادبی محاسن سے مزین ان کے کالم زندگی کے ہر رخ کی تصویر پیش کرتے ہیں۔عطاء الحق قاسمی بنیادی طور پر ظرافت نگار ہیں۔ان کی اسی خوبی سے وہ صاحب اسلوب کالم نگار کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ان کے فقرے ادبی ظرافت کی عمدہ مثال ہوتے ہیں۔فقرہ سازی کے تخلیقی عمل میں ان کی ذہانت و ذکاوت کارفرما رہتی ہے۔ان کی ادبی کالم نگاری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ انھوں نے کالم نگاری کو ایک نیا رجحان دیا اور ظرافت کے روایتی حربوں کے ساتھ نئے حربے بھی متعارف کرائے ہیں۔وہ صحافتی دنیا میں ادبی

اقدار کو زندہ رکھنے کے لیے اکثر اپنے کالم کے اختتام پر کسی شاعر کا خوب صورت کلام بھی درج کر دیتے ہیں۔ یوں شاعرانہ آہنگ سے ان کے کالم شعریت میں رچ بس جاتے ہیں۔ لفظوں کے تخلیقی استعمال کا ہنر عطاء الحق قاسمی کی انفرادیت کی مثال ہے۔

جمیل الدین عالی ادبی کالم کی تاریخ کے معتبر کالم نگار ہیں۔ آپ کی بنیادی وجۂ شہرت شاعری کی ہے۔ تاہم آپ نے نثر میں بھی طبع آزمائی کی ''تماشا میرے آگے'' اور ''دنیا میرے آگے'' آپ کے سفرناموں اور ''دعا کر چلے'' ادبی کالموں کے مجموعے ہیں۔ شاعری میں جمیل الدین عالی اختصار کے ساتھ ادبی کتب، ادبی شخصیات اور تقاریب کا حال احوال بیان کرتے ہیں۔ عالی ایک صاحبِ نظر کالم نگار ہیں۔ بدلتی دنیا میں اُردو ادب کے کردار اور اُردو زبان کو درپیش مسائل عام طور پر آپ کے کالم میں زیر بحث آتے ہیں۔ ماضی کی ادبی سرگرمیوں سے بھی انھیں دلچسپی ہے اور ماضی کے ادبی واقعات کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ عالی ایک صاحب نظر کالم نگار ہیں۔ بدلتی دنیا میں ادب کے کردار پر ان کی گہری نظر ہے۔ اور اسی تناظر میں ان کے علمی و ادبی تجزیے کالموں کی زینت بنتے ہیں۔ اردو زبان و ادب سے جذبہ و عشق خون کی طرح ان کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ اس لیے وہ اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے گاہے گاہے کالموں میں تجاویز دیتے ہیں۔ ان کے کالموں پر ایک علمی سنجیدگی طاری رہتی ہے۔ ان کے کالموں میں اُردو اور فارسی اشعار کا برمحل استعمال قاری کے لیے علمی تسکین کا باعث بنتے ہیں۔

سید ضمیر جعفری اُردو کی مزاحیہ شاعری کا ایک بڑا نام ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انھوں کالم نویسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کالموں کا آغاز روز نامہ ''جنگ'' سے ہوا۔ بعد میں وہ روز نامہ ''مشرق'' اور ''نوائے وقت'' میں ''نظر غبارے'' کے عنوان سے کالم نگاری کرتے رہے۔ ضمیر جعفری مزاجاً مزاح کی طرف زیادہ مائل رہے۔ ان کی کالم نگاری بھی ان کی شگفتگی اور ظرافت کی ایک شکل ہے۔ وہ دلچسپ پیرائے میں معاشرے کی ناہمواری کی نشان دہی کرتے ہیں۔ انھوں نے مزاح کے حربوں کو بھی بڑی روانی کے ساتھ استعمال

کیا ہے۔ وہ طنز ومزاح کے صاحبِ اُسلوب شاعر ہیں اوران کی یہ حیثیت ان کے کالموں میں بھی جھلکتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے وہ پر کیف اور پر لطف فضا تخلیق کرتے ہیں۔ اگر چہ مجموعی طور پر انھوں نے کالم کے میدان میں اپنی علیحدہ شناخت نہیں بنائی تاہم ادبی کالم نگاری کی روایت بڑھانے میں ان کا حصہ بھی ہے۔

خامہ بگوش اُردو ادبی کالم نگاری کا ایک مقبول ترین نام ہے۔ مقبولیت کا جو درجہ خامہ بگوش کو ملا وہ دنیائے اردو ادب میں کسی ادبی کالم نگار کو حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ خامہ بگوش نامور محقق مشفق خواجہ کا قلمی نام ہے۔ ادبی موضوعات پر خامہ بگوش کی کالم نگاری ادب کا ایک منفرد اور شگفتہ باب ہے۔ یہ کالم محض طنز ومزاح اور ظرافت کی خوبیوں سے مملو تحریریں نہیں بلکہ ان میں تنقید و تحقیق کے بلند پایہ نمونے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کالم اردو ادب کے ایک باخبر محقق، نقاد اور شاعر کے قلم سے نکلے ہیں۔ جس کی اردو ادب کے کلاسیکل سرمایے اور جدید تصورات پر گہری نظر ہے۔

خامہ بگوش کے کالموں میں موضوعات کا ایک تنوع اور تنقیدی نظریات کی ایک رنگا رنگی موجود ہے۔ خامہ بگوش نے دلیل اور منطق کی کسوٹی پر طنز ومزاح کے حربوں سے کام لیا ہے۔ اسی خوبی نے ان کالموں کو مبالغہ آرائی کے عیب سے بچائے رکھا ہے۔ خامہ بگوش نے حقیقی ادبی دنیا کے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ اور تخیل آفرینی کے حسن سے ان تحریروں میں خیال آرائی کا ایک جہانِ معنی آباد کیا ہے۔ اپنے وقت کے نامور ناقدین اور محققین نے خامہ بگوش کی کالم نگاری کو سراہا ہے۔ جن میں ڈاکٹر عالم ظفری، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر طاہر مسعود، ڈاکٹر شمیم حنفی، مظفر علی سید، محمود ہاشمی اور دیگر شامل ہیں۔

خامہ بگوش کی کالم نگاری طنز برائے طنز کے کسی منفی جذبے کے تحت وجود میں نہیں آئی۔ بلکہ اس کا مقصد ادب اور ادیبوں میں رائج ہونے والی غلطیوں کی درستی اور اصلاح ہے۔ تاکہ شاعر و ادیب اپنی فکری اور ادبی لغزشوں سے آگاہ ہو جائیں اور آئندہ کے لیے کارِ ادب کو سہل کام نہ سمجھیں اور اس کا پورا حق ادا کریں۔ ان کی جراتِ

اظہار کے سامنے کوئی مصلحت آڑے نہیں آتی۔

انھوں نے جو کچھ محسوس کیا اسے شگفتہ اور مزاحیہ پیرائے میں بیان کیا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے مطابق خامہ بگوش ادب میں ہر چیز کو برداشت کر سکتے ہیں لیکن خود نمائی اور خود پرستی برداشت نہیں کر سکتے۔

خامہ بگوش نے ظرافت کے حربے سے ادبی کتابوں اور شخصیات کی خامیوں کی طرف نشان دہی کی ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ جھٹلائی نہیں جاسکتی کہ ان کے نزدیک ان کالموں کا مقصد ہرگز کسی کی ذاتی توہین یا پھکڑپن نہیں ہے۔ وہ اپنے دلچسپ اندازِ تحریر کے ذریعے یہ پیغام دیتے ہیں کہ ادب ایک سنجیدہ عمل ہے جس کی تخلیق میں ریاضت اور یکسوئی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تن آسانی اور سہل کاری کا، کارِ ادب سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ خود وہ لکھتے ہیں:

> ''کہ جن ادیبوں پر ہم نے لکھا ہے ان سب کے لیے ہمارے دل میں احترام بھی ہے اور محبت بھی۔ محبت میں چونکہ سبھی کچھ جائز ہوتا ہے۔ اس لیے کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی آ گئی ہیں۔ جنھیں غالب کے لفظوں میں ''سخن گسترانہ'' کہا جا سکتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ خامہ بگوش نے مبالغے سے زیادہ حقیقت کو پیش نظر رکھا ہے اور اس کی وجہ سے یہ ہے کہ وہ اُردو ادب کے ایک بے لاگ محقق اور صاحب نظر ادب شناس تھے۔ جن کی نظر اُردو کے کلاسیکی سرمائے سے لے کر جدید ادب کے منظر نامے پر تھی''۔ (۲)

خامہ بگوش یعنی مشفق خواجہ ایک جہاندیدہ اور پختہ کار شاعر بھی تھے۔ اس لیے وہ شاعرانہ مزاج، شعری نزاکتوں اور اردو شاعری کی روایت سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔ ان کے کالموں میں کمزور شعری مجموعوں کی خامیوں کو طنز و مزاح کی کسوٹی پر جس ہنرمندی سے پرکھا گیا ہے اور ظرافت کے پردے میں ان کی خامیوں اور کمزوریوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی شعری ادراک کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ ان کی تحریر میں

موجزن شگفتہ بیانی کی رواں کیفیات قاری کو بے پناہ مسکراہٹوں سے نوازتی ہیں۔ یہ کالم ایک ایسے بیدار مغز اور حاضر دماغ تخلیق کار کے نوکِ قلم سے لکھے گئے ہیں۔ جو اپنے عہد کے ادبی رویوں سے باخبر ہے۔ اسے شاعروں ادیبوں کی منافقت اور عمل کے تضاد کا علم ہے۔ اور جسے مہارت سے بے نقاب کرنے کا ہنر آتا ہے۔ یہ ایسی تخلیق اور شخصی صلاحیتیں ہیں۔ جو خامہ بگوش کا حصہ ہیں۔ منشیات کے عنوان سے لکھے گئے ایک کالم میں یہ خوبیاں یکجا ملتی ہیں۔ لسانی تشکیلات کے حوالے سے معروف شاعر ظفر اقبال کے شعری نظریات کو جس باریک بینی سے خامہ بگوش نے کنگالا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

''خامہ بگوش شاعروں اور ادیبوں کے تضادات کا پردہ چاک کرتا ہے۔ آج کل ہمارے شاعر ادیب تن آسانی اور سستی شہرت کی ہوس میں مبتلا ہیں اور وہ محنت ریاضت سے منہ موڑ کر اپنی پی۔ آر یعنی تعلقات کے ذریعے اپنی کمزور اور ناقص شاعری کے باوجود اپنا ایک نام اور مقام بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے اس چور دروازے کے ذریعے مفادات سمیٹنے سے مستحق اور باصلاحیت شاعروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ خامہ بگوش نے اس قباحت اور ادب کے لیے ضرر رساں کلچر کو بڑی مہارت سے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کمزور شاعری والوں کی پی۔ آر بہت مضبوط ہوتی ہے۔ مضبوط پی۔ آر کی وجہ سے ٹی۔ وی والوں کی سخن فہمی اور نقادوں کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں''۔ (۳)

ایک خوب صورت ادبی کالم کی سب سے اہم خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں بڑی لطافت کے ساتھ بات سے بات نکالی جاتی ہے۔ کم الفاظ میں زیادہ مفاہیم کا بیان، اسلوب بیان کا حسن ہے۔ صرف خامہ بگوش کے فقرے بڑے کاٹ دار ہوتے ہیں۔ ان فقروں میں ہمارے نئے ادبی کلچر کی قباحتوں سے پردہ اٹھتا ہے۔ ان کے ایک اور

کالم ’’آمد اور آورد‘‘ میں بھی یہی بینائی اور حسرت اظہار کا وصف ملتا ہے۔ اس کالم میں انھوں نے معروف شاعر بشیر بدر کی خود پرستی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ خود پرستی شخصیت کا ایسا عیب ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے خود پرست دوسرے انسانوں کو حقیر سمجھتا ہے۔ خامہ بگوش نے اسی تناظر میں مذکورہ شاعر کے غرور کے بت کو پاش پاش کیا ہے۔

خامہ بگوش کے طنز میں کئی مقامات پر شدت کا احساس ہوتا ہے لیکن ہر مقام پر ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ ذاتیات سے گریز کیا جائے اور شاعروں ادیبوں کی کج روی ہی کو موضوع بنایا جائے ان کے طنز کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ غیر ضروری جذباتیت سے دور رہتے ہیں۔ منطق اور دلیل کے ساتھ اپنے موضوع سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ موضوع کے پس منظر کو سمجھانے کے لے زیرِ طنز شاعر، ادیب یا کتاب کے حوالے بھی دیتے ہیں اور اسی کا نام ادبی دیانت داری ہے۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ان کے قلم کی کاٹ کے شکار کئی شاعر وادیب اسے اپنی ہتک کی بجائے اسے اپنی ذات کے بارے میں ادب پارہ سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔

طنز کی اعلیٰ قسم وہ ہے جس میں طنز نگار اپنی ذات کو طنز کے نشانے پر رکھے۔ طنز کی یہ اعلیٰ قسم خامہ بگوش کے کالموں میں بھی ملتی ہے۔ خامہ بگوش ادب میں طوطے اور مینائیں اڑا کر دوسروں کی آنکھ میں دھول جھونکنے والے نقادوں کی ’’علیت‘‘ کی حقیقت کا پردہ بھی چاک کرتے ہیں۔ جو اپنے مفادات کے لیے ادب کا علم اُٹھائے ہوئے ہیں۔

خامہ بگوش کے ادبی کالم بظاہر تو طنز و مزاحیہ تحریریں ہوتی ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ ہمارے عہد کے ادب اور ادبی کلچر کے زوال کی تاریخ ہیں اور اس میں شامل مواد ہمیں اپنے معاشرے کے موسم، مزاج اور درجہ حرارت میں اتار چڑھاؤ کی خبر بھی دیتے ہیں۔ ان کے فقروں میں بلاغت اور ایجاد کا حسن ملتا ہے۔ جس کا تصور زبان و بیان کے اسالیب پر گرفت کیے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ ان تحریروں میں برہمی سے زیادہ جلال کے مزاج سے زیادہ سنجیدگی کا پہلو نمایاں ہے۔

خامہ بگوش ادب کی مشرقی روایات کا امین ہے۔ان کے کالموں میں ادبی اقدار کی آگہی اور رمز شناسی کی جو کیفیت ملتی ہے۔وہ معاصر تنقید کی مغرب زدگی کا ایک جواب بھی فراہم کرتی ہے۔ان کالموں میں جا بجا خامہ بگوش کا نظریۂ ادب بھی ملتا ہے۔ان کے نزدیک ادب ایک مقدس روایت کا حصہ ہے۔اس کے تمام مقاصد شعور اور ادراک سے پھوٹتے ہیں۔ادب کا اولین تقاضا و مطالبہ یہی ہے کہ جذبے و فکر کی سچائی پر مقدم ہے۔یہ ایک ایسا فن لطیف ہے۔جس کے لیے مسلسل غور و فکر اور ریاضت سانس کی طرح ضروری ہے۔خامہ بگوش ادبی دیانت داری کا طلبگار اور متمنی ہے۔

اُسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقۂ ادائے مطلب یا خیالات و جذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت کی شمولیت سے وجود میں آتا ہے۔ خامہ بگوش کا اسلوب اس تعریف کی عملی مثال ہے۔ان کی کالم نگاری کا اسلوب ادبی کالم کی اسلوبیاتی روایت میں ایک منفرد آواز ہے جس کی تشکیل میں مصنف کی علمیت مزاج، تجربے، مشاہدے اور فلسفۂ حیات کی جھلک ملتی ہے۔ ادبی کالم کا یہ اُسلوب اُردو میں پہلی بار سامنے آیا۔

خامہ بگوش کا اُسلوب طنز و مزاح کی شگفتہ کیفیات سے تشکیل پاتا ہے۔اس کے ہر جملے اور لفظ سے تخلیقی آہنگ اور ذہانت کی امنگ کی تصویر محسوس ہوتا ہے۔ان کے ادبی موضوعات پر ایک نظر ڈالی جائے تو ان کے اسلوب کی اس ادا کا اعتراف کرنا ہوگا کہ انھوں نے لفظوں کے معاملہ فہمی، ذو معنویت، مزاحیہ کردار صورت واقعہ، افسانویت، تحریف نگاری، موازانہ، لفظی بازیگری اور ظرافت کے نئے حربے بڑی سہولت سے استعمال کیے ہیں۔ مظفر علی سید نے ان کے اسلوب کو سراہتے ہوئے یہ لکھا ہے:

> ”طنز و مزاح کے مخصوص اسلوب میں لکھے گئے یہ ادبی کالم اپنی گہری علمی بصیرت اور نکتہ سنجی کے باعث قریب و دور کی پوری اُردو دنیا میں موضوع گفتگو رہے ہیں“۔(۴)

ان کالموں کے خالق مشفق خواجہ ایک صاحب مطالعہ قلم کار تھے۔ وہ ایک نامور محقق تھے اور انھوں نے تحقیق کے آئینے میں قدیم کلاسیکی ادب کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ ایک بالغ نظر شاعر و ادیب کی حیثیت سے وہ کار ادب کے سچے شناور تھے۔ ان کو ادب کے اسلوبیاتی صفات کا شعور تھا۔ ان کے اُسلوب میں ان کے ذوق شعری کا ہنر ملتا ہے۔ ان کے اسلوب کی تشکیل میں ان کے ذوق مطالعہ، تحقیق اور شاعرانہ تخیل کا بہت اثر ہے۔

ادب میں مزاحیہ کیفیات پیدا کرنے کے لیے ایک مزاح نگار مزاحیہ کردار کا حربہ بھی استعمال کرتا ہے۔ مزاح کے اس تخلیق حربے کو تقریباً مزاح نے مضحک صورت حال پیدا کرنے کے لیے اسے استعمال کیا ہے۔ خامہ بگوش نے بھی اپنے کالموں میں لاغر مراد آبادی کے نام سے ایک تخلیقی کردار کے ذریعے قارئین کے لئے شگفتگی اور تبسم کا سامان فراہم کیا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر شمیم حنفی کی رائے ہے کہ لاغر مراد آبادی کا کردار خامہ بگوش کو درپیش بعض کھٹن گھڑیوں میں اچانک ایک غیبی سائے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور وہ جو کچھ کہہ جاتا ہے۔ ایک ناقابل تردید سادہ لوحی کے ساتھ جسے کہنے کے لیے خامہ بگوش کو ہزار بہانے درکار ہوتے ہیں۔

ادبی کالم میں واقعاتی مزاح کی گنجائش کم رہتی ہیں اس لیے لاغر مراد آبادی کے مکالمے اتنے پرلطف اور شگفتہ ہوتے ہیں کہ وہ اس کمی کو بڑی مہارت سے پورا کر دیتے ہیں۔ یہ کردار اس لیے بھی انفرادیت کا حامل ہے کہ یہ اپنی ذاتی خوبیوں اور ادبی کردار کی وجہ سے شاعروں اور ادیبوں میں کافی مقبول ہے۔ اس کردار کی انفرادیت یہ ہے کہ دیگر کردار تو حماقت کی تصویر ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے اپنی بیوقوفی سے ہنسی کے سامان پیدا کرتے ہیں۔ جبکہ یہ کردار زندگی اور ذہانت سے بھرپور ہے۔ اور یہ واقعے میں مرکزی کردار کی جہت سے سامنے آتا ہے۔ وہ ایک ماہرِ طنزیات کی طرح ادبی معاشرے کے تضادات، ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں پر ایک سخت نکتہ چین کی صورت میں دلچسپ تبصرے کرتا ہے۔

لاغر مراد آبادی کا مزاحیہ کردار بعض مقامات پر پورے کالم پر یوں چھا جاتا ہے کہ کالم نگار کی اپنی شخصیت

پس پردہ رہ جاتی ہے۔اور یہی مزاحیہ کردار نگاری کی خوبی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے قاری کو ہنساتا بھی ہے اور سوچنے پر بھی اُکساتا ہے۔ یہ ایک ایسا حاضر جواب کردار ہے۔جس میں ایک دلفریبی ، بے ساختگی اور شگفتگی کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

لاغر مرادآبادی کا کردار اپنی ضرورت کے وقت جھلک دکھا جاتا ہے۔اس لیے یہ خامہ بگوش کے کئی کالموں میں غائب رہتا ہے خامہ بگوش شعوری کوشش یا محض خانہ پری کے لیے اس کردار کو استعمال نہیں کرتے بلکہ اسے اپنے موقع کے مطابق کالم میں لائے ہیں۔اس فنکارانہ مہارت سے ان کے کالم یکسانیت کے عیب سے پاک رہتے ہیں۔

خامہ بگوش کے اُسلوب میں ایک فطری سادگی کا رنگ نمایاں ہے۔ان کی زبان اور اسلوب تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ظرافت کے دیگر حربوں میں لفظی بازیگری کی مقبول قسمیں رعایت لفظی اور ذومعنویت اہم ہے۔خامہ بگوش کے کالموں میں رعنائی حسن کے ساتھ یہ حربے استعمال ہوتے ہیں۔یہ ان کے قلم کی انفرادیت ہے کہ وہ لفظوں کے تخلیقی استعمال سے ذومعنویت کی لطافت پیدا کرتے ہیں۔زبان و بیان پر ان کی گرفت مثالی ہے۔ کفایتِ لفظی تحریر کا حسن ہے اور حسن کی یہ فراوانی خامہ بگوش کے اُسلوب کا خاصا ہے۔لفظ شناسی کا یہی قرینہ ہے کہ ان کے لفظ لفظ میں خیال آفرینی کا دست ہنر محسوس ہوتا ہے۔

دو چیزوں کے درمیان تقابلی مطالعہ خامہ بگوش کے اسلوب کی ایک ندرت ہے۔وہ ہنسی کی تحریک پیدا کرنے کے لیے اس حربے کو کام میں لے کر ایک خاص استدلالی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔اسلوب کا یہ ہنر قاری کو تبسم بھی دیتا ہے اور دعوت فکر بھی۔

خامہ بگوش کے ادبی کالموں میں صورت واقعہ کی تکنیک کو بھی کامیابی سے برتا گیا ہے۔وہ چھوٹے چھوٹے پر تبسم واقعات سے ہنسی کا بھرپور سامان پیدا کرتے ہیں۔انھوں نے مزاح نگاری میں تخلیقی تقاضوں کو بخوبی پیدا کیا ہے۔اسی لیے انھیں اردو ادبی کالم نگاری کا ایک معتبر باب کہنا غلط نہ ہوگا۔

اُردو ادبی کالم کو علمی و عوامی حلقوں میں متعارف کرانے میں ایک اہم نام ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کا بھی ہے۔

ڈاکٹر ظہور اعوان اُردو کے ممتاز محقق نقاد، خاکہ نگار، سفر نامہ نگار، مترجم، سوانح نگار، مورخ ماہر اقبالیات اور ماہر تعلیم ہیں۔ اب تک ان کی علمی و ادبی موضوعات پر پچاس سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر اعوان نظریاتی طور پر ایک ترقی پسند دانشور اور ادیب ہیں۔ جمہوریت کے علم بردار ڈاکٹر ظہور اعوان نے ہمیشہ اپنے کالموں میں مساوات، انصاف، تعلیم اور جمہوریت کی حمایت کی ہے ان کے ادبی کالموں میں علم وادب کے فروغ کا ایک مشن اور تحریک جھلکتی ہے۔

آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے۔ کہ اب تک آپ نے سب سے زیادہ ادبی کالم دنیائے ادب کو دیئے ہیں۔ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اُردو میں سب سے زیادہ ادبی کالموں کے مجموعے بھی آپ کے شائع ہوئے ہیں۔

ادبی کالم نگار کی حیثیت سے آپ کے کالم نظریے، سوچ علمیت اور ذوق مطالعہ کے آئینہ دار ہیں۔ یہ کالم ترقی پسند نظریہ ادب میں سانس لیتے ہیں۔ ادبی اور اقدار کا فروغ آپ کے کالم کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ موضوعات کی ایک وسیع دنیا آپ کے کالموں میں آباد ہے۔ سیاست، معیشت، تعلیم، سماجیات، سائنس وٹیکنالوجی تاریخ، نفسیات، تہذیب وثقافت، اقبالیات اور ادب سمیت دیگر موضوعات آپ کے کالم میں زیر بحث آتے ہیں۔

ادبی کالم نگاری کی حیثیت سے آپ کے کالم ترقی پسندی کے احساس میں رچے بسے ہوتے ہیں۔ ادبی کالم ڈاکٹر ظہور اعوان کا عشق بھی ہے اور شوق بھی۔ آپ اسے ادب کی ایک جدید صنف سمجھتے ہیں۔ فنی وفکری زاویے سے ڈاکٹر ظہور اعوان کے کالم انفرادیت کی وصف سے نمو پاتے ہیں۔ انھوں نے ادبی کالم میں نئے نئے اور کامیاب تجربے کیے ہیں۔ انھوں نے پہلی بار کالم کو کئی تخلیق اصناف کی ترقی وترویج کا ذریعہ بنایا۔ ان کالموں میں سفرنامے کی صنف بھی پروان چڑھی اور خاکہ نگاری کی روایت کو بھی استحکام ملا۔ تنقید وتبصرہ کے خدوخال بھی اجاگر ہوئے اور رپورتاژ نگاری کی صنف بھی ترقی سے آشنا ہوئی۔ ادبی معرکے اور جدید ادبی نظریات کے میدان بھی

یہاں پر سچے اور اُردو زبان کے تحفظ کے لیے مورچہ بندی بھی یہی پر ہوئی۔

ڈاکٹر اعوان نئی علمی و ادبی کتابوں پر نقد و تبصرے اپنے کالموں میں پیش کرتے ہیں۔تبصرہ نگاری باقاعدہ ایک فن ہے۔جس میں کسی بھی کتاب کے جملہ محاسن کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر ظہور اعوان کتاب دوست کالم نویس ہیں اور کتاب کلچر کا فروغ ان کی ایک بڑی خواہش ہے جس کا گاہے گاہے اظہار اپنے کالموں میں کرتے ہیں۔ان کی کوشش ہے کہ ان کے ہزاروں قارئین میں علمی و ادبی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔اس لیے وہ مثبت سوچ کے ساتھ بہترین ادبی کتابوں کا انتخاب کر کے اپنے کالم میں ان پر رائے دیتے ہیں۔

تبصرہ جہاں قارئین کو کسی فن پارے سے یا کسی دوسری اہم کاوش کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتا ہے۔وہاں قاری کی رائے متعین کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔تبصرہ نگار اختصار سے کام لیتے ہوئے کتاب کے متعلق تمام ضروری معلومات یوں بیان کرتا ہے۔کہ اس کا تبصرہ طوالت کا شکار نہ ہو جائے۔یا ایسا نہ ہو کہ کسی اہم چیز کا تذکرہ ہی رہ جائے۔

تبصرے کے ان لوازمات کا اظہار ڈاکٹر اعوان کے ان کالموں میں ہوتا ہے۔جن میں کتابوں پر تبصرے لکھے گئے ہیں۔ممتاز دانشور ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی کے سفرنامے ''چین بہ جبیں'' پر لکھا ہوا ڈاکٹر اعوان کالم بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔کالم کا عنوان ہے ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی کی ''چین یاترا'' کالم کے ابتدائی حصے میں اردو سفر نامے کی مبادیات اور تاریخ پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔اور اس کے بعد ڈاکٹر فیضی کے سفرنامے پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور اس بارے میں متوازن رائے قائم کی گئی ہے۔

وہ کتاب پر تبصرے کرتے ہوئے صاحب کتاب کے بارے میں چند جملوں میں اپنے تاثرات اتنی گہرائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ قاری کو صاحب کتاب کی مجموعی شخصیت کو سہولت کے ساتھ سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

''چتراں والا کٹورہ'' کے مصنف ڈاکٹر سید امجد حسین کے بارے میں لکھے ہوئے کالم میں بھی ان کے شخصی

اوصاف کوسراہا گیا ہے اسی طرح ''قلم کا قرض'' کے مصنف کی زندگی پر بھی ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ ''آواز دوست'' پر رائے دیتے ہوئے اس کے مصنف مختار مسعود کی شخصیت کے چھپے گوشے قارئین کے سامنے لائے گئے ہیں۔ یہ ڈاکٹر ظہور اعوان کے اُسلوب کا کمال ہے۔ کہ وہ چند ہی جملوں میں شخصیت کا پورا نقشہ کاغذ پر اُتار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر اعوان نے تبصرے کے لیے کتاب کے معیار کو پیمانہ بنایا ہے۔ ایک ترقی پسند تخلیق کار کی حیثیت سے ان کے نزدیک ایک کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ترقی پسندی کی سوچ پر مبنی ہو جو اپنے پڑھنے والوں کی ذہنی تہذیب کر سکے اور انھیں روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا شعور دے سکے۔ ڈاکٹر اعوان نے ترقی پسند کتابوں پر خوبصورت تبصرے لکھے ہیں اور اپنے نظریۂ ادب کی وضاحت کی ہے۔

جرأت مندی اور بے باکی ان کے کالموں کی شناخت ہے۔ وہ روایتی کالم نگاروں کی طرح بلا جواز ستائش وخوشامد نہیں کرتے بلکہ کتاب کے معائب کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر اعوان کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے لکھتی ہیں:

> کہ ہماری ساری خود فریبیاں، قول وفعل میں تضاد، قومی معاملات سے بے اعتدالی معاشرتی بے حسی، سماجی منافقتیں نمود ونمائش کی خواہش ڈاکٹر ظہور اعوان کے قلم کی زد میں ہیں اور یہی بوقلمونی ان کے کالموں کی مقبولیت کی اصل وجہ ہے''۔(۵)

ڈاکٹر اعوان کی حق گوئی کا اظہار اس کالم میں بھی ہوتا ہے جو شاعر مشرق علامہ اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال کی آپ بیتی ''اپنا گریبا چاک'' پر لکھا گیا۔ اسے ادبی کالم کی روایت میں ایک یادگار کالم سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے حقائق کے ترازو میں اسی کتاب کو تولا ہے۔ اور خوب باریک بینی سے اپنے شگفتہ اُسلوب میں کتاب کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس کتاب کو اختصار کے ساتھ کالم میں یوں پیش کیا گیا ہے کہ قاری پر کتاب کی سب اچھی بری پرتیں نکل جاتی ہیں۔

ڈاکٹر اعوان نے اُردو ادبی، تاریخی، اور سیاسی کتابوں کے علاوہ انگریزی پشتو اور ہندکو کتابوں پر بھی تبصرے لکھے ہیں۔ ''فصل کلید دریچہ'' کے عنوان سے لکھے گئے کالم میں انگریزی زبان کے صاحبِ کتاب شاعر اعجاز رحیم کے دوشعری مجموعوں پر رائے دی ہے۔ان کالموں میں ڈاکٹر اعوان کی شخصیت کی روشنی دیکھنے کو ملتی ہے اور وہ ایک عالم اور بے بدل نقاد کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔انھوں نے اپنے ادبی کالموں میں ادبی رجحانات پر بھی بات کی ہے اور نئے تنقیدی نظریات سے قارئین کو متعارف کرایا ہے۔ان کا تعلق تنقید کے ترقی پسند دبستان سے ہے۔انھیں فرسودہ روایات اور رجعت پرستی سے نفرت ہے۔وہ معاشرے کو مساوات کی راہ پر پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں۔جمہوری ذہن کے اس دانشور نے سدا فوجی حکومتوں کے آمرانہ فیصلوں کے خلاف مزاحمت کی ہے اور قلم کے محاذ پر اپنے وطن کا مقدمہ لڑا ہے۔ترقی پسندی ان کی رگوں میں دوڑتی ہے۔حسن کا بھرپور اظہار ان کے ادبی کالموں میں ہوتا ہے۔

مرزا ادیب اُردو کے ایک نام ور افسانہ نگار ہیں ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری اور رومانیت کا جو امتزاج ملتا ہے۔وہ بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوتا ہے۔ادبی دنیا کے ایک مخلص کارکن کی حیثیت سے انہوں نے تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ کالم نگاری کو بھی بھرپور توجہ دی۔ان کے کالم سنجیدہ اسلوب میں خالصتاً ادبی موضوعات پر مبنی ہوتے ہیں۔''نوائے وقت'' میں لکھے گئے ان کے کالم بعد ازاں ''ادبی کالم'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔اس مجموعے میں انھوں نے ادبی شخصیات کے فکروفن، ادبی کتابوں پر تنقید وتبصرے اور فوت ہونے والے اہل قلم کی ادبی خدمات پر لکھے گئے کالم شامل کیے ہیں۔مرزا ادیب کے کالموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ادبی دنیا کے باخبر شخص کے کالم ہیں۔وہ فنافی الادب تخلیق کار ہیں اور کسی ستائش وتمنا کے بغیر کار ادب کو قیمتی وقت دیتے ہیں۔ان کے کالموں میں ادب میں انسان دوستی کے نظریئے کا پرچار نظر آتا ہے۔جو ان کی عاجزی اور انکساری کو ظاہر کرتے ہیں۔انھوں نے جن ادبی شخصیات پر کالم لکھے ہیں۔وہ اس بنا پر خصوصی درجہ

رکھتے ہیں کہ انھوں نے کالم کے محدود دائرے کے اندر ان شخصیات کے مجموعی کارناموں کو مہارت سے سمیٹا ہے۔ ان کے تنقیدی کالم بھی انکی ادب شناسی اور بصیرت کی گواہی دیتے ہیں۔ ان کے کالم ادبی رنگوں میں رچے بسے رہتے ہیں۔ منظر نگاری اور جزئیات نگاری کی خوبیوں سے یہ کالم اپنے اندر دلچسپی اور کشش کا وافر سامان رکھے ہوئے ہیں۔

امجد اسلام امجد اردو شاعری اور ڈارمے کا ایک بڑا نام ہے۔ ساتھ ساتھ وہ ادبی کالم میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اور اب ان کا شمار اہم ادبی کالم نگار میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے وقت کے معتبر اخبار روزنامہ ''امروز'' سے کالم نگاری کا آغاز کیا۔ ان کے کالموں کی موضوعاتی حدود بہت پھیلی ہوئی ہیں۔ ادب، سیاست معاشرت، تہذیب، تعلیم، خواتین کے مسائل سمیت گاہے گاہے عالمی موضوعات پر بھی کالم لکھتے ہیں۔ موضوع ادبی ہو یا غیر ادبی امجد کے کالم ادبی فضاؤں میں سانس لیتے ہیں۔ ان کے کالم کی زبان صحافتی نہیں بلکہ ادبی ہوتی ہے جو قاری کو تروتازہ رکھتی ہے۔ امجد اسلام امجد ادب برائے زندگی کے تعلق کو بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں قارئین کے سامنے نئی ادبی کتابوں کا تعارف پیش کرتے ہیں۔ ادبی شخصیات بھی ان کے کالموں کا موضوع بنتی ہیں۔ امجد اسلام امجد کے اندر ظرافت نگار شخصیت چھپی ہوئی ہے جو کبھی کبھار ادبی کالم میں اپنا جلوہ دکھا جاتی ہے وہ اپنے کالموں میں دلائل کے ساتھ اُردو زبان کے آئینی حق کا مقدمہ بھی لڑتے نظر آتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ اُردو ادب کے جدید منظر نامے میں مقبول ترین ادیب کے درجے پر فائز ہیں۔ وہ بنیادی طور پر سفر نامے نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ تاہم انھوں نے ڈرامہ نگاری اور ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ وہ روزنامہ ''مشرق'' میں ''کارواں سرائے'' کے عنوان سے کالم لکھتے رہے ہیں۔ بعدازاں وہ روزنامہ ''جنگ'' سے وابستہ ہوئے اور اس کے ساتھ ہفت روزہ ''اخبارِ جہاں'' میں بھی ان کا کالم چھپنے لگا۔ آج کل وہ روزنامہ ''جناح'' میں کالم لکھتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ ایک کامیاب سفر نامہ نگار، ڈراما نگار، اور ناول

کے ادبی کالم قاری کو حال کی تازہ سرگرمیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ تاج سعید بڑی محنت سے ان کتابوں پر اپنے کالم میں تبصرے لکھتے ہیں۔ جو تازہ شائع ہوئی ہوں۔ ان کا اسلوب عام فہم اور رواں دواں ہے۔ ان کی تحریر پڑھتے وقت قاری کسی مشکل کا شکار نہیں ہوتا۔ ان کا انداز تحریر تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ ادبیت کے حسن ان کی تحریر کو ایسی دلکشی عطا کی ہے۔ قاری ایک بار پڑھنے بیٹھ جائے تو ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ ان کے کالم نہ صرف ان کی ادب شناسی کے عکاس ہیں بلکہ ان کی مضمون آفرینی کے ترجمان بھی ہیں وہ مشکل لفظیات وتراکیب سے قاری کو مرعوب کرنے کی بجائے مانوس لفظوں کا تخلیقی استعمال کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک شاعر بھی ہیں۔ ماضی کے ساتھ وہ حال کے ادبی منظرنامے سے بھی قاری کو آگاہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد یونس بٹ جدید کالم نگاری کی روایت کا معتبر حوالہ ہے۔ انھوں نے کم عرصے میں اپنی جداگانہ حیثیت منوائی ہے۔ ان کی کالم نگاری کا آغاز جون ۱۹۹۱ء میں روزنامہ ''پاکستان'' سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر یونس بٹ نے طنز ومزاح کے روایتی حربوں کے ساتھ ساتھ مزاح کے جدید اسالیب کا بھی بخوبی استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں اردو طنز ومزاح کے ساتھ انگریزی مزاح کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ ادبی ظرافت میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔ وہ لفظوں سے ذومعنویت پیدا کرنے کے ماہر ہیں۔ انھیں یہ شعور ہے کہ آج کا قاری کس نوع کی تحریریں شوق سے پڑھتا ہے اس لیے وہ اپنے کالموں میں قاری کو محفوظ کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز تحریر لطیفوں اور چٹکلوں سے کالم لیتے ہیں۔ ان کا مزاح زیادہ پیچیدہ اور فلسفیانہ نہیں ہوتا۔ وہ سیدھے سادے واقعات اور جملوں سے عام لفظوں میں حسن مزاح کے قرینے تخلیق کرتے ہیں۔ ان کے کالم کا پہلا جملہ ہی اتنا شاندار اور جاندار ہوتا ہے کہ قاری پہلی سطر ہی سے لطف کی گرفت میں آجاتا ہے۔ انھوں نے قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ مزاح کی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر ادبی موضوعات اور شخصیات پر لکھے گئے کالموں میں ظرافت کی ایک دنیا آباد ہے۔ ان کے کالم سدابہار نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ان کے کالموں کے کئی مجموعے

شائع ہو چکے ہیں ان میں کئی مجموعے ایسے ہیں۔ جن کے کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور یہی ڈاکٹر یونس بٹ کے کالموں کا حسن ہے۔

عطاء الحق قاسمی کو عوام وخواص کی طرف سے قبولیت عام کی جو سند ملی ہے۔ شاید ہی کسی دوسرے کالم نگار کو ملی ہو۔ صحافت وادب کے ماہرین وناقدین نے کالم نگاری کی روایت میں قاسمی کو سرِ فہرست رکھا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے کالموں کی ادبی فضا جاننے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیات وشخصیت پر ایک گہری نظر ڈالی جائے۔ تاکہ اس ادبی، سماجی، تعلیمی وسیاسی پس منظر کو سمجھا جائے۔ جس سے عطاء الحق قاسمی کی تخلیقی شخصیت کی تشکیل ہوئی اور جس کا عکس ان کی کالم نگاری میں محسوس ہوتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنے کالم میں علامتی اسلوبِ بیان کا بھی کامیاب تجربہ کیا ہے۔ دراصل علامت ایک بلیغ وفصیح ادبی اندازِ تحریر کے وصف کا نام ہے۔ علامت کے پردے میں بالعموم شاعر وادیب جبر استحصال کے خلاف اپنی آزادانہ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ جب معاشرے میں گھٹن ہو۔ مجبوری کا شدید احساس ہو تو تب علامت کے سہارے سے اپنی عہد کی اور اپنے حصے کی گواہی دی جاتی ہے عطاء الحق قاسمی کے علامتی کالم پر علامتی افسانے کا گمان بھی گزرتا ہے۔

کالم نگاری میں علامت کے استعمال کی روایت کے تناظر میں عطاء الحق قاسمی ایک اہم تخلیق کار ہیں۔ علامت کا استعمال ایک ادبی عمل ہے اور کسی بھی صنفِ ادب میں فن وفکر کے توازن کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تو پھر وہ ایک بے ڈھنگے پن کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ علامت ہر حال میں ایک بصیرت کا حامل علامت نگار چاہتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے کالم اِس ہنر کی بہترین مثال ہیں۔

حسن نثار نظریاتی طور پر بائیں بازو کے دانشور ہیں۔ اس لیے ان کے کالم فکری طور پر معاشی عدم استحکام، سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف ایک موثر احتجاج کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ معاشی مساوات اور

عوام کی ترقی وخوشحالی ان کا دیرینہ خواب ہے۔اور یہ خواب ان کے کالموں کا بنیادی فلسفہ بن کر سامنے آتا ہے۔طنز حسن نثار کے اسلوب کی روح ہے۔طنز ادب کا ایک جاندار اور فنکارانہ وسیلہ ہے۔جو نظم ونثر دونوں میں برتا جاسکتا ہے۔کالم میں حسن نثار نے طنز کی نشریت کو گہرے، انداز بیان سے استعمال کیا ہے۔طنز دودھاری تلوار ہے جسے چلانے کے لیے بے پناہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔جہاں کہیں کالم نگار نے ذرا بے احتیاطی کی۔طنز اپنے مقصد سے محروم ہوجاتا ہے۔ایسے طنز کو پھکڑ بازی کہتے ہیں۔حسن نثار کا فن اِس عیب سے پاک ہے۔

حسن نثار کے کالم میں حقیقت نگاری کی تصویروں کے ساتھ رومانیت کے رنگ بھی ملتے ہیں۔ ماضی کو آواز، رنگینیٔ الفاظ کا جادو، جذبے کی شدت اور مستقبل کی روشنیوں کی سمت لپکنے کی بے چینی حسن نثار کی رومانیت کے خدوخال ہیں۔ جو کل بھی تروتازہ تھے اور آج بھی ہیں اور مستقبل میں بھی اِس تازگی کی مہک کم نہیں ہوگی۔ان کی نثر ایک شاعرانہ نثر ہے۔اس میں شعری آہنگ کی چاشنی بھی ملتی ہے۔اور ادبیت کا لطف بھی۔

یونس قیاسی کے کالم عنوان سے لے کر آخری لفظ تک تخیل اور حقیقت کی آب وہوا میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ درمیان میں ایک افسانوی فضا، شگفتگی، وارفتگی اور فلسفے وتجزیے کی پگڈنڈیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔یوں ان کے کالم ادب وصحافت کی سرحد پر جنم لیتے ہیں۔ دراصل یونس قیاسی کی ہمہ جہت شخصیت کا پرتو ان کے کالموں میں محسوس ہوتا ہے۔وہ ایک سنجیدہ انسان ہیں۔کبھی کبھی ان کے کالم شگفتگی سے سنجیدگی کی طرف اور کبھی سنجیدگی سے شگفتگی کی طرف سفر کرتے ہیں۔ ''جمہوریت کی گاڑی اور ریورس گیر'' بھی ایسا ہی ایک کالم ہے۔

سب سے پہلے جو خوبی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ کالم کا عنوان ہے۔جس میں زیرلب ایک مسکراہٹ کھلتی محسوس ہوتی ہے۔ جمہوریت کی پاکستانی صورتحال اور پھر اِس پر ریورس گیئر کا، گہرا طنز کالم میں طنز ومزاح کے امکانات کا پتا دیتا ہے۔کالم کا آغاز ہی انتہائی دلچسپی کا حامل ہے۔

یونس قیاسی نے زندگی اور سماج کو ایک تخلیق کار کی نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔وہ زندگی کے

اعلیٰ اقدار کے قائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کالم کو اپنے نظریات کے پرچار کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ان کے کالم میں عوامی لب ولہجے کی سلاست اور روانی کی لہریں چلتی ہیں۔ وہ مشکل پسندی کے قائل نہیں۔ دراصل وہ اخبار کے منصب اور مزاج سے باخبر ہیں۔ان کی نظر اور توجہ عوام کے خوابوں کی دنیا میں ہے۔ایک باخبر ادیب کی وجہ سے وہ اپنے کالموں میں عوام کے نبض شناس کے طور پر سامنے آتے ہیں۔اس لیے ان کو اردو کا عوامی کالم نگار کہا جاسکتا ہے۔جس کا اندازہ ان کے کالم ''ایک سوال اپنے قارئین کے لیے'' سے بھی ہوسکتا ہے۔اس کالم میں وہ ادبی اسلوب میں عوام سے ایک مکالمے کی صورت میں گفتگو کرتے ہیں۔اور یوں بات سے بات نکالتے ہوئے وہ مطلب کی بات بیان کرتے ہیں۔

پروین شاکر کے کالموں کا سب سے بڑا موضوع زندگی ہے۔ان کے نزدیک زندگی کائنات کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے اور زندگی سے وابستہ سارے رنگ کائنات کے سب حسین موسموں سے زیادہ دلفریب اور دلاویز ہیں۔پروین شاکر جیسی حساس فنکارہ جب دیکھتی ہیں کہ زندگی کے چہرے پر اداسی کا سایہ ہے۔اور آنکھوں میں دکھوں کے آنسو ہیں۔تو وہ تڑپ اٹھتی ہیں اور بے چین ہوکر بے اختیار قلم اٹھاتی ہیں۔ان کی یہ تڑپ اور بے چینی ان کے کالموں میں پہلو بہ پہلو چلتی رہتی ہے۔پروین شاکر چھوٹے چھوٹے فقروں میں اپنی بات سمیٹنے کا ہنر جانتی ہیں۔گو کہ انھوں نے اتنے زیادہ کالم نہیں لکھے۔لیکن محدود تعداد کے باوجود ان کالموں کے اندر اپنے معاشرے کی سچی تصویر نظر آتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ اردو میں ادبی کالم نگاری کی روایت کو آج کے ادیبوں نے اسی طرح زندہ رکھا ہوا، جس طرح قدماء نے اس روایت کا آغاز کیا تھا۔ادبی کالم نگاری اردو ادب کا ایک نثری صنف ادب ہے۔جس سے اردو زبان اور ادب کو نہ صرف پروان چڑھنے کا موقع مل رہا ہے بلکہ اردو زبان و ادب کو تقویت بھی مل رہی ہے۔آج کے سائنسی اور تیز رفتار دور میں کالم بہت ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں کیوں کہ کالم ایک مختصر صنف ادب ہے جو مختصر افسانے کی جگہ لے رہا ہے۔

☆☆ ☆☆

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ۔''اُردو ادبی صحافت'' الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸ء ص۔۲۳

۲۔ مشفق خواجہ، ''خامہ بگوش کے قلم سے'' مرتب: مظفر علی سید، فضلی سنز، کراچی ۲۰۰۴ء، ص۔۳

۳۔ ایضاً، ص۔۹

۴۔ مظفر علی سید۔ مشفق من خواجہ من۔ جدید پریس لاہور، ۲۰۰۷ء، ص۔۲۵

۵۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین، ''ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی کالم نگاری مشمولہ: 'حدیث دیگراں' الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۔۴۱

☆☆☆☆

کتابیات

کتابیات

۱۔ آغا شورش کاشمیری — نورتن — مطبوعات چٹان، لاہور ۱۹۶۷ء

۲۔ ابراہیم جلیس — تصانیف جلیس — مکتبۂ جلیس، کراچی س۔ن

۳۔ ابن انشاء — اردو کی آخری کتاب — لاہور اکیڈمی، لاہور ۱۹۸۲ء

ابن انشاء — خمار گندم — لاہور اکیڈمی، لاہور ۲۰۰۷ء

۴۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی — کشاف تنقیدی اصطلاحات — مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۵ء

۵۔ ابوسلمان شاہجہان پوری — پاکستان کے اُردو اخبارات و رسائل (جلد اول) ایضاً ۱۹۸۷ء

ابوسلمان شاہجہان پوری — مولانا محمد علی جوہر اور ان کی صحافت — ادارہ تصنیف و تحقیق علی گڑھ کالونی کراچی ۱۹۸۸ء

۶۔ احتشام حسین — تنقیدی اشارات — عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور ۱۹۶۵ء

۷۔ احسن اختر ناز — صحافتی ذمہ داریاں — مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۴ء

۸۔ احمد ندیم قاسمی — تہذیب و فن — پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور ۱۹۷۵ء

۹۔ اشفاق احمد ورڈاکٹر — منٹو اور مزاح — بیت الحکمت، لاہور ۲۰۰۷ء

۱۰۔ انتظار حسین — بوند بوند — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہو ۲۰۰۸ء

انتظار حسین — ذرّے — پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور ۱۹۷۶ء

۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر — اُردو نثر کے آفاق — مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۵ء

انور سدید، ڈاکٹر — سخن ہائے گسترانہ — فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، کراچی ۲۰۰۷ء

انور سدید، ڈاکٹر — مشفق خواجہ ایک کتاب — پورب اکیڈمی، اسلام آباد ۲۰۰۷ء

انور سدید ڈاکٹر، خواجہ عبدالرحمٰن طارق (مرتبین) — سن تو سہی — پورب اکیڈمی، اسلام آباد ۲۰۰۸ء

۱۲۔ امداد صابری — تاریخ صحافت (جلد اوّل) — ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۳ء

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	سنہ
۱۳۔	امجد اسلام امجد	تیسرے پہر کی دھوپ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۳ء
۱۴۔	اے۔ ار خالد، ڈاکٹر	اُردو صحافت (۴۷ تا ۱۹۶۴ء)	مکتبہ کارواں، لاہور	۱۹۸۷ء
	اے۔ ار خالد، ڈاکٹر	فن خبر نویسی	مکتبہ کارواں، لاہور	۱۹۸۹ء
۱۵۔	ایم۔ ایس۔ ناز	اخبار نویسی کی مختصر ترین تاریخ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۹۳ء
۱۶۔	بدر شکیب	اُردو صحافت	کاروان ادب، کراچی	۱۹۵۲ء
۱۷۔	پروانہ ردولوی	اُردو صحافت کا استغاثہ	حیا پبلشنگ، نئی دہلی	۱۹۹۴ء
۱۸۔	تاج سعید	رشتے اور روّیے	کلاسیک پبلشرز، لاہور	۲۰۰۶ء
۱۹۔	تحسین فراقی ڈاکٹر	عبدالماجد دریابادی احوال و آثار	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	۲۰۰۶ء
۲۰۔	ثناءاللہ چوہدری	صحافت میں جدید رجحانات	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد	۱۹۹۲ء
۲۱۔	جگدیش چندر ودھاون	منٹونامہ	مکتبہ شعروادب، لاہور	س۔ن
۲۲۔	جمیل الدین عالی	دُعا کر چلے	مکتبہ اُسلوب، کراچی	۱۹۸۷ء
۲۳۔	خالد محمود عالی	اُردو صحافت، تاریخ وفن	نیو بک پیلس، لاہور	س۔ن
۲۴۔	خواجہ احمد فاروقی	دہلی اخبار	دہلی پریس، دہلی	۱۹۹۱ء
۲۵۔	خواجہ عبدالغفور	طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۳ء
۲۶۔	راحت سہیل	اردو اداریہ کا ارتقاء	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۲ء
۲۷۔	رشید حسن خان	تلاش و تعبیر	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۸۸ء
۲۸۔	رؤف پاریکھ، ڈاکٹر	اُردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی وسماجی پس منظر	انجمن ترقی اُردو، کراچی	۱۹۹۶ء
۲۹۔	رئیس الدین فریدی	اُردو صحافت عہد بہ عہد	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۸۷ء
۳۰۔	سجاد حیدر	ریڈیائی صحافت	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۲۰۰۲ء
۳۱۔	سلطانہ بخش ڈاکٹر	داستانیں اور مزاح	مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور	۱۹۹۳ء

	مصنف	کتاب	ناشر	سال
۳۲۔	سہیل وحید	صحافتی زبان	نگارشات، ٹمپل روڈ، لاہور	۱۹۹۸ء
۳۳۔	سیّد عبداللہ، ڈاکٹر	اشارات تنقید	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۱ء
۳۴۔	سید محمد سلیم، پروفیسر	آزادی صحافت اور غیر جانبداری	ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور	۱۹۸۷ء
۳۵۔	شاہد ایم ایس	صحافت کی تاریخ	علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد	۱۹۹۴ء
۳۶۔	شریف المجاہد، پروفیسر	پریس کے چار نظریات	قائداعظم اکیڈمی، کراچی	۱۹۷۷ء
۳۷۔	شفیق جالندھری، ڈاکٹر	کالم نویسی	اے ون پبلشر، لاہور	۱۹۹۳ء
	شفیق جالندھری، ڈاکٹر	فیچر نگاری	نعیم پبلشرز اردو بازار لاہور	۱۹۹۳ء
	شفیق جالندھری، ڈاکٹر	صحافت اور ابلاغ	اے ون پبلشر، لاہور	۲۰۰۲ء
	شفیق جالندھری، ڈاکٹر	صحافت اور صحافی	علمی کتب خانہ، لاہور	۲۰۰۶ء
۳۸۔	شمع افروز زیدی، ڈاکٹر	اُردو ناول میں طنز و مزاح	اُردو اکادمی، دہلی	۱۹۸۷ء
۳۹۔	شوکت تھانوی	دنیائے تبسّم	اُردو اکیڈمی، سندھ	۱۹۹۲ء
۴۰۔	شہناز انجم، ڈاکٹر	ادبی نثر کا ارتقاء	مکتبۂ جامعہ دہلی	۱۹۹۷ء
۴۱۔	ضیاء الدین، ڈاکٹر	اسالیب نثر پر ایک نظر	ادارہ فکر جدید، نئی دہلی	۱۹۸۹ء
۴۲۔	ظفر عالم ظفری، ڈاکٹر	اُردو صحافت میں طنز و مزاح	فیروز سنز، لاہور	۱۹۹۶ء
۴۳۔	ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر	چہرہ بہ چہرہ	ادارہ علم و فن، پشاور	۱۹۹۹ء
	ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر	اُردو ادبی صحافت	الوقار پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۸ء
	ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر	پچیسواں گھنٹہ	الوقار پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۸ء
	ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر	زبان یار من ترکی	الوقار پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۸ء
۴۴۔	عابد مسعود تہامی	جرنلزم	عظیم اکیڈمی، لاہور	۱۹۹۴ء
۴۵۔	عبدالغفار کوکب، ڈاکٹر	اُردو صحافت اور فکاہیہ کالم کی روایت	بیکن بکس، ملتان	۲۰۰۷ء

۴۶۔	عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر	صحافت اور معاشرہ	مقالہ شام ہمدرد کراچی	۱۹۶۴ء
	عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر	فن صحافت	مکتبۂ کارواں، لاہور	۱۹۸۱ء
	عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر	صحافت پاکستان و ہند میں	مکتبۂ کارواں، لاہور	س۔ن
	عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر	داستان صحافت	مکتبۂ کارواں، لاہور	۱۹۸۶ء
۴۷۔	عبدالمجید سالک	کیا قافلہ جاتا ہے؟	مکتبۂ تہذیب وفن، کراچی	۱۹۸۴ء
۴۸۔	عتیق صدیقی	ہندوستانی اخبار نویسی	انجمن ترقی اُردو، ہند	۱۹۵۷ء
۴۹۔	عزیز ملک	صحافت اور تحریک آزادی	شیعب پبلشرز اردو بازار لاہور	۱۹۹۵ء
۵۱۰۔	عطاء الحق قاسمی	روزنِ دیوار سے	مطبوعات لاہور	۱۹۷۸ء
۵۱۔	فضل الرحمان بن محمد، مولانا	پریس پر پابندی، اسلامی نقطہ نظر	دارالدعوۃ السّلفیہ لاہور	۱۹۹۸ء
۵۲۔	فرحت ظہور (مرتب)	حدیث دیگراں	الوقار پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۹ء
۵۳۔	کنور محمد دلشاد	ذرائع ابلاغ اور تحقیقی طریقے	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۹۹ء
۵۴۔	گربچن چندن	اُردو کے نامور صحافی	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۸۴ء
۵۵۔	قطب اللہ	مولانا آزاد کا نظریہ صحافت	اتر پردیش اُردو اکیڈمی، لکھنؤ	۱۹۸۹ء
۵۶۔	محمد اسلم ڈوگر	فیچر، کالم اور تبصرہ	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۹۸ء
۵۷۔	محمد افتخار کھوکھر	تاریخ صحافت	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۹۵ء
۵۸۔	محمد حمزہ فاروقی (مرتب)	افکار و حوادث (جلد سوم)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۸ء
۵۹۔	محمد شمس الدین، ڈاکٹر	ابلاغ عامہ کے نظریات	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۹۹ء
۶۰۔	محمد عالم مختار حق (مرتب)	مشفق من خواجہ من	جدید پریس، لاہور	۲۰۰۷ء
۶۱۔	محمد عتیق صدیقی	ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)	انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۱۹۸۰ء
۶۲۔	محمد یونس بٹ، ڈاکٹر	شناخت پریڈ	پاکستان بک اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور	۱۹۹۱ء

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	سال
	محمد یونس بٹ، ڈاکٹر	مجموعہ (کالموں کا مجموعہ)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۷ء
	محمد یونس بٹ، ڈاکٹر	بٹ پارے	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۸ء
۶۳۔	محمود الحسن	پاکستان کے اُردو اخبارات ورسائل (جلد اول)	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۹۵ء
۶۴۔	محمود عالم خان	چند نئے ادبی مسائل	پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور	۱۹۹۱ء
۶۵۔	مستنصر حسین تارڑ	چک چک	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۹ء
	مستنصر حسین تارڑ	کارواں سرائے	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۹ء
۶۶۔	مسکین علی حجازی، ڈاکٹر	پاکستان وہند میں مسلم صحافت	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۹ء
	مسکین علی حجازی، ڈاکٹر	صحافتی زبان	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۹۰ء
	مسکین علی حجازی، ڈاکٹر	پنجاب میں اُردو صحافت	مغربی پاکستان اکیڈمی اُردو اکیڈمی، لاہور	۱۹۹۵ء
	مسکین علی حجازی، ڈاکٹر	پاکستان میں ابلاغیات	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۹۹ء
۶۷۔	مظفر علی سیّد (مرتب)	خامہ بگوش کے قلم سے	فضلی سنز، کراچی	۲۰۰۴ء
	مظفر علی سیّد (مرتب)	سخن در سخن	اکادمی بازیافت، کراچی	۲۰۰۴ء
	مظفر علی سیّد (مرتب)	سخن ہائے ناگفتنی	فضلی سنز، کراچی	۲۰۰۷ء
۶۸۔	معین الدین عقیل، ڈاکٹر	تحریک آزادی میں اُردو صحافت کا حصہ	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	۱۹۸۲ء
۶۹۔	مہدی حسن، ڈاکٹر	جدید ابلاغِ عام	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۲۰۰۲ء
۷۰۔	مہدی حسن، ڈاکٹر	تعلقات عامہ	مکتبہ کارواں، لاہور	۲۰۰۴ء
۷۱۔	میرزا ادیب	ادبی کالم	پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز	۱۹۹۱ء
۷۲۔	نظیر حسین زیدی، ڈاکٹر	مولانا ظفر علی خان بحیثیت صحافی	مکتبہ اُسلوب، کراچی	۱۹۸۴ء
۷۳۔	وحید الرحمٰن خان	خامہ بگوش ایک مطالعہ	اکادمی بازیافت، کراچی	۲۰۰۴ء
۷۴۔	وزیر آغا ڈاکٹر	اُردو ادب میں طنز و مزاح	فیروز سنز، لاہور	۱۹۹۴ء

☆☆☆☆

رسائل و جرائد

۱۔ سہ ماہی ''ادب دوست'' لاہور — جون ۲۰۰۰ء

۲۔ الہلال، کلکتہ — ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء

۳۔ اودھ پنچ، لکھنؤ — ۱۸۲ اگست ۱۸۷۷ء

۴۔ تکبیر، کراچی — ۴ جولائی ۱۹۸۵ء

۵ ستمبر ۱۹۹۵ء

۵۔ تہذیب الاخلاق (جلد۱۰) — ۱۸۹۱ء

۶۔ جام جہاں نما — ۲۳ فروری ۱۸۶۸ء

۷۔ چنگاری، دہلی — جولائی ۱۹۸۴ء

۸۔ دلگداز لکھنؤ — دسمبر ۱۸۸۷ء

۹۔ سچ، لکھنؤ — ۲۳ دسمبر ۱۹۳۲ء

۱۰۔ سرپنچ، لکھنؤ — ۲۲ فروری ۱۹۳۳ء

۱۱۔ کامریڈ، دہلی — ۲۲ مارچ ۱۹۱۲ء

۱۲۔ کتاب نما، دہلی — دسمبر ۱۹۳۳ء

۱۳۔ مہذب، لکھنؤ — یکم اگست ۱۸۹۰ء

۱۴۔ نقوش، لاہور (حصہ دوم) ادارہ فروغ اُردو، لاہور — ۱۹۶۲ء

۱۵۔ ہمدرد، دہلی — ۱۱۳ اکتوبر ۱۹۱۳ء

☆☆☆☆

اخبارات

۱۔ روزنامہ ''آج''، پشاور — ۲۰ دسمبر ۲۰۰۸ء، ۲۲ جون ۲۰۰۹ء، ۲۳ جولائی ۲۰۰۸ء

۲۔ روزنامہ ''امروز''، لاہور — ۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء

۳۔ روزنامہ ''انقلاب''، لاہور — ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء

۴۔ روزنامہ ''اوصاف''، اسلام آباد — ۱۰ جولائی ۲۰۰۲ء

۵۔ روزنامہ ''ایکسپریس''، اسلام آباد — ۴ فروری ۲۰۰۸ء، ۴ مئی ۲۰۰۹ء

۶۔ روزنامہ ''پاکستان''، اسلام آباد — ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۷ء، ۱۸ مارچ ۲۰۰۹ء

۷۔ روزنامہ ''جدت''، پشاور — ۴ جنوری ۱۹۹۷ء

۸۔ روزنامہ ''جنگ''، کراچی — ۱۸ جنوری ۱۹۵۶ء، ۲۵ فروری ۱۹۵۶ء، ۲۵ مارچ ۱۹۵۹ء، ۵ نومبر ۱۹۷۷ء

۹۔ روزنامہ ''جنگ''، لاہور — ۶ مئی ۱۹۹۳ء

۱۰۔ روزنامہ ''جنگ''، راولپنڈی — ۵ نومبر ۲۰۰۹ء، ۲۴ دسمبر ۲۰۰۹ء

۱۱۔ روزنامہ ''جہاد''، پشاور	۱۴جولائی ۲۰۰۹ء
	۲فروری ۲۰۰۷ء
۱۲۔ روزنامہ ''خبریں''، اسلام آباد	۹مارچ ۲۰۰۹ء،
۱۳۔ روزنامہ ''دن''، لاہور،	۲جنوری ۲۰۰۹ء،
	۱۳نومبر ۲۰۰۸ء
۱۴۔ روزنامہ ''زمیندار''، لاہور	۸جنوری ۱۹۲۳ء،
	۱۲اپریل ۱۹۵۲ء
۱۵۔ روزنامہ ''مساوات''، کراچی	۱۸مارچ ۲۰۰۹ء
۱۶۔ روزنامہ ''مشرق''، پشاور	۱۱پریل ۱۹۸۵ء
	۲۶جولائی ۱۹۸۷ء
	۷اگست ۲۰۰۷ء
	۲۵جنوری ۲۰۰۸ء،
	۱۳اپریل ۲۰۰۸ء
۱۷۔ روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور	۲۱جولائی ۱۹۷۸ء
	۵جنوری ۱۹۸۹ء
	۲۷اگست ۲۰۰۸ء
	۲۵جنوری ۲۰۰۹ء
	۳ستمبر ۲۰۰۸ء

☆☆☆☆

لغات (اُردو/انگلش)

۱	علمی اُردو لغت	علمی کتاب خانہ، لاہور	۱۹۸۰ء
۲	فیروز اللغات	فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور	۱۹۹۵ء
۳	قاموس الاصطلاحات	مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور	س۔ن
۴	کتابستان ڈکشنری	اُردو بازار، لاہور	۱۹۹۵ء
۵	فاونز انگلش اُردو ڈکشنری	مرکزی اُردو بورڈ، لاہور	س۔ن
۶	نوراللغات (جلد چہارم)	نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور	۱۹۸۵ء
۷	Oxford Dictionary of English	ـــــــــــ	۱۹۲۶ء
۸	The Oxford Guide to English Language	آکسفورڈ پریس، ٹوکیو	۱۹۸۷ء

مقالات (غیر مطبوعہ)

۱۔ عفیرہ حامد علی اُردو زبان وادب کی ترقی میں صحافت کا حصہ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی جامعہ پنجاب لاہور ۱۹۷۸ء

۲۔ محمد افتخار کھوکھر اسلام کا نظریہ ابلاغ مقالہ ایم اے پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۸۵ء

کالم وتنقیدی مضامین (غیر مطبوعہ)

۱۔ پشاور کا تازہ ادبی منظر نامہ تاج سعید پشاور

۱۔ ادبی کالم نگاری کی روایت اسحاق وردگ پشاور

۲۔ ادب کیا ہے؟ اسحاق وردگ پشاور

ملاقاتیں

۱۔ انتظار حسین مورخہ ۶ نومبر، ۲۰۰۸ء بوقت: ۱۰:۲۳ صبح، مقام، رہائش گاہ انتظار حسین لاہور

۲۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین مورخہ ۵ مئی ۲۰۱۱ء بوقت: ۱۱ بجے صبح مقام، شعبۂ اردو جامعہ پشاور

۳۔ یونس قیاسی مورخہ ۹ مئی ۲۰۱۱ء بوقت ۴:۳۰ بجے شام، مقام رہائش گاہ یونس قیاسی پشاور

۴۔ ناصر علی سید مورخہ ۲۰ مئی ۲۰۱۱ء بوقت ۵ بجے شام، مقام رہائش گاہ ناصر علی سید گلبہار پشاور

ضمیمہ جات

قطعهٔ تاریخ آغاز

یکم جنوری سنہ ۱۹۱۳ء

احکام سال نو

(غالب)

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے